شاخِ زیتون سے لپٹی فلسطینی اور اسرائیلی لڑکی۔

پہلا باب:

یہ 1899ء ہے۔

وی آنا کی السر سٹریٹ Alser street کی سہ منزلہ شاندار بلڈنگ کے سیکنڈ فلور کے اِس کمرے میں داخل ہوتے ہی جس پہلی چیز نے ایمانویل قراسو آفندی Emanvel Qrasoo Affandi کی توجہ کو فی الفور اپنی گرفت میں لیا تھا وہ داہنے ہاتھ کی دیوار کے نصف حصّے پر پھیلا لمبا چوڑا دُنیا کا نقشہ تھا جس پر چند جگہیں سُرخ گول گول دائروں کے حصار میں گھری بڑی نمایاں نظر آتی تھیں۔کھڑکیوں پر پردے نہیں تھے اور سامنے کی ڈھلائی پہاڑیوں کے دل کش منظر اُڑتے چکریاں کھاتے بند شیشوں کے راستے نظروں سے آٹکراتے تھے۔

وی آنا کی شہرت کے کتنے حوالے تھے۔سگمنڈ فرائیڈ کے ناطے یہ خوابوں کا شہر تھا۔موسیقی کے شائقین اور موسیقاروں نے اِسے موسیقی کے دارلحکومت کا درجہ دے رکھا تھا اور کوہ ایلپس کے پہاڑوں نے اِسے قدرتی خوبصورتی اور رعنائی سے منفرد بنا ڈالا تھا۔

کمرے میں پھیلا سکوت ایک دل کش لڑکی کے قدموں کی چاپ سے ٹوٹا جس نے بڑے رکھ رکھاؤ جیسے انداز میں کافی کی سروس دی۔آفندی نے ''شکریہ'' کہتے ہوئے کافی پکڑی۔چھوٹا سا سِپ لیتے ہوئے اُس نے اپنے پورے وجود میں سرشاری سی محسوس کی۔کافی کی اس وقت کتنی طلب ہو رہی تھی۔

اُس کے بالکل قریب کھڑا اڑتیں 38 اُنتالیس 39 سالہ نوجوان تھیوڈور ہرزل تھا۔صحافت کی دُنیا کا ایک بڑا نام۔ وی آنا سے نکلنے والے اخبار Nelle Freie Presse کا نمائندہ۔فرانسیسی فوج کے یہودی کیپٹن ڈریفس Dreyfus جس پر جرمنوں کیلئے جاسوسی کرنے کے الزام،اِس کی گرفتاری اوراس پر چلنے والے مقدمے نے جسے بین الاقوامی شہرت مل گئی تھی اِس کیس کو یہود دشمنی کے ناطے اس کی اندرخانے سازش کی گتھیاں کھولنے والا صحافی اوراس وقت پوری دُنیا کے یہودیوں کوایک مرکز پر اکٹھا کرنے کی کوششوں کا ایک بنیادی اہم کردار جس کی تصنیف The Jews State نے یہودی دُنیا میں تہلکہ مچادیا تھا۔

کافی کے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے ہرزل نے بھلا کِس کام کیلئے بُلایا ہے؟ آفندی کی نظریں گہرے تنقیدی انداز میں ہرزل کا جائزہ لیتی تھیں۔

ہرزل کا چہرہ ملائمت کی نرمی میں ڈوبا بھیگی پھوار جیسا تھا۔غلافی خوبصورت آنکھیں ذہانت کی لو سے دمکتی،آہنی عزم اور کچھ کرگزرنے والے جنون کے چراغوں سے جلتی دیکھنے والوں پر اُس کے ایک بڑا انسان ہونے کا راز کھولتی تھیں۔خاصی لمبی داڑھی سے سجا چہرہ اُس کی مذہب سے وابستگی کے جنون کو نمایاں کرتا تھا۔

''میرا رجحان کبھی بھی یہودیت کی طرف کچھ خاص نہیں رہا تھا۔میری والدہ نے ہمیشہ میرے اندر یہودی اخلاقیات کی بجائے انسانی اقدار سے محبت کا جذبہ پیدا کیا۔''

سالونیکا (Salonica) (اس وقت یونان کا شہر ہے تب 1899ء کے زمانے میں عثمانی سلطنت کا حصّہ تھا) میں پیدا ہونے اوراب استنبول میں رہنے والا اُنتالیس سالہ آفندی جوخود کو یہودی بعد میں اور تُرک پہلے سمجھتا تھا نے دھیرے سے کہا۔

''میں اگر غلطی پر نہیں تو کیپٹن الفریڈ ڈریفس تنازعہ سوچوں کا رُخ بدلنے کا باعث بنا ہے۔''

آفندی اِس کیس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سے آگاہ تھا۔فرانس کی آرمی کے اعلیٰ افسر کیپٹن الفریڈ ڈریفس پر بڑا سنگین جرم تھا۔

''کہہ سکتے ہو۔یہ کیس میری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔''

ہرزل کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔اُس وقت محویت کے عالم میں اپنے سامنے کی دیوار کو وہ جس انداز میں دیکھتا تھا آفندی کو محسوس ہوا تھا جیسے وہ کہیں ان دنوں میں چلا گیا ہے اور اپنی یادداشتوں میں اُس واقعے کی فلم چلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

''تم یقین کرو گے میں تو پیرس اپنی پیشہ ورانہ فرائض کے سلسلے میں گیا تھا کہ چلو دیکھوں تو سہی یہ چکر کیا ہے؟فرانسیسی یہودی تو اُس سوسائٹی میں پوری طرح رچے بسے اور اپنے فرانسیسی ہونے پر نازاں لوگ ہیں۔

اُس نے اپنی نظریں آفندی پر جما دیں۔چند لمحوں تک خاموش کچھ سوچنے ،کچھ غور کرنے کے تاثر کا عکاس چہرہ جیسے گویا ہوا تھا۔

الفریڈ ایک کلچرڈ آدمی،فوج کا اعلیٰ افسر اور فرانسیسی معاشرے کو آئیڈیلائز کرنے والا نوجوان جو اپنے ماضی کے حوالے سے بھی داغ دھبوں سے پاک تھا۔سچ تو یہ تھا کہ میری رپورٹیں غیر جانبدار اور واقعات کی گہرائی میں اُتر کر تیار ہوئی تھیں جنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ کیس جھوٹا ہے۔اب اس کی وکالت کرنا تو فرض بنتا تھا۔آفندی تم اس منظر کا تصور بھی نہیں کرسکتے جو میں نے کورٹ کے احاطے میں دیکھا تھا۔الفریڈ شرمندگی ،دُکھ اور ملال کے پاتال میں دھنسا ہوا تھا اور مجمع چلا تا تھا۔

''یہ سب یہودیوں سے نفرت کا نتیجہ ہے۔وہ فرانسیسی یہودیوں کو ماردینا چاہتے

ہیں ۔انہیں نیست و نابود کرنے میں ان کی دلچسپی اور مفاد ہے۔"

آفندی اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ تھیوڈور ہرزل کی صحافیانہ پیروی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی سوسائٹی کے دائیں بائیں طبقوں اور مشہور فرانسیسی ناول نگار ایملی زولا Emile Zola کے اِس جملے I accuse نے اِس کیس کو پوری دُنیا میں مشہور کر دیا تھا۔

"میں نہیں جانتا الفریڈ کا انجام کیا ہوگا؟ کیا وہ باعزت بری ہوگا یا پھانسی کے پھندے پر چڑھے گا ہاں البتہ میں نے یہود دشمنی کو عالمی تناظر میں سمجھنے کا آغاز کر دیا ہے۔"

تھیوڈور ہرزل چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا اب نقشے کی طرف بڑھا تھا۔دیوار سے جُڑے ریک پر دھری تین فٹ لمبی چھڑی اُس نے اُٹھائی اور ارجنٹائن پر رکھ دی۔دوسرے لمحے چھڑی نے تیز دوڑ لگائی اور یوگنڈا پر آ کر رُک گئی۔

"دونوں جگہوں کیلئے برطانیہ کی خواہش تھی کہ یہاں یہودی ریاست بن جائے تو بہتر ہوگا۔مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔بہت بار میری اُن سے میٹنگز ہوئیں۔صحرائے سینا،قبرص اور ماریشس بھی زیر بحث آئے۔سرینیا (لیبیا میں وادیٔ البرقہ) کا بھی آپشن تھا۔"

"میرے خیال میں آپ کے کٹر رجعت پسند پیروکاروں نے آپ کا نتھنوں میں دم کر دیا ہوگا کہ اُن کیلئے صیہون (بیت المقدس کی ایک پہاڑی جس پر حضرت داوَدؑ نے یروشلم کو فتح کرنے کے بعد جشن فتح منایا تھا)۔ایک خوبصورت یادا اور ایک مطالبہ ہے اور یروشلم کی طرف لوٹے بغیر یہودی ایمان مکمل نہیں ہوتا۔"

تھیوڈور ہنس پڑا۔اُس کا چہرہ جو چند لمحے پہلے بہت مدّبر اور سنجیدہ سا محسوس ہوتا تھا۔اب قدرے شگفتہ نظر آنے لگا۔

''آفندی یہ فلسطین دُلہن تو ہماری تھی پر یہ کسی اور کے ساتھ بیاہ دی گئی ہے۔اب اِسے دوبارہ حاصل کرنا تو ہمارا مشن ہونا چاہیے۔''

آفندی مزاح کی لطافت سے بھری اس مثال پر کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔

''خیال رکھیے یہ دُلہن سے زیادہ دلنواز محبوبہ ہے اور بڑی ہرجائی محبوبہ ہے۔کتنے عاشق ہیں اس کے۔کیسی کیسی خوفناک لڑائیاں اور جنگیں اس کے چاہنے والوں نے اس کے لیے لڑیں۔یہ کہیں لُٹی، کہیں اُجڑی پر چین اِسے بھی نہیں۔اس کے نئے عاشقوں نے پھر اِسے پھانس لیا۔بیاہ رچالیا اس سے۔اب اس سہاگن کے صدیوں پرانے عاشق پھر اِسے حاصل کرنے کیلئے کمربستہ ہیں۔

میرا سارا ننہال اور ددھیال جو خود کو یہودی عرب کہتے ہیں اِسے صرف عرب یہودیوں،عرب عیسائیوں اور عرب مسلمانوں کی مشترکہ دُلہن اور محبوبہ سمجھتے ہیں یقین کیجیے ہرزل وہ اِسے آپ لوگوں یعنی یورپی یہودیوں کو نہیں دینا چاہتے ہیں اور اسی لیے وہ آپ کے سخت خلاف ہیں۔''

''بھئی ہم نے تو اِسے چھین لینے کا عزم کرلیا ہے۔''ساتھ ہی ہرزل کا قہقہہ کمرے میں گونج گیا۔

''مگر آفندی مجھے یہ بتاؤ کہ عرب یہودیوں کی ایک اکثریت فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے کیوں خلاف ہے؟''

''میرے خیال میں کلچر کے تصادم سے خوف زدہ ہیں اور شاید یہ خوف کچھ غلط بھی نہیں۔میرے رشتے دار عرب علاقوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔بڑی پھوپھی اگر نابلوس (فلسطین کا شہر) میں ہے تو سب سے چھوٹی بغداد میں۔بڑا چچا بیروت تو دوسرا حلب (شام کا شہر)،بڑی خالہ عمان میں تو چھوٹی والی عکہ (فلسطین کا شہر)،اور آگے اُن کے خاندانوں کی

بڑھتوری بھی یہیں وہیں ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ مذہبی اختلافات کے باوجود ایک مشترکہ ثقافت اور زبان میں بندھے ہوئے ہیں۔

مجھے یاد ہے اسی موضوع پر ایک بار باتیں کرتے ہوئے میرے خالو نے چلّا کر کہا تھا۔

''ارے ہم سب تو مارے جائیں گے اِن یورپی یہودیوں کے ہاتھوں جن کا بھانت بھانت کا کلچر اس پر اُن کا یورپی ہونے کا تکبر۔یہودی تو یوں بھی نسلی برتری کی ماری ہوئی قوم ہے۔اوپر سے ان کے ترقی یافتہ اور ماڈرن ہونے کے تر کے۔

اپنے دونوں ہاتھ وہ جوش خطابت میں لہراتے ہوئے بولے تھے۔

ارے بھائی زمانے گزر جاتے ہیں۔صدیاں بیت جاتی ہیں تب کہیں جا کر یہ تہذیبیں اپنی تاریخ بناتی ہیں اور مشترکہ تہذیب وجود میں آتی ہے اور یہ ہم سے ہمارا وہ ورثہ چھین لینا چاہتے ہیں اور ہمیں ایک نئے اور اجنبی کلچر میں دھکا دینا چاہتے ہیں۔بولو بتاؤ ہم بھلا اُس میں کیسے پنپ سکیں گے؟اب بیسویں صدی کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔لبرل اور سیکولر رجحانات جس تیزی سے ذہنوں کو متاثر کر رہے ہیں وہ اس مشترکہ ثقافتی تال میل کو اور بھی زیادہ گہرا کر سکتے ہیں۔''

سچ تو یہ تھا آفندی بہت سی باتیں گول کر گیا تھا۔اُس کے بہت سارے قریبی عزیز اور رشتہ دار ہرزل کے بدترین ناقدوں میں سے تھے۔جب بھی کسی شادی بیاہ یا کسی مرگ پر اکٹھ ہوتا تو گویا بحث کے دروازے کھل جاتے اور ایک کے بعد ایک دلائل دیتے دیتے اُن کی مشترکہ تان بالآخر اس پر ٹوٹتی کہ ہرزل مذہب کا غلط استعمال کر رہا ہے۔شاہ یہود کے لقب نے اُسکے دماغ میں خناس بھر دیا ہے۔ایک یہودی ریاست بنا کر یہود دشمنی کا بیج بو دیا جائے گا اور مشرق وسطٰی کا سکون غارت ہو کر رہ جائے گا۔

شام کے شہر حلب(Alappo) میں رہنے والا اُس کا چچا ہرزل کو اچھی طرح جانتا تھا۔اس کے بہت سے ڈرامے اُس نے وی آنا کے تھیٹروں میں دیکھے تھے۔

''سالا ڈرامہ نگار تو ہے ہی اب ڈرامے بازیوں پر بھی اُتر آیا ہے۔صدیوں پرانی یہودی داستانوں کو جذباتی رنگ دے دے کر اِس قوم کو ایک فریبی میں مبتلا کر دیا ہے۔دُنیا تو پہلے ہی نفرتوں کی آگ میں بھڑک رہی ہے۔دم گھونٹنے والے حالات کی اذیت سے گزر رہی ہے۔ایسے میں وطنیت کے یہ نئے شوشے۔ابھی دو ماہ پہلے اس کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا تھا۔کیسے پُرفریب انداز میں وہ انسانی ذہن کا استحصال کر رہا ہے؟وہ یہودیوں کو اس قدیم وطن میں جدید قوم کی تعمیر کیلئے تو کہتا ہے مگر اُن عربوں کا ذکر نہیں کرتا جو صدیوں سے وہاں رہ رہے ہیں۔ان کے بارے میں اس کی کیا پلاننگ اور کیا ارادے ہیں؟ سچی بات یہ ہے کہ وہ انہیں جہنم میں دھکیلنا چاہتا ہے۔''

اور ایسے ہی دنوں میں یہودیوں کی سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں عالمی سطح کی دوسری کانفرنس منعقد ہونے کی خبر آئی۔

آفندی نے اُس میں شرکت کیلئے اپنے باپ سے بات کی۔اُس نے دیکھا تھا اس کے باپ کے چہرے پر ناگواری کے خفیف سے تاثرات اُبھرے،تاہم وہ خاموش رہا۔آفندی آیا اور حیران رہ گیا کہ جس جوش و جذبے سے دُنیا بھر کے با اثر اور امیر ترین یہودی اس کانفرنس میں آئے اور انہوں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھولے۔صیہونی بینک اور یہودی بیت المال کیلئے لاکھوں پونڈ اکٹھے ہوئے۔

اور یہیں وہ ترانہ گایا گیا جس کا عنوان اُمید Hope تھا۔جس نے دوسرے لوگوں کی طرح آفندی کے دل کی دُنیا بھی زیروزبر کی اور اُسے ایک لازوال جذبے سے آشنا کیا۔

آفندی کو بھی یہیں شاید پہلی بار صیہون یروشلم کا تصوراتی نام ہے سے آشنائی ہوئی۔کانفرنس کے مندوبین کے سامنے کھڑے ہوکر ہرزل نے جب اپنا دایاں ہاتھ بلند کرتے ہوئے یروشلم کا مرثیہ پڑھا۔

''اے یروشلم اگر میں تجھے بھول جاؤں تو میرا دایاں ہاتھ مفلوج ہو جائے۔''

اور ایسے ہی لمحوں میں لوگوں کو یہ محسوس ہوا جیسے داؤدؑ کا بیٹا مسیحا کے روپ میں ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔

اور وہاں نعرے تھے۔دو ہزار سال پرانا خواب حقیقت بن رہا ہے۔

Our hope is not yet lost,

The hope of two thousand years

To be Free people in our Land

The Land of Zion and Jeroshalam

Our hope is not lost

To return to the land of our fathers

The city where David encamped

As long as our precious wall

Appears before our eyes

and over the destruction of our temples

and eye still wells up with tears

As long as tears from our eyes

Flow like benevolent rain

And throngs of our country men

still pay homage at the graves of our fathers

our hope is not lost.

اور تھوڑا سا یہ سب آفندی کیلئے بھی ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ گو دونوں کے درمیان قلم اور ذہنی وابستگی کا رشتہ تو چار پانچ سالوں سے اُستوار تھا۔ تاہم پہلی ملاقات کانفرنس پر ہوئی۔ تب تفصیلی بات چیت کا وقت ہی نہیں تھا اور اب وہ اُس کے بُلاوے پر وی آنا آیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ بُلانے کی وجہ کیا ہے؟

''ہاں یار دیکھو میں بھی کیسا احمق ہوں؟ تم سفر سے تھکے ہوئے آئے ہو اور میں باتوں میں جُت گیا ہوں۔ چلو اب تم آرام کرو۔ سہ پہر میں ایموس تمہیں وی آنا کی سیر کروائے گی۔ اُسے استنبول دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ سلطان کے محل اور اس کے حرم دیکھنے کیلئے وہ مری جاتی ہے۔ تمہارے بارے میں جان کر کہ تم استنبول سے آ رہے ہو وہ بہت ایکسائٹڈ excited ہے۔ چلو تمہاری ہمراہی میں اُس کی کچھ تو تشفی ہوگی۔''

یہ ایموس کون تھی؟ اُس نے نہیں پوچھا تھا۔ پر چند لمحوں بعد ہی پتہ چل گیا تھا کہ کافی لانے والی یہ لڑکی تھیوڈور ہرزل کی نئی سیکرٹری تھی جو اُسے چھوٹے سے ملحقہ بیڈ روم میں لے آئی تھی۔

شام اُس نے کسی میوزیم یا تھیٹر میں گھس کر بیٹھنے کی بجائے شہر کی سیر میں گزاری۔ ایموس نے استنبول سے متعلق سوالوں سے اُس کی مت مار دی۔

''ایموس تمہیں استنبول دِکھانا تو بہت بڑی نیکی ہوگی۔''

ایموس تو خوشی سے نہال ہوگئی۔ چہکتے ہوئی بولی۔ ''تم سوچ نہیں سکتے ہو کہ میں سلطان کے حرم دیکھنے کیلئے کتنی دیوانی ہوں۔''

''وعدہ نہیں۔ وہاں تک رسائی تو خیر مشکل ہے۔ باقی کوشش شرط ہے۔''

شہر کے بارے ایموس نے کافی معلومات دیں۔

رات کا کھانا اُس نے ایموس کے ساتھ باہر ہی کھایا۔

شب کے پہلے پہر کی آخری ساعتوں میں وہ اسی کمرے میں ایک بے تکلف سے ماحول میں بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ آتش دان میں لکڑیاں جلتی تھیں اور شہر پر چھائی تاریکی اور اندھیرے کی چادر میں کہیں کہیں کیروسین آئل کے جلتے لیمپ جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے تھے۔ عمارتوں اور پس منظر میں درختوں اور پہاڑوں کے پھیلاؤ ایک طلسمی کی سی کیفیت کا تاثر اُبھارتے ہوئے خوفناک سے نظارے تخلیق کر رہے تھے۔

بہت سی ذاتی اور بہت سی دن کے حوالے سے باتوں کے بعد آفندی حیران سارہ گیا جب ہرزل نے عجیب اور پُراسرار سے لہجے میں کہا۔

''پتہ نہیں میں کبھی کبھی ایک انتہائی خوفناک سے، انتہائی پریشان کن احساس میں کیوں گھر جاتا ہوں؟ آفندی مجھے لگتا ہے جیسے یہودیوں پر بہت بُرا وقت آنے والا ہے جیسے اُن کی نسل کشی ہونے والی ہے، جیسے وہ کسی خوفناک عذاب میں گھرنے والے ہیں۔''

آفندی نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔ اس کا چہرہ جیسے حیرتوں کے بہت سے رنگوں کی زد میں آ گیا لگتا تھا۔

''کوئی خواب دیکھتے ہو۔''

''ہاں کبھی خواب کی صورت، کبھی کام کرتے کرتے اچانک نگاہیں اُٹھا کر یونہی دیوار کو دیکھتا ہوں تو وہاں جیسے یہ سین scene پینٹ ہوتا ہے۔ کبھی یہ منظر میرے سامنے کاغذوں پر بکھرا ہوتا ہے۔ روز نہیں مہینوں میں کبھی ایک دو دفعہ کبھی کبھی ہفتے میں اوپر تلے کئی بار۔''

آفندی کی آنکھوں میں حیرت واستعجاب کی لہریں رقص کر رہی تھیں۔

''کیا دیکھتے ہو؟''

''جلتے ہوئے گھروں میں مرے ہوئے یہودی بچے اور عورتیں، مدد کیلئے چیختی آوازیں، گولیاں برساتے فوجی، یہاں وہاں بکھری لاشیں، ایسے ہی دل دہلانے والے سین۔''

کتنی دیر ان کے درمیان خاموشی رہی۔ وہ اُس کی clairvoyance قسم کی باتیں سُن کر پریشان سا ہو گیا تھا۔

وہ تھیوڈور ہرزل کی سچائی، دلیری، اپنے عقیدے پر اُس کی استقامت، اپنی قوم کیلئے اس کی بے پناہ تڑپ اور لگن سے بخوبی آگاہ تھا۔

کیٹس نے شاید ایسے ہی لوگوں کیلئے کہا تھا۔

Fanatics have their dreams

Where with they weave a paradise for a sect

''چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ ہاں فلسطین کے یوسف ضیا کو جانتے ہو۔''

''یروشلم کے سابق میئر یوسف ضیا سے بھلا کون واقف نہیں۔''

ہرزل کو محسوس ہوا تھا آفندی کی آنکھوں میں جیسے یوسف کے نام پر قندیلیں سی جل اٹھی ہیں۔ یوسف ضیا استنبول یونیورسٹی میں تھا اور وہ رابرٹ کالج میں۔ یونیورسٹی میں یوسف ضیا پہلے انجمن موان ترک کے ایک گروپ ائتلاف والحریۃ کا سرگرم رکن تھا۔ بعد میں وہ کمیٹی آف یونین اینڈ پروگریس Committee of union and progress (CUP) میں شامل ہو گیا اور جمہوریت کی بحالی کیلئے بہت سرگرم ہوا۔

دونوں تحریکوں کے مقاصد تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک سے ہی تھے۔ آفندی

اتلاف سے وابستہ تھا جو سیکولر نظریات کی حامی تھی۔

یوسف ضیا، آفندی کی محبوب شخصیت تھی۔عقیدت کی پہلی نمو اُس کے دل میں اُس صبح پھوٹی تھی جب اُس نے اپنے گھر کی بالکونی میں میز پر دھرے اخبار کو دیکھا جو اس کا باپ ابھی پڑھتے پڑھتے چھوڑ گیا تھا۔

پہلی جلی حروف میں جو خبر تھی وہ سلطان عبدالحمید ثانی کی پارلیمنٹ معطل کرنے کی تھی۔خبر پر اُس کی نظریں تھیں اور کانوں میں اپنے بڑے بھائی کی آواز گونجتی تھی جو ابھی ابھی بڑے دروازے سے گھر میں داخل ہوئے تھے اور اُونچی آواز میں اس کے والد سے کہتے تھے۔

''تو گویا آمریت اور مطلق العنانی کا دور پھر سے شروع ہونے والا ہے'' اور جواباً اس کے باپ نے کہا تھا۔

''بھول جاؤ۔لوگوں میں بیداری اور شعور بیدار ہو رہا ہے۔سوچ انقلابی ہو رہی ہے۔''یوسف ضیا جیسے نوجوان اکھاڑے میں اُتر رہے ہیں جو عرب اور فلسطینی ہونے کے باوجود عرب قوم پرستی کے قائل نہیں۔

استنبول یونیورسٹی کے اِس سٹوڈنٹ کی تربیت یونیورسٹی کے اساتذہ نے خصوصی انداز میں کی تھی۔ذہین ترین اور قابل فخر طالب علم تو وہ تھا ہی مگر یروشلم کے پڑھے لکھے امیر اور سیاسی پس منظر سے تعلق رکھنے والے خالدی گھرانے کا بیٹا ہونے کے باعث وہ سیاست میں بھی فوراً داخل ہو گیا۔

یروشلم کے پہلے میئر کی حیثیت سے وہ حد درجہ فعال تھا۔اُس کا سیاسی شعور بہت گہرا تھا۔پارلیمنٹ میں جمہوری انقلاب پر لگی لپٹی کے بغیر دُھواں دھار بولتا تھا۔اُس کا کہنا تھا عثمانی سلطنت کو جدید تعلیم ،فرض شناس اور دیانت دار انتظامیہ، مذہبی رواداری، آئینی

حقوق اور موثر انفرا اسٹر کچر Infrastructure کی شدید ضرورت ہے۔

امریکی اور فرانسیسی سفارت کار اُس کے بہت مداح تھے۔اُس کی برملا تعریف کرتے تھے۔اُس کی ذہانت اور سچائی کو سراہتے تھے اور یہی بات سلطان کو ناپسند تھی۔ایسے منہ پھٹ اور بے باک لوگوں سے شاہوں کو تو ہمیشہ خطرہ ہوتا ہے۔

گذشتہ سردیوں میں اُس کی بڑی پھوپھی فلسطین کے شہر نابلوس سے انہیں ملنے استنبول آئیں۔رات کو کھانے پر باتیں کرتے کرتے بولیں۔

''ارے یروشلم کی تو قسمت کھل گئی۔ایسا اچھا میئر ملا ہے اُسے۔نابلوس سے یروشلم اور یافا سے یروشلم تک پکی سڑکیں بن گئی ہیں۔ہماری صابن کی سپلائی سب سے زیادہ اب اِن شہروں کو ہو رہی ہے۔

واٹر سپلائی کا نظام بھی بہت بہتر کر دیا ہے۔یروشلم میں اپنی بیٹی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

اُس نے تو آنگن کا حوض خشک کر لیا ہے۔بس کنواں رہنے دیا۔وہ تو ہیرو ہے یروشلم کا۔سب کا خیر خواہ۔ ہر آئے گئے کی بات سنتا ہے۔کیا عیسائی، کیا یہودی، کیا مسلمان، کیا آرمینیائی سب کے دلوں میں بستا ہے۔یہودا (خدا) اُسے حیاتی دے۔''

وقتاً فوقتاً ایسی بہت ساری باتیں غیر محسوس طریقے سے اُس کے کانوں میں پڑتی رہیں اور جیسے یوسف ضیا اس کے دل اُس کے دماغ کے کسی کونے میں بیٹھ گیا۔

آنے والے سالوں میں کہیں کہیں اُس کے بارے میں خبر تھی۔کہیں تاسف بھرا، کہیں دُکھ بھرا اظہار سننے کو ملتا تھا۔

اُس دن وہ چونکا تھا جب یونیورسٹی کے لڑکوں میں یروشلم کے یوسف ضیا کے بارے میں تند و تیز باتیں ہوئیں۔اُس جینئس Genious کو سیاسی طور پر بین کر دیا

گیا تھا۔استنبول میں اُس کے داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔استنبول میں چند دن ہنگامی صورت رہی۔یونیورسٹی میں طلبہ نے تند و تیز تقریریں کیں۔یونیورسٹی اساتذہ نے افسوس کا اظہار کیا۔اس کی یہ سوچ کہ یورپی تہذیب کا مقابلہ صرف اور صرف اعلیٰ تعلیم اور اسے سمجھنے سے ممکن ہے کتنا درست ہے اور ہمارے حکمران اسے سمجھنے کو تیار نہیں اور ترکی کو اب ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔

آفندی نے اپنی محبت اور جذبات کا اظہار اُسے خط لکھ کر کیا۔تب سے اب تک خط و کتابت کا یہ سلسلہ جاری تھا۔

ہرزل اُٹھا۔ملحقہ کمرے میں گیا۔تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ میں ایک خط لیے داخل ہوا۔خط اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

''پڑھو اسے۔''

یہ یوسف ضیا کا خط تھا۔خط کیا تھا بہت سے دکھوں کے اظہار تھے اُس میں۔ Petach Tiva(فلسطین کا ساحلی شہر) کی لڑائی پر تھوڑی سی بحث تھی۔موجودہ سلطان کی حماقتیں،ترک نوجوان نسل کی ذمہ داریاں اور فلسطین میں سلام معاہدہ میں غریب کسانوں پر ظلم کی مختصر روداد تھی۔

باسل میں جو صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس کے حوالے سے چند سوال تھے۔آخر میں اُس نے ہرزل سے پوچھا تھا۔

''تم لوگ آخر جھوٹ کیوں بول رہے ہو کہ اس سرزمین پر کوئی نہیں بستا۔یہ ایک بنجر اور غیر آباد زمین ہے۔تم لوگوں نے جو کہنا شروع کیا ہے۔

A land without a people for a people without a land

یہ کس قدر جھوٹ پر مبنی بیان ہے۔ایک ہزار سال سے اس پر بسنے والی قوم کو تم دیس نکالا دینا

چاہتے ہو۔تمہاری The Jews State میں نے پڑھی ہے۔تمہارے مضامین میری نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔مجھے بتاؤ فلسطین میں غیر یہودیوں کی بھاری تعداد آباد ہے۔سب قومیں فلسطین کو احترام سے دیکھتی ہیں۔یہودیوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اسے اپنے لیئے مخصوص کرنے والی باتیں کریں۔کیا دولت سے فلسطین خریدا جا سکتا ہے۔

نہیں۔کبھی نہیں۔

اِسے فقط توپوں اور جنگی قوت سے زیر کیا جا سکتا ہے۔''

خط آفندی کے ہاتھ میں پل بھر کیلئے لرزا تھا۔دیر تک اُس کی نگاہیں خط پر جمی رہیں اور جب اُس نے نظریں اُٹھا کر ہرزل کو دیکھا۔آفندی کو اُن آنکھوں میں عجیب سی شیطانی چمک محسوس ہوئی اور جب وہ بولا تھا اس کی آواز میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔

''ہم اسے دولت سے خریدیں گے۔بندوقوں توپوں سے اس پر قبضہ کریں گے۔ذلت آمیز طریقے استعمال کرنے پڑے تو وہ بھی کریں گے۔''

''چلو چھوڑو اِن سب باتوں کو۔میں نے تمہیں کیوں بُلایا ہے تم یقیناً جاننا چاہو گے؟چند لمحوں کیلئے وہ خاموش ہو گیا۔آفندی منتظر نظروں سے اُسے دیکھتا تھا جب وہ گویا ہوا۔

''میں نے ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی سے بہت سی ملاقاتیں کیں۔ہم فلسطین کی زمین خریدنا چاہتے تھے۔سلطنت عثمانیہ اندر سے کھوکھلی ہوئی پڑی ہے۔خزانہ خالی ہے۔سلطان کو اُن کے قرضہ جات کی ادائیگی کی پیشکش کی گئی۔استنبول میں ایک بین الاقوامی طرز کی یونیورسٹی بنانے کی ترغیب بھی تھی مگر میں انہیں قائل نہ کر سکا۔

ہم نے سلطان کے ذاتی دوستوں سے بھی سفارت کاری کے ذریعے یہ پیشکش کروائی۔اُس کا نتیجہ بھی صفر تھا۔سلطان کے گہرے دوست جرمنی کے قیصر ولیم کو بھاری

تحفوں تحائف کے ساتھ آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنے دورۂ ترکی اور شام و فلسطین کے دوران سلطان کو قائل کرنے کی کوشش کریں مگر جب قیصر ولیم نے اس پر بات کرنی چاہی تو سلطان نے قطعی نظر انداز کیا۔ قیصر ولیم نے دوبارہ بات کرنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ اُس کے وزیر خارجہ نے اُسے خاموشی اختیار کرنے کو کہا تھا۔ یقیناً انہیں سلطان کی ناراضگی کا خیال تھا۔ جرمنی کے اپنے بہت سارے مفادات ترکی سے وابستہ ہیں۔

چونکہ تم نوجوان ترکوں اور ترک سٹوڈنٹس سیاست میں بہت با اثر ہو۔ تو تم اب میرے نمائندے کے طور پر سلطان سے ملو اور بات کرو۔"

"کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ تاہم مجھے کامیابی کی اُمید نہیں۔"

ہرزل نے اُس کی بات سُنی۔ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُسے آرام کرنے کا کہتے ہوئے پُرعزم آواز میں بولا تھا۔

"یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں چند سال لگ سکتے ہیں۔ اس میں دہائیاں لگ سکتی ہیں۔ آفندی گذشتہ سال میں یروشلم گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس ماحول پر تعصّبات، نفرتوں اور عدم برداشت کے گھمبیر سائے مجھے ہر سُو چھائے محسوس ہوئے۔ شہر نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب یروشلم پر صیہونی قابض ہو جائیں گے تو سب سے پہلے شہر سے ہر اُس چیز کا صفایا کر دیا جائے گا جو مقدس نہیں۔"

اُس کی رات عجیب سے اضطراب میں گزری تھی۔ صبح دیر تک سوتا رہا۔ ناشتے کے بعد خود سے پوچھتا رہا کہ اُسے یوسف ضیا سے ملنا چاہیے یا نہیں کہ وہ وی آنا یونیورسٹی میں موجود ہے۔ کوئی تین ماہ پہلے عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے اُس کی تعیناتی یہاں ہوئی ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اُس کا دل ملاقات کیلئے مچلتا تھا۔ دماغ کشمکش کا شکار تھا۔ پھر رہا ہی نہ گیا۔ ایموس کے ساتھ سہ پہر کو ملنے کیلئے نکل پڑا کہ ایموس بھی ملنا چاہتی تھی۔ سارا راستہ وہ

ایموس کے ساتھ یوسف ضیا کی باتیں کرتا رہا اور اُسے اپنی پہلی ملاقات کی خوبصورتیوں کے قصے سُناتا رہا۔

''ایموس ان دنوں استنبول ہی گرمی سے نہیں جل بھن رہا تھا عرب علاقے بھی اس کی شدید لپیٹ میں تھے۔ایسے ہی دنوں میں میرے بابا کو نابلوس سے اُس کی بڑی بہن کا خط اُس کے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے کیلئے ملا۔بھناتے ہوئے وہ مجھ سے بولا تھا۔

''ارے یہ تمہاری پھوپھی کیا پاگل ہو گئی ہے؟ دیکھو تو لڑکے کا بیاہ رچا بیٹھی ہے۔موسم تندور بنا ہوا ہے۔اب مجھے تو اِس گرمی میں سڑنا بلنا نہیں۔تم ہی جاؤ گے۔''

یوں مجھے نابلوس (فلسطین کا شہر) جانا پڑا۔شادی نپٹ گئی تو میں یروشلم جانے کیلئے تیار تھا۔ایوی اور سات سالہ بیٹی کیرن بھی ساتھ تھیں۔میرے دل میں یوسف سے ملنے کی لگن تھی اور میں جانا بھی اکیلا چاہتا تھا۔ایوی قدرے غصّے سے بولی تھی۔

''کمال ہے۔اگر مجھے دوست کے ہاں نہیں لے کر جانا چاہتے تو دیوارگریہ پر چھوڑ دینا۔''

اور باب دمشق کے پاس پہنچ کر میں نے خود سے کہا تھا۔

''چلو اب یروشلم آ گیا ہوں۔ایوی کو بھی چھوڑنا ہے تو دیوارگریہ Wailing Wall کی زیارت کر لوں تھوڑا سا رونا دھونا بھی ہو جائے۔اماں ابا نے تو پوچھنا ہی ہے۔بندہ کہنے والا تو بنے گا کہ ہاں گئے تھے۔میری پھوپھی رات کو بتاتی تھی۔یہ دیوار تو کہیں کوڑے کرکٹ میں لتھڑی پڑی تھی۔سلیم ثانی نے اِسے دریافت کیا تھا۔اُسی نے اِسے صاف کروایا اور یہودیوں کو زیارت کی اجازت دی۔

ایموس میں کوئی مذہبی آدمی نہیں اور نہ ہی مجھے یہ مذہبی جنونیت پسند ہے۔تاہم بہت دیر دیوار کے سامنے کھڑا رہا۔پھر کاغذ پر کچھ لکھا اور اُسے دیواری پتھروں کے سوراخ

میں ٹھونس دیا۔

''یروشلم کے بغیر صیہون اور یہودی ہیکل کے بغیر یروشلم کا تصور ممکن نہیں۔''

پر میں نے جو دعا وہاں لکھ کر رکھی ہے وہ بس اتنی سی ہے کہ اے خدا کیا یہودی ،عیسائی اور مسلمان امن سے یہاں نہیں رہ سکتے ۔صرف تیری ذات ہی انہیں ہدایت دینے والی ہے۔

میں نے زیتون کی پہاڑی (ماؤنٹ آف آلیوز) کو بس ایک نظر دیکھا اور رُخ پھر لیا۔اِردگرد کی ساری زمین شمالی و مغربی افریقہ کے زائرین اور طلبہ کے رہائشی مکانات کیلئے وقف تھی۔

پھر کسی سے یوسف ضیا کے گھر کا پوچھا۔

یروشلم کی چند گلیوں کے موڑ کٹے اور یوسف ضیا کا گھر آ گیا۔

ساتھ لانے والا لڑکا اندر گیا اور پل نہیں لگا تھا دراز قامت،خوبصورت دلبر سے یوسف ضیا نے جس طرح مجھے لپٹایا اور کمرے میں لایا۔وہ عرب مہمان نوازی کی حسین ترین مثال تھی ۔گھنٹہ بھر بعد ہی جب میں اُٹھنے لگا تو اُس نے حیرت سے کہا۔

''ہیں کہاں جاتے ہو؟''

اور اب اُسے بیوی بچی کا بتانا پڑا اور یوسف ضیا نے مجھے اتارا۔

''کمال ہے آفندی ۔تم نے غیریت کی انتہا کر دی۔مجھے تم سے ایسی اُمید نہیں تھی ۔اُٹھو چل کر انہیں لائیں۔''

اور دو دن ہم نے پورے گھر کی محبتوں اور چاہتوں میں گزارے۔

اور ایسی ہی باتوں میں ان کے گھر پہنچ گئے ۔ایمو تو انہیں مل کر حیران رہ گئی ۔ایسے محبت والے لوگ ۔یوسف ضیا کی بیوی سارہ حُسن کا نمونہ تھی ۔یروشلم کے Ecce

Convent homo کی پڑھی ہوئی۔ فرنچ، جرمن اور انگریزی خوب بولتی تھی۔ کشیدہ کاری سے کڑھے ہوئے اس کے سرخ اور سیاہ رنگ کے ثوب کے نیچے دُودھ کی طرح گورے پاؤں کے ٹخنوں پر سونے کی پازیبیں اُس کے چلتے سے چھُن چھُن کرتی تھیں۔ جو ایموس کیلئے ایک خوشگوار حیرت تھی جس کا اُس نے کئی بار اظہار بھی کیا۔ کھانا بہت پُر لطف تھا۔ کیفتا Kefta تھا۔ مقلوبے کی ڈش تھی۔ سلاد میں فطوش تھا۔

گھر میں سات سالہ ابراہیم تھا۔ چھ سالہ عیسیٰ اور داؤد۔ دو سالہ موسیٰ۔

''بھئی بین المذاہبی کی بڑی تابندہ سی فضا کا گھر میں راج ہے۔'' ایموس دو سالہ موسیٰ کے سیبوں جیسے گال چُومتے ہوئے ہنسی تھی۔

اور جب وہ رخصت ہو رہے تھے سارہ نے سونے کی ایک پازیب اپنے پاؤں سے اُتاری اور جُھک کر ایموس کے داہنے پاؤں میں پہنانے لگی۔

ایموس نہ نہ کرتے ہوئے جُھکتی چلی گئی۔ محبت کے اِس اظہار پر اس کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔ سارہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''حد ہوگی ہے ایموس۔ یہ تم سے زیادہ اچھی ہے کیا؟''

واپسی پر ایموس کے اُن کی دریا دلی، اعلیٰ ظرفی اور محبت بھرے رویوں پر قصیدے ختم نہیں ہوتے تھے۔ آفندی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ایموس سارہ یروشلم کے حسینی خاندان کی بیٹی اور الخالدی خاندان کی بہو ہے۔ دونوں خاندان فلسطین کے نہایت معزز اور سرکردہ ہیں۔ ایسے چھوٹے موٹے تحفے دینا دلانا اُن کے لیے معمول کی بات ہے۔''

دوسرا باب:

''ایموس میرا یہ مختصر سا خط یقیناً تمہارے لیئے خوشی کا باعث ہوگا۔باضابطہ طور پر تو ہماری سلطان معظم سے ملاقات کا کوئی حکم نامہ ابھی جاری نہیں ہوا۔تاہم میرے اندرونی ذرائع نے تین ہفتے بعد کی کسی تاریخ کا کہا ہے۔بہتر ہوگا تم استنبول آجاؤ۔اِس دوران تمہارا سیر سپاٹا بھی ہو جائے گا۔''

آبنائے باسفورس کے کنارے پر ترکی کے دیگر امراء کی طرح آفندی کے محل نما گھر کو ایموس نے حیرت سے دیکھا تھا۔اِس بے شمار کمروں والے گھر میں بہت سارے لوگوں جو آفندی کے بھائیوں، بھاوجوں اور اُن کے جوان بچوں پر مشتمل تھے نے اُس کے سلطان کا حرم دیکھنے کی خواہش کی خاصی مٹی پلید کی تھی کہ انہیں تو سمجھ نہیں آتی تھی کہ اُسے اِن محل باڑیوں کا احمقوں کی طرح کیا جنون ہو گیا ہے؟

وہ کونسا کم تھی۔باسفورس کے پانیوں،ان کے عقب میں جھانکتے درختوں کے جھنڈوں،آسمان کی بے کراں وسعتوں کو چوبی بالکونیوں کے کندہ کاری سے سجے دروازوں سے تانکا جھانکیاں کرتے دیکھتے اور اُن سے محظوظ ہوتے اُس نے اُن سبھوں کو لتاڑتے مگر بظاہر ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''تم لوگ تو خود محل میں رہتے ہو۔تمہیں محل باڑیوں سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟بات تو مجھ جیسی ماٹھی عورت کی ہے جو وی آنا کی لائبریری میں ایک بہت پرانے برٹش میگزین میں حرم کی بابت رپورٹ اور تصاویر دیکھ کر غش کھا کر گرنے والی ہو گئی تھی۔''

اُس نے اپنی بات کو وزن کے پلڑے میں بٹھاتے اور گفتگو میں انتہا درجے کا

تجسس پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تم یقین کرو گے وہ عورتیں تھیں یا حُسن کے مجسمے۔ بندہ پلکیں جھپکنا بھول جاتا تھا۔ ٹخنوں کو چھوتے ان کے سنہری لمبے بال، دودھیا سڈول بدن، ان کے پہناوے، خواب گاہیں، کمروں کی سجاوٹ، پس منظر کا ماحول، راہداریوں میں کھڑے آبنوسی رنگتوں والے خواجہ سرا، باغ باغیچے، پھول بوٹے کیا دُنیا تھی؟ کیا ماحول تھا؟ بس میں تو دیوانی ہوگئی تھی۔

''ہاں ایوی'' اُس نے آفندی کی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جانتی ہو۔ ایک تصویر میں دُنیا کا محبوب موسیقار بیتھووِن حرم کی عورتوں کو موسیقی سکھا رہا تھا۔ ذرا اِس منظر کو دھیان میں تو لاؤ۔''

ایوی ہنس پڑی تھی۔

''ایموس خیال رہے یہ دُنیا کی عظیم سلطنتِ عثمانیہ ہے۔''

سچ تو یہ ہے میں آفندی کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جس نے اپنا وعدہ وفا کیا۔ دیانا سے جب یہ رُخصت ہو رہا تھا میرے انداز میں بچوں جیسی بالک ہٹ تھی اور جب میں بار بار اس سے کہتی تھی۔

''آفندی ایک بات میں تم پر واضح کر دوں۔ مجھے یلدز میں سلطان کا محل نہیں دیکھنا۔ فرانسس نے کہا تھا کہ وہ جدید طرز کی عمارت ہے۔ ایسی تو ہزاروں ہمارے ہاں بھی ہیں۔ توپ کپی کا حرم ہو جائے۔ دولما باشی کا ہو جائے۔ چلو سلطان کی ماں بہنوں سے ہی ملاقات ہو جائے۔''

ایسے لمحوں میں آفندی میری صورت دیکھتا تھا کہ کیسی احمق لڑکی سے واسطہ پڑ گیا ہے؟ چند بار اس نے کہا بھی۔

''بھئی تم تو بڑی ہی جنونی ہو۔ کہا تو ہے میں پوری کوشش کروں گا تمہارے لیے اجازت لینے کی۔''

شاہی سکریٹریٹ میں اُس کے چند واقف لوگ تھے جنہوں نے اُسے اندر خانے بتا دیا تھا کہ فلاں تاریخ اور فلاں وقت طے ہونے کا امکان ہے۔ اُسی حساب سے اُس نے ایموس کو بلوا لیا تھا۔ بیتابیٔ شوق کی جس انتہا پر وہ تھی آفندی اُس پر بہت ہنسا تھا۔

''یوں کرتے ہیں ایموس تمہیں حرم کی زینت بنانے کی درخواست دیتے ہیں۔ یقین کرو تم جیسی دلکش خاتون سلطان کو پہلی ملاقات میں ہی بھا جائے گی۔ جی بھر کر اس زندگی کو انجوائے enjoy کرنا اور جب من اوب جائے اور بغاوت پر دل مچلے تو پھر باسفورس کے پانی تمہیں ڈبونے کیلئے تو ہیں ہی کیونکہ حرم کی باغی عورتوں کا ٹھکانہ باسفورس کے یہی پانی ہیں۔''

ایموس مصنوعی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے تو میرا ریکارڈ لگا دیا ہے۔ مَیں دیکھنے کی حد تک شوق رکھتی ہوں۔ اُس کا کوئی حصہ بننے کی تمنا نہیں ہے مجھے اور باسفورس کے پانیوں میں بھلا میں کیوں ڈوبوں۔ ابھی تو میں نے شادی کرنی ہے۔''

''اچھا چلو ایک کام پھر میرا بھی ہو جائے۔'' آفندی نے مسکراہٹ زیرلب مونچھوں میں دبائی تھی۔

''حرم جاؤ گی تو شہزادی دُرِّ شہوار کو میرا اسلام دینا۔''

ایموس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ حیرت میں جیسے سارا چہرہ نہانے لگا تھا۔

''موجودہ سلطان کی صاحبزادی ہیں۔ ہمارے رابرٹ کالج تقسیم انعامات پر آئی تھی۔ سارا کالج بیہوش ہو کر گرنے والا تھا۔''

''اوہ! ایموس نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ سُنتی ہوا اپنے شوہر کی باتوں کو۔''

ایوی ہنستے ہوئے کہتی تھی۔ ''ایموس آفندی ٹھیک کہتا ہے۔میں بھی اُس کی بڑی مدّاح ہوں۔''

''حیف ہے تم لوگوں پر۔میرا جب سے آئی ہوں باجا بجادیا ہے اور خود پٹیوں میں گز بھر لمبی داڑھیاں لیے پھرتے ہو۔''

آفندی کا گھرانہ مخلص اور محبت کرنے والا تھا۔ایموس اُن میں خوب گھل مل گئی۔گھر کی عورتوں کے ساتھ اُس نے استنبول کے بازار دیکھے۔چھتے ہوئے رنگین نقاشی سے سجے پھول پتیوں والے جن میں دکانیں دُنیا بھر کی اشیاء سے بھری ہوئی نظروں کو للچاتی اور جیب کو ہلکا کرتی تھیں۔

پھر اُس نے جمعہ کے روز سلاملق (سلام کرنا) کی رسم آفندی اور اس کی بیوی ایوی کے ساتھ دیکھی۔آفندی ٹکٹ لے آیا تھا اور اُسی نے بتایا تھا کہ پہلے یہ رسم ایاصوفیہ میں ہوتی تھی۔اب جامع حمیدیہ میں ہوتی ہے۔سلطان کو لوگوں سے گھلنے ملنے کی چاہت ہی نہیں۔یلدز (اس جگہ سلطان کا نیا محل) استنبول کا مضافات ہے۔

موکب ہمایونی کے بالاخانے میں بیٹھ کر یہ سارا منظر بڑا موہ لینے والا تھا۔ترک فوج کا ایک حصّہ اپنے اپنے صوبوں کے دستوں کے ساتھ سلطان کے سامنے سے گزرا۔عرب،ترک،کرد،اُن کی مختلف اور خوبصورت وردیاں،سروں پر لہراتے شملے اور عمامے۔ایموس نے آفندی کی رواں کمنٹری کے ساتھ دیکھا اور محظوظ ہوئی۔

جس صبح وہ دربار شاہی میں حاضر ہونے کیلئے تیاری کے مراحل میں تھی۔کمرے میں نصب شیشے کے سامنے کھڑی خود کا جائزہ لیتی تھی۔کبھی بالوں میں پھول لگاتی کبھی اُسے اُتارتی،کبھی آنکھوں کو دیکھتی اور اُن میں ناچتے اشتیاق وشوق کے پھیلتے رنگوں کے عکس سے محظوظ ہوتی۔کبھی اُنہیں بند کرتی،کبھی گھڑی پر نظریں جماتی۔وہ اپنے آپ میں گُم سی تھی

جب آفندی نے اُسے چلنے کیلئے کہتے ہوئے اس کا تنقیدی جائزہ لیا اور کہا۔

''ایموس! تم نے سلطان کو قابو کرنے کے سارے سامان کرلیے ہیں۔''

''ڈارلنگ دعا کرو آج کام بن جائے۔حرم کا دیدار میری انتہائے تمنا ہے۔''

اور جب وہ امپیریل گیٹ پر کھڑی تھی اُس نے اپنے دل کی دھڑکنوں کی تیزی کو اک ذرا پھٹکارہ تھا اور سرگوشی میں خود سے کہا تھا۔

''پلیز کچھ رحم کرو میرے اوپر۔اپنے آپے میں رہو۔میں جانتی ہوں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس وقت دُنیا کی چند عظیم سلطنتوں میں سے ایک کے دارالخلافہ استنبول کے سرائے ہمایوں (موجودہ توپ کپی پیلس ومیوزیم) کے پہلے دروازے پر ہوں جو باب ہمایوں ہے اور تقریباً چار سو سال سے سلطنت عثمانیہ کا انتظامی مرکز ہے اور جہاں آفندی کو چیمبر آف پٹیشن میں جسے عرض اداسی Arz Odasi کہتے ہیں سلطان معظم کے حضور عرضداشت پیش کرنی ہے۔

عجیب سی بات ہوئی تھی۔ایموس نے محسوس کیا آفندی نے تھوڑا سا جھٹکا کھایا تھا۔پہلے دروازے باب ہمایوں پر ہی اُسے روک دیا گیا تھا۔استنبول کی معروف شخصیت ہونے کے باوجود شناخت کے مرحلے سے وہ گزر چکا تھا۔اپنی گاڑی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا جب اُسے بتایا گیا کہ وہ گاڑی پر اندر نہیں جاسکتا۔اُسے پیدل چلنا ہے۔وہ اپنی ترکی زبان میں بحث پر اُتر آیا تھا۔ترکی سے نابلد ہوتے ہوئے بھی ایموس سمجھ سکتی تھی کہ اُس کے لہجے میں قدرے تیزی ہے۔ابھی وہ اِسی الجھاؤ میں ہی تھا جب دو گاڑیاں آگے پیچھے رُکیں۔سیکورٹی کلیرنس ہوئی اور گاڑیاں اندر داخل ہوگئیں۔اب اُس کی زبان کی تیزی اُس کی آنکھوں میں آگئی تھی۔گارڈ اور وہاں کھڑے مترجم نے شائستگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹرک ہیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ دونوں گاڑیوں میں جرمنی اور یروشلم میں متعین برطانوی سفیر تھے۔ سفارت کاروں کو باب سعادت تک گاڑیاں لے جانے کی اجازت ہے۔ اس سے آگے کی اُن کیلئے بھی ممانعت ہے۔''

خفیف سی کوفت اور برہمی اس کے چہرے پر نمودار ہوئی اور پھر غائب ہوگئی کہ ایموس بول اُٹھی تھی۔

''آفندی پلیز پیدل چلنے میں مجھے اردگرد کی چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ میں لطف اُٹھاؤں گی۔ گھبراؤ نہیں۔''

پیلس کے تیسرے صحن کے گیٹ سے چیمبر آف پٹیشن chamber of petitions کی پُروقار اور شاندار عمارت پر نظر پڑتے ہی آفندی کے اپنے دل کی دھڑکنیں کچھ قابو سے باہر ہونے لگی تھیں۔ ترک سٹوڈنٹس لیڈر ہونے کے باوجود اُسے کبھی یہاں آنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ انتہا درجے کی خوبصورت اور افسانوی سی دُنیا جس کا ذکر اُس نے بار ہا سُنا، اکثر پڑھا اور جسے تفصیلاً دیکھنے کی خواہش بھی دل میں موجود تھی۔ یہاں کِسی بڑے کام کے بغیر آنا ممکن نہ تھا۔

اُس کے دونوں جانب لش لش کرتے سبزے کے وسیع وعریض قطعے ٹیولپ کے پھولوں سے سجے ہنستے تھے۔ اس سے دس قدم آگے دس قدم پیچھے اور دس قدم دائیں بائیں کے فاصلوں سے گارڈ چلتے تھے۔ اب وہ باب ہمایوں سے گزرتے ہی اُس صحن میں آگیا تھا جو ینی چریوں سے منسوب تھا۔ اس کی تاریخ سے اُس کی مکمل آشنائی تھی۔ چنار کے خوبصورت بہت پھیلے ہوئے درخت کو دیکھ کر جیسے اُس کی آنکھیں چمکیں۔

''ارے اسی کے نیچے جمع ہو کر یہ ینی چری (عثمانیوں کی خاص فوج) بغاوتوں کے مشورے کرتے تھے۔''

اُس کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی تھی جب اُسے اُن کی باغیانہ سرگرمیوں کے عجیب و غریب طریقے یاد آئے تھے۔وہ اپنی کیتلیاں اُلٹی کر کے درخت کے نیچے سجا دیتے تھے جو اُن کی بغاوت کا اعلان ہوتا تھا۔

باب سعادت (موجودہ نام مڈل گیٹ) سرو کے بوٹوں کی ہریالی اور ان کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے مختلف کوشکوں کے فنِ تعمیر کو سراہتے دونوں آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔

The gate of Felicity پر اُسے روک لیا گیا۔یہاں ہر گاڑی پارک کروا دی گئی۔ایموس نے حیرت سے اِس گیٹ پر کھڑے گہری سیاہ مائل رنگت والے دیوہیکل دربان کو دیکھا جو اُس گیٹ کا چیف کنٹرولر تھا۔جسے پاس کھڑے گارڈز کلپی آغا سے مخاطب کرتے تھے۔کلپی آغا سے آفندی نے اپنی زبان میں چند لمحے رُک کر باتیں کیں۔وہ قراسو آفندی سے مل کر بہت مسرور نظر آتا تھا۔

یہاں دائیں بائیں تعمیر شدہ اُن انتظار گاہوں میں سے ایک میں انہیں پہنچایا گیا جو غیر مُلکی سفیروں کیلئے بنائی گئی تھیں۔پورے پون گھنٹے بعد انہیں پھر چلنے کیلئے کہا گیا۔

اب جو عمارت سامنے تھی وہ فنِ تعمیر کا منہ بولتا شاہکار تھی۔عثمانی عہد کے عظیم ماہرِ تعمیر سنان نے تُرک عمارتوں کو جو نیا رنگ نیا انداز دیا تھا اس کی انفرادیت نے استنبول کو دُنیا بھر میں منفرد کر دیا تھا۔برآمدے کے محرابی صورت لئے ستون اور اُن پر بڑھے اُفقی صورت لیئے شیڈ جن پر کس غضب کی نقاشی تھی۔اس کے درمیانی خم پر عثمانی سلطنت کا علامتی جھنڈا آویزاں تھا۔آفندی کی آنکھوں سے پسندیدگی چھلک چھلک پڑتی تھی۔

برآمدے میں جانے کیلئے جو چھ پوڑے وہ چڑھے اس کے پہلے پوڑے کے ساتھ نئے گارڈ خوش آمدید کہتے تھے۔جو یہاں تک ساتھ آئے تھے انہوں نے آباؤٹ ٹرن

لے لیا تھا۔ دوسری انتظار گاہ میں اُنہیں قہوہ پیش کیا گیا۔ ساتھ انواع واقسام کے فواکہات تھے۔ اِس کمرے میں اُن کے علاوہ چھ لوگ اور تھے۔ چار تو گاڑیوں میں آنے والے تھے جنہیں اُن کے اندر آنے بیٹھنے اور اردگرد کا جائزہ لینے اور مختصراً ایک دوسرے سے تعارف کے بعد آگے لے جایا جانے لگا تھا۔ ایک کا تعلق فرانس سے، دوسرا جرمنی سے، تیسرا یروشلم، چوتھا ہنگری، پانچواں روسی اور چھٹا حیدرآباد دکن ہندوستان سے تھا۔ سوائے حیدرآباد دکن کے جس نے خود کو کوئی بڑا اسکالر بتایا تھا سبھوں کا تعلق کسی نہ کسی انداز میں سفارت کاری سے تھا۔

تبھی چالیس کے ہیر پھیر میں ایک شخص نیلی بیگی نما پتلون پر کھلے بازوؤں والی نقشین کڑھائی سے سجی قمیض نما جیکٹ، سر پر لمبی سی ٹوپی جس پر پور پور جتنے فاصلے سے زرروزی کے نقشین کام کی چمک تھی۔ چہرہ بڑی بڑی مونچھوں اور جلالی شربتی آنکھوں سے قدرے خوفناکی کا تاثر دیتا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی ایک فائل کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔ رواں انگریزی میں اُس سے اُس کا نام پوچھا گیا۔

''ایمہ نویل قراسو آفندی۔'' اُس کے جواب میں دھیما پن تھا۔ ہاں البتہ ایموس جواب دیتے ہوئے خاصی پُرجوش تھی۔

''تم آسٹریا کے مشہور جرنلسٹ تھیوڈور ہرزل کے نمائندے ہو اور سلطان کیلئے لائے گئے اُس کے خصوصی پیغام کے سلسلے میں ملنے کیلئے آئے ہو۔''

''شُکر ہو تم۔'' آفندی ہنسا تھا میرا خیال کچھ ایسا ہی ہے۔ آفندی نے ذرا طنزاً کہا تھا۔

ایموس ولسن ہرزل کی سکریٹری کے طور پر درج تھی۔

اب ہدایات شروع ہوگئی تھیں۔ تمہیں چیمبر میں دائیں دروازے سے داخل ہونا

ہے۔تخت تک کا فاصلہ گھٹنوں کے بل جُھکے جُھکے طے کرنا ہے۔سیدھے کھڑے نہیں ہونا۔قامت میں خم رہنا چاہیے اور جب تمہاری واپسی ہوگی تمہاری پشت سلطان ابن سلطان فاتح عالم شاہِ بحر و بر کی جانب نہیں ہوگی۔

چار سو سال سے زائد مشرقی یورپ اور ایشیا کے شہروں پر قابض یہ مملکت کس قدر اسرار اور رومانیت سمیٹے ہوئے تھی۔

پورے دو گھنٹے بعد اُنہیں باریابی کا اذن ملا تھا۔اُس کے ہر اُٹھتے قدم میں لرزش تھی۔دل کی دھڑکنوں میں شور تھا۔ہاں البتہ ایموس اِس صورتِ حال سے لُطف اُٹھا رہی تھی۔

بھاری بھرکم دروازے کے دونوں پٹ اُوپر سے نیچے تک طلائی کام سے بھرے پڑے تھے۔اندر کی شان و شوکت کا کیا حال ہوگا؟ ایموس نے بے اختیار خود سے کہا تھا۔

آدھا پٹ کھلا اور باہر کھڑے گارڈ نے اُنہیں اندر جانے کا سگنل دیا۔گھٹنوں کے بل جھکتا جب وہ ذرا نیم الیستادہ ہوا اُس کے سامنے جو منظر تھا وہ کسی خواب کا حصّہ دِکھتا تھا۔

گولڈ پلیٹڈ دیواریں چمکتی تھیں۔اُس کی شاطر آنکھوں نے پَل جھپکتے جائزہ لے لیا تھا کہ پڑھے اور سُنے ہوئے کے مطابق اِن دیواروں پر اب ہیرے نہیں جگمگاتے تھے۔کچھ ایسا ہی تذکرہ اور احوال کمرے میں بچھے قالین کا تھا جس کی بنت سونے، چاندی اور ریشم کے تاروں سے ہوئی تھی۔کبھی اِن میں ہیرے بھی ٹنکے تھے جو انیسویں صدی کے وسط تک باسفورس کے کنارے نیا دولما باشی محل بنانے کیلئے ضرورت کے تحت اُتار کر بیچ دیئے گئے تھے۔

اُس نے پاؤں کے نیچے بکھرے قالینوں کو بغور دیکھا تھا اور خود سے بولا تھا۔یہ سونے اور چاندی کی تاروں سے تو ابھی بھی سجے ہوئے ہیں۔تم لوگ کب تک اِن پر چلتے

رہو گے ۔تمہاری معیشت کاتو بیڑہ غرق ہو رہا ہےاور قرضوں کا بوجھ بھی بہت زیادہ ہے ۔سلطان معظم کوتعظیم دیتے ہوئے اُس نے دائیں بائیں ایستادہ درباری وزراء کو دیکھا جو ہاتھ باندھے کھڑے تھے ۔

تاج شاہی دستار کی صورت میں تھا۔لباس شاہی ایک بڑے سے فرغل نما گولڈن لبادے کی صورت متناسب وجود جس کے کُھلے بازوؤں اور گلے کے گرد بنے سیاہ حاشیے اس کی دلکشی بڑھانے کا باعث تھے بہادر دکھاتا تھا۔کنوپی کے اندر صوفہ نما تخت جس کی پشت پر لگے ہیروں اور جواہرات کی لشکارتے مارتی چمک سے ایموس کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں ۔

عثمانیہ سلطنت کا فرمانروا سلطان عبدالحمید ثانی دوزانو حالت میں دونوں بازو گھٹنوں پر رکھے اس پر بے حس و حرکت بیٹھا آنکھوں میں بلا کی چمک لیے انہیں دیکھتا تھا۔کمرے میں سکوت تھا۔ہاں البتہ اُس کے دل کی دھڑکن ضرور شور مچارہی تھی۔یہ ایک ایسا منظر تھا جس کا ایموس اپنی زندگی میں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی ۔

آسٹریا کے نامور یہودی صحافی و دانشور تھیوڈر ہرزل کی طرف سے سلطان کے بلند اقبال اور اُس کے اقتدار کی سلامتی کی دعاؤں کے بعد جو پہلی درخواست تھی وہ کچھ یوں تھی ۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح فلسطین یہودیوں کیلئے بھی بہت اہم اور مقدس مقام ہے۔فلسطین میں اُن کے قیام کی مدّت تین ماہ متعین کردی گئی ہے ۔یہودی زائرین کیلئے سرخ پاسپورٹ ضروری قرار دیا گیا ہے ۔یہ دونوں پابندیاں اگر ختم کردی جائیں تو یہودی قوم ممنون احسان ہوگی ۔

دوسری درخواست کے ساتھ ایک پیشکش بھی تھی اور وہ فلسطین کی کچھ زمین

خریدنے سے متعلق تھی جس کی ادائیگی سے عثمانی سلطنت اپنے قرضے اُتار سکتی تھی۔

اور تیسری درخواست استنبول میں جدید طرز کی یونیورسٹی قائم کرنے کے بارے میں تھی۔

کمرے میں گونجتی آواز خاموش ہوگئی تھی۔آفندی نے کنکھیوں سے سلطان کی جانب دیکھا۔کمان جیسی آبروں کے نیچے آنکھیں اُس پر جمی تھیں۔پھر اُس خاموش فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔چند منٹ گونجتی رہی۔پھر خاموش ہوگئی۔

وہ سُن رہا تھا۔خاموش ساکت کھڑا جیسے کوئی گوشت پوست کا انسان نہ ہو مجسمہ ہو۔

''کیا میں اس بات کا مجاز ہوں یا میرے لیئے یہ ممکن ہے کہ میں اُس زمین کا سودا کروں جو میری ملکیت نہیں۔فلسطینی مسلمان اس کے مالک ہیں۔انہوں نے اپنی جانوں کی قربانیوں سے وہ جگہ حاصل کی ہے۔میں اُس کا چپہ بھی بیچنے کا اختیار نہیں رکھتا۔تم تھیوڈور ہرزل پر یہ واضح کردو کہ وہ اِس خواہش سے باز آجائے۔

تب دفعتاً سلطان کی آواز نے فضا میں ایک بار اور ارتعاش پیدا کیا۔

''مجھے اعتراف ہے سلطان عبدالعزیز کے محلاّت کے تعمیری شوق نے سرکاری خزانے کو خالی کردیا ہے۔قرضوں کا بوجھ بہت زیادہ ہوگیا ہے مگر کوئی میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کردے تب بھی میں فلسطین کی سرزمین کا ایک انچ نہیں بیچوں گا۔''ایک پل کیلئے وہاں گفتگو جیسے ٹھہری پھر رواں ہوئی۔

''میں اِس قانون میں بھی کوئی ترمیم نہیں کروں گا کہ یہودیوں کی فلسطین میں مدّتِ قیام میں توسیع کی جائے اور ان کے پاسپورٹ کا امتیازی رنگ ختم ہو۔

نہیں یہ سب نہیں ہوگا۔ہرزل کو سب کچھ بتادو۔''

خفت اور شرمندگی کا پسینہ جیسے آفندی کے ہر مسام سے پھوٹ نکلا۔ نگاہیں قصداً جھکائے رکھیں کہ اس کا تو حکم تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ آنکھیں جن میں غصہ اور اشتعال کے احساسات کا جو رچاؤ اُبھرا تھا وہ سلطان اور اُس کے درباری وزراء کیلئے پڑھنا مشکل نہ ہوتا اگر یہ جھکی ہوئی نہ ہوتیں اور سلطان کے سامنے ایسے کسی تاثر کو دینے کی بھلا اجازت تھی۔ اُن دونوں کا سر جھکا ہوا تھا اور بہت سی باتوں کا پردہ رہ گیا تھا۔

یہ گفتگو ترکی زبان میں تھی جسے ایموس سمجھ نہیں سکی مگر آواز کی کچھ تیزی اور چہرے پر چھائے غصّے کے سے اثرات اُسے یہ سمجھانے کیلئے کافی تھے کہ سلطان نے انکار کر دیا ہے۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب ایموس نے فیصلہ کیا کہ اُسے کیا کرنا ہے؟ انتظار بھی نہیں کہ مترجم اُس کا کیس پیش کرے۔ اُس نے اپنی درخواست خود ہی پیش کر دی تھی جسے اب مترجم زبان دے رہا تھا اور سلطان توجہ سے سُن رہا تھا۔ اُس کے ساتھ دو مضبوط حوالے تھے۔ وہ تھیوڈور ہرزل کی سیکریٹری تھی۔ ترک نوجوانوں کے ہر دل عزیز لیڈر قراسو آفندی کے حوالے سے آئی تھی۔ سلطان اور مترجم میں مکالمہ ہوا۔ مترجم نے ایموس کو بتایا کل سے وہ ایک ہفتے کیلئے حرم کی شاہی مہمان ہوں گی۔

ایموس کیلئے یہ طلسماتی دنیا کسی الف لیلوی داستان سے کم نہ تھی۔ اس کی حاضری سب سے پہلے والدہ سلطان (مادر ملکہ) کے حضور ہوئی۔ کمروں، راہداریوں، دروازوں کی سجاوٹ اور نقاشی اُس کی آنکھیں پھاڑ رہی تھیں تو وہیں ماحول پر حکومت کرتی گھمبیر خاموشی، خادماؤں کا اشاروں کنائیوں میں باتیں کرنا اُس کو خوف زدہ اور ہراساں کیئے دے رہا تھا۔

مادر ملکہ کے شہابی رنگت والے چہرے پر کہیں کہیں جھریاں ضرور تھیں مگر بڑی

تمکنت اور وقار بکھرا ہوا تھا وہاں۔ بوڑھے سمندر جیسی آنکھوں میں جانے کتنی کہانیاں تھیں یہ موجودہ سلطان کی والدہ تھیں۔

یہ ایک ایسی دنیا تھی جو باہر کی دنیا سے کٹی اور اپنے اندر ایک مکمل دُنیا کے ساتھ جیتی تھی۔ بے شمار حصّوں میں بٹی آدب آداب، شاہی طور طریقوں میں ڈھلی جہاں مادر ملکہ، سلطان کی محبوبائیں، ملکائیں، شہزادیاں، خادمائیں سب اپنے اپنے عہدوں کے مطابق اپنے اپنے اپارٹمنٹوں اور ڈارمیٹریوں میں رہتی تھیں۔ سلطان کے یلدز والے محل سے اِن دنوں سلطان کی ملکائیں، خادمائیں اور اُن کا عملہ توپ کپی محل میں آیا ہوا تھا۔

یہاں ہر طرف اتنا حُسن تھا کہ ایموس کو لگتا تھا جیسے وہ کسی پرستان میں بھول بھٹک کر آ گئی ہے۔ یہ حُسن کی مورتیاں یونانی، اطالوی، برطانوی، فرانسیسی، یوکرائنی اور سرکیشیائی عورتوں کی اولادیں تھیں۔ ان کی نانیاں کہیں سترہویں صدی میں غلام مارکیٹوں سے خرید کر استنبول لائی گئی تھیں جنہیں مشرف بہ اسلام کیے جانے کے بعد تربیت کے اکھاڑے میں اُتار کر اُن پر نئے ماحول کا رنگ و روغن کیا جاتا۔

بہار کے اولین دنوں میں جب ہوائیں مرمرا Marmara Sea کے پانیوں سے تیرتی ماربل ٹیرس کے لانوں میں کھلے ٹیولپ کے پھولوں سے سرگوشیوں میں کہتیں۔

''کیا جانتی ہو آج کون سی لڑکی سلطان کے دل کی دھڑکنوں کو چھوئے گی؟''

''ہم کیا جانیں؟'' ٹیولپ کے پھول ہنستے ہوئے سر ہلاتے۔

نشیلی ہوائیں ہزاروں قمقموں کے کسی چھوٹے سے سوراخ سے اندر جاتے اُس کے شعلے کو ڈراتے دھمکاتے ہوئے لرزاتے ہوئے پوچھتیں۔

''تو تم بتاؤ آج ہما کس کے سر پر بیٹھے گا؟'' شعلے اپنا دامن بچاتے ہوئے کہتے۔

''دیکھو کون مقدر کی اقبال مند ہے۔ اس کا فیصلہ تو سے اور بخت کرے گا''

سُر ساز اور آواز کی لہریں دھڑکنوں میں بجلیاں گراتی نازنینوں کے رخساروں کو چھو کر ان کے کانوں میں ایک سرگوشی کرتیں ۔

''تمہیں ہی بننا ہے۔'' اُس رات کا خواب ہر لڑکی دیکھتی تھی ۔ پر مقدر کا ہما کس کے سر پر بیٹھتا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ نہ ہوائیں، نہ ٹیولپ کے پھول، نہ سُر ساز کی لہریں ،فقط دو آنکھیں ۔

ایموس یہ ساری کہانیاں حرم کی تھرڈ مسٹریس Kalfa سے سُنتی تھی جس کی ماں جرمن تھی اور جو جرمن بہت اچھی بول سکتی تھی ۔

اب تو کوئی سو سال سے حرم میں صرف سرکیشیائی عورتیں اور وہ بھی مسلمان آتی تھیں ۔ایموس نے اِن عورتوں کے ننگے بدن دیکھے اور سوچا خدا نے انہیں کیا صرف مردانی شہوت کی تسکین کے لیے تخلیق کیا ۔یہ جیسے خدا کے فنکارانہ ہاتھوں کے تراشے ہوئے خاص الخاص حُسن کے مجسمے تھے ۔خواجہ سراؤں کی بدصورتیاں دیکھیں ۔شطرنج کھیلی ۔اُن کی دستی کڑھائی دیکھی جنہیں وہ یہودی کاروباری عورتوں کے ہاتھ جو ماہ میں ایک بار حرم میں آتی تھیں بیچتی تھیں ۔ان کے درمیان نفرتوں اور سازشوں کے قصے سُنے ۔ملکاؤں اور محبوباؤں کے رنگ دیکھے ۔خوبصورت موسیقی اور گیت سُنے ۔مزے مزے کے کھانے کھائے اور تحفوں کے ساتھ جب آفندی کے گھر آئی ۔اُس نے آفندی سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں کسی ایسی دُنیا سے آئی ہوں جو محض خیالی ہے ۔جسے کسی داستان گو نے اپنی تخلیقی اپچ سے گھڑا ہے ۔سونے کا بند پنجرہ جس میں سونے کی چڑیاں رہتی ہیں ۔

اُس نے ''اُف بہت لمبا سانس بھرا تھا مگر آفندی میں بہت خوش ہوں میں نے ایک ایسی دُنیا دیکھی جو۔''

آفندی نے اُس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ کاٹتے ہوئے بولا جو عنقریب ختم ہونے والی ہے۔

ایموس نے پلکیں جھپکائیں۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ سلطان اوّل درجے کا وہمی ہے۔ تعلیم، روشن خیالی، عوامی مسائل اور انہیں حل کرنے کی کوششوں اور آئین اُسے سبھوں سے چڑ ہے۔ نوجوان نسل میں بہت اضطراب ہے۔''

''مجھے استنبول نے بہت متاثر کیا ہے۔'' وقت رُخصت ایموس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

''انقلاب بھی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ انقلابی تحریک نے نوجوان نسل کیا عام آدمی سے لے کر فوج تک میں بے چینی اور اضطراب کی لہریں دوڑا دی ہیں۔''

اور آفندی ٹھیک کہتا تھا۔

جب وہ واپس وی آنا آئی اور یوسف ضیا فیملی سے ملی۔ سلطان سے متعلق یوسف ضیا کے جذبات بھی آفندی سے مختلف نہ تھے۔ تاہم ایموس نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے سلطان اور آفندی کے درمیان ہونے والی گفتگو کی تفصیلی روئداد انہیں نہیں بتائی۔ مختصراً ہی ذکر کیا۔

ایموس کا ضیا فیملی سے ملنا ملانا کوئی پانچ چھ سال جاری رہا۔ تھیوڈور ہرزل کی موت کے بعد اُس نے نوکری چھوڑ دی اور جرمنی چلی گئی۔ یوسف ضیا فیملی بھی یروشلم آ گئی۔ بڑے اور چھوٹے بھائیوں نے خطوں کی ڈاک بٹھا دی تھی ہر خط میں بدلتے حالات کی مکمل تصویر کشی ہوتی۔ کبھی کبھار غصّے کا اظہار ہوتا۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے ابتدائی سالوں میں جب صیہونی آبادکاروں کی

بھاری کھیپ رُوس اور مشرقی یورپ کے مُلکوں سے فلسطین پہنچی تو مقامی لوگوں میں اضطراب پھیل گیا تھا۔ بڑے بھائی کے غصّے سے بھرے ہوئے خط نے یوسف ضیا کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تم درس و تدریس میں گم ہو اور مجھے وطن کی ہواؤں میں طوفانوں کی سرسراہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ تم نے ہمیشہ عرب قومیت کے نظریے کی مخالفت کی اور ترکوں کی حکومت اور ان کی چھتر چھاؤں تلے پناہ میں عافیت جانی اس امر کے باوجود کہ ان ترکوں نے تم جیسے ذہین انسان اور کام کرنے والے مئیر کی پیٹھ میں خنجر گھونپا اور خالدیوں کو نیچا دکھانے کیلئے حسینیوں کو بالادست کیا اور اب بھی اندر خانے اسی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے۔

ترک پارلیمنٹ کے عربوں سے متعلق روّیے اور طرز عمل بھلا تم سے زیادہ کون جانتا ہے؟ وہ ہمیشہ سے عربوں کو خود سے کمتر سمجھتے ہیں۔ مجھے بتاؤ انہوں نے ہماری زبان جو ان کی بھی مذہبی زبان ہے اسے کبھی ترکی کے برابر درجہ دیا۔

نہیں کبھی نہیں۔ مقامی پنچائتیں قائم کرنے کا ہمارا ہر مطالبہ بھی ردّ کیا گیا۔ اب اگر عرب افسر فوج میں منظم ہو رہے ہیں تو کیا غلط کر رہے ہیں؟

باہر سے آنے والے یہ صیہونی لبنان اور شام میں رہنے والے فلسطینیوں سے مہنگے داموں زمینوں کی خریداری کر رہے ہیں۔ یہ احمق فلسطینی زمینوں کی اتنی بھاری قیمتیں وصول کر کے بہت خوش ہو رہے ہیں اور نہیں جانتے ہیں کہ وہ کس مصیبت کو دعوت دے رہے ہیں؟ بلدیہ القدس (میونسپل کونسل) کے ارکان کی تعداد میں ہمیشہ سے یہودی رکن ایک ہوتا تھا اب تقاضا ہے کہ اُن کی تعداد بڑھائی جائے۔

شاہراہ الم کے اُسی چھوٹے سے آفس جس میں بیٹھ کر تم نے بڑے بڑے کام کئیے تھے اُسے بڑا کرنے پر اصرار ہے۔ ویسے آجکل شہر کو خوبصورت بنانے پر بھی بہت زور

ہے۔جیفہ گیٹ Jaffa gate کے ساتھ نئے تھیٹر میں آجکل ترکی اور فرانچ میں کمال کے ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں۔

میونسپل اسپتال کو ہم لوگ بہت توجہ دے رہے ہیں۔بالکل مفت علاج کیا جا رہا ہے۔دراصل نئے تعمیر ہونے والے سینٹ لوئیس اسپتال میں علاج اور مریضوں کی دیکھ بھال بہت عمدہ طریقے سے ہو رہی ہے۔مسلمان اُس اسپتال کی طرف بھاگے جاتے ہیں۔

مشنری لوگوں کے اپنے عزائم ہیں اور بہر حال یہ تو ماننا پڑے گا کہ ان یہودیوں اور عیسائیوں میں فلاحی کام کرنے کے جذبے جنون کی حدوں کو پہنچے ہوئے ہیں۔تم سے زیادہ مونٹی فیورے کا مدّاح کون ہوگا کہ جس کے صحت کے اصولوں پر بنائے گئے گھروں نے یہودیوں کی کایا کلپ کر دی۔

جیوش کواٹر (حصّے) کے المسلخ میں رہنے والے مفلوک الحال لوگ جن کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، گال پچکے ہوئے، رنگت سرسوں کے پھولوں جیسی اور بدن ڈھانچے جیسے جو المسلخ کے ایک ایک کمرے پر مشتمل باڑے میں رہتے رہتے زندگی تمام کر دیتے تھے۔یہی کمرہ اُن کا باورچی خانہ جہاں لکڑیوں کے دھوئیں سے بھرے ماحول میں کھانا پکتا۔روشنی اور ہوا سے محروم اس جگہ میں انہیں تپ دق جیسا موذی مرض اپنے پنجوں میں جکڑ کر ہلاک کر ڈالتا۔

مونٹی فیورے نے یہ جگہ تو اسپتال بنانے کیلئے خریدی تھی مگر بعد میں ارادہ بدل دیا اور گھر بنائے۔کن جتنوں سے اُس نے اِن لوگوں کو ان کے تنگ و تاریک گھروں سے نکالا اور کھلی اور پُرفضا جگہ پر لے گیا۔

دیکھو تو کیسا احمق ہوں یہ تفصیل لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔بھلا تم سے زیادہ کون جانتا ہے۔یہ تمہی تو تھے جس نے ایک دفعہ کہا تھا مونٹی فیورے نے دُنیا میں جنت بنالی ہے المسلخ

کے غریب یہودیوں کی صحت حیرت انگیز طور پر بہتر ہوگئی ہے۔

یہی حال سکولوں کا ہے۔ تمہیں اب یروشلم آجانا چاہیے۔ تعلیم اور صحت دو بنیادی مسائل ہیں جو ہماری بھرپور توجہ چاہتے ہیں۔ ان دینی مدرسوں کی جگہ ماڈرن سکولوں کی اشد ضرورت ہے اور ایسی ہی بے شمار باتیں تھیں جنہوں نے یوسف ضیا کو وطن واپسی پر آمادہ کیا تھا۔

بہت سالوں بعد ایک اُداس سی دوپہر ایموس کو برلن اپنے گھر کے پتے پر آفندی کا خط ملا تھا۔ آفندی لکھتا تھا۔

ایموس رات بہت تاریک تھی۔ تقسیم میدان سے جیپ نے ٹرن لیا تو تم مجھے یاد آئیں۔ میرے ساتھ اسد پاشا تھا اور ہم جنرل غازی محمود پاشا کی طرف سے سلطان کی معزولی کا پروانہ لے کر قصرِ یلدز جا رہے تھے۔ مقدونیہ کی فوج کا سالار غازی محمود پاشا کی فوج ہلال کی صورت شہر کے گرد پھیلی اور عثمانیہ مملکت پر قابض ہو چکی تھی۔

ایموس یہ بھی کیسا منظر تھا۔ بس ایک فقرہ ذہن میں گونجتا تھا۔ نیرنگی زمانہ تجھے کیا کہوں؟ سلطان اور ہمارے درمیان طویل مکالمے تھے۔ اُن آنکھوں میں آنسو تھے اور ہمارے پاس اشک شوئی کی بجائے حکم تھا کہ صبح منہ اندھیرے آپ کو اپنے اہل خانہ اور خدام کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کیلئے روانہ ہونا ہے۔

اور شاید میں کبھی اپنے احساسات کو وہ زبان نہ دے سکوں جب میں نے شہزادی درِّشہوار کو کمرے میں آتے دیکھا۔ درِّشہوار جس کے ہم سب عاشق تھے اس کی ہیرے کی مانند کودیتی آنکھوں کی جوت مدھم ہوئی پڑی تھی۔ چہرے پر دبدبہ اور تناؤ تھا جو خود ساختہ تھا۔ میں نے گہرے دُکھ اور تاسف سے اُسے دیکھا تھا جس نے سالوں میری نیندیں اُڑائی تھیں۔ میں قریب گیا۔ چند لمحے اُس ماہ کامل کو دیکھتا رہا پھر مدھم اور افسردہ سے لہجے

میں کہا۔

''آپ کو استنبول چھوڑنے کی پوری آزادی ہے''۔

اور اُس مہ لقا نے میری طرف تیکھی چتون سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے ایسی آزادی نہیں چاہیے۔''

اور جب وہ اورئینٹ ایکسپریس میں سوار ہونے سے قبل ویٹنگ روم میں موجود تھے اور ہم سب بھی مودبانہ وہاں کھڑے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کا یہودی مینجر آیا اور سلطان کے سامنے دوزانو ہو کر بولا۔

''استنبول کے یہودی عثمانی سلاطین کے ہمیشہ شکرگزار رہیں گے۔ سپین کی ملکہ ازابیل نے جب ہمارے اجداد کا قتل عام شروع کیا تو انہیں کہاں پناہ ملی؟ مسلمانوں کے دامن میں۔

اور ہمارے فوجی سارجنٹ جو بطور محافظ اُن کے ساتھ تھے انہوں نے واپس آ کر بتایا تھا کہ جب ٹرین ہنگری کی سرزمین سے گزر رہی تھی سلطان کی آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے۔

''یہی وہ سرزمین ہے جس نے میرے جدِّ امجد سلیمان ذی شان کو Suleyman The Magnificient کہا تھا۔

''میں کیسا بدقسمت ہوں۔ میرے اجداد تو گھوڑوں پر سوار فتح کے بلند پرچموں کے ساتھ یہاں آئے تھے اور میرے چہرے پر شکست، ناکامی اور ندامت کی سیاہی پھیلی ہے۔ شاید عروج کے بعد زوال بھی قوموں کا مقدر ہوتا ہے۔''

تیسرا باب:

مشرقی یروشلم کی یہ آخری گلی جو تنگ تنگ گلیوں اور بلند و بالا عمارات کے سائے میں چلتی تھی آخری سرے پر جا کر مغربی یروشلم سے جا ملتی تھی۔

اِس گھر کا دیوقامت مرکزی چوبی دروازہ محرابی خموں میں سمایا اپنی بیرونی فصیل نما دیوار جس میں جھانکتی کہیں کہیں کوئی کھڑکی ازمنہ وسطیٰ کے تعمیری انداز کا سا تاثر چھوڑتی دیکھنے والے پر رعب دوب اور ہیبت کا سا احساس پیدا کرتی تھی۔

اِس وقت ضالیہ آنگن میں کنویں کے پاس کھڑی شرقی دیوار پر پھیلی انگوروں کی بیلوں کو دیکھتی اور اپنے آپ سے خود کلامی کرتی تھی۔

''کوئی اس کمبخت لیلیٰ سے بڑھ کر ہڈحرام نوکر میری اب تک کی زندگی میں نہیں آیا۔منحوس ماری جانے کس دُنیا میں رہتی ہے؟ جاتے جاتے بھی میں نے پلٹ کر کوئی دس بار تو کہا ہوگا۔

''لیلیٰ اِن بیلوں کو،اِن بوٹوں کو،اِن پیڑوں کو پانی دینا نہ بھولنا۔اپنا بھلکو پن میری واپسی تک کہیں گروی رکھ آنا۔'' اُس نے تاسف بھری نگاہوں سے بیلوں کو دیکھا۔

''ہائے کیسے مرجھائی پڑی ہیں۔اُف دیکھوتو ذرا غربی سمت سنگترے کے بوٹوں کی پوری قطار بھی خود کو ڈھائی ماہ نظر انداز کیے جانے پر شکایت کناں نظر آتی ہے۔شکر ہے گلاب ہنس رہے ہیں۔صحن کی رونق ان کے مسکرانے سے کتنی بڑھ گئی ہے؟ صبح کی دھوپ میں ابھی نرمی اور ملائمت ہے۔خوشبو،سنہری دھوپ میں نہایا یہ سب کتنا خوبصورت اور دل کو چُھوتا ہوا لگ رہا ہے۔ایک وجہ شاید دنوں بعد اپنے گھر آنے کا جذباتی ردّعمل بھی ہے۔''

اس نے سر جھٹکا اور سوچا کہ دوپہر کے کھانے پر تبولی Tabouli ضرور بنانا ہے۔ امو کو بہت پسند ہے۔ میٹھے میں کنف کی انہیں بڑی چاہ رہتی ہے۔ تبھی لیلیٰ نے قریب آ کر کہا۔

''ننھے قاسم کو بھوک لگ رہی ہے۔ آپ جدّو کے کمرے میں چلیے۔ وہ ان کے پاس ہے۔''

''لیلیٰ تیرا بیڑہ غرق ہو تُو نے قاسم کو صاف کیا تھا۔ تم جانتی بھی ہو کہ وہ صفائی کے بارے میں کتنی حساس ہیں؟ میری آنکھ دیر سے کھلی اور میں فوراً باہر چلی آئی۔''

میں نے اُسے سپــنـج کیا۔ پاؤڈر لگایا اور کپڑے بدلے۔ پھر لے کر گئی تھی۔ وہ مجھ سے آپ کا پوچھ رہی تھیں۔

ضالیہ اپنے کمرے میں آئی۔ بالوں میں اُوپر اُوپر سے کنگھا چلایا۔ وہ گھر میں عام طور پر لونگ سکرٹ پہنتی تھی۔ مگر آجکل شارٹ سکرٹ برابر پہن رہی تھی۔ بچے کو فیڈ کرنے میں آسانی محسوس کرتی تھی۔ اس وقت تو وہ ویسے بھی سلیپنگ سوٹ میں تھی۔ فوراً چینج کیا اور ساس کے پاس پہنچی۔ انہیں سلام کیا۔ دُعا لی اور کمرے میں بچھے دبیز ایرانی قالین پر بیٹھ کر بچے کو دودھ پلانے لگی۔

پلنگ کے سرہانے رکھے ہوئے میز پر اخبارات کے پلندے پڑے تھے۔ سارہ انگریزی، عربی اور عبرانی اخبارات کی باقاعدہ قاری تھیں اور ہر چھوٹی سے چھوٹی خبر سے بھی واقف رہتیں۔ ہیرز Haaretz عبرانی کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی چھپتا تھا اور وہ کوئی سات آٹھ سال سے گھر میں باقاعدہ آتا تھا۔ ضالیہ کو یہ تعصّب سے بھرا اخبار زہر لگتا تھا مگر یوسف ضیاء کی وجہ سے مجبوری تھی۔ قاہرہ سے چھپنے والا ''الاہرام'' کوئی ڈیڑھ بجے یروشلم پہنچتا تھا۔ بالعموم یہ رات کو سارہ کے کمرے میں آتا تھا جسے وہ صبح دیکھتی تھیں۔ ضالیہ اکثر و

بیشتر اُن کی صحت کے پیشِ نظر انہیں منع کرتیں مگر وہ ہنس کر کہتیں۔

''ارے بچے یوسف ضیا جیسے کتاب اور سیاست سے محبت رکھنے والے بندے کے ساتھ رہنے سے بھلا اِن چسکوں سے آزاد رہنا کہیں ممکن تھا۔اب تو خیر عادت بن گئی ہے۔''اسی لیے شاید سوچوں میں ڈوبے رہنا بھی اب ایک عام سی بات تھی۔خوبصورت چہرے پر ہر خبر کے بعد تفکر کا نمودار ہونا بھی فطری تھا۔سال ہا سال کی دکھی سوچوں کے اثرات ماتھے پر شکنوں کی صورت نمودار ہو رہے تھے۔

یوسف ضیا کے بڑے بھائی کا بیٹا فارس وددو خالدی بڑی مثبت سوچ کا نوجوان جو تینوں قوموں کے رویّوں پر بے لاگ تنقید کرتا تھا۔اپنی سوچوں اور عمل میں اپنے چچا کا پرتو تھا۔ڈسٹرکٹ کمشنر ایڈورڈ کیتھ اُس کے مشورے اور رائے کو بہت اہمیت دیتا تھا۔اگر اُسے حرم پر عبادت کے وقت یہودیوں کے ناقوس بجانے اور شور شرابا کرنے پر سخت اعتراض تھا تو وہیں اُسے یہودی عبادت گاہ کی شمالی دیوار کھولنے پر بھی حد درجہ افسوس تھا۔مسلمانوں نے اِسے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ عین اُن کی عبادت کے وقت اُونچے اُونچے بولتے۔غُل غپاڑہ مچاتے۔

دیوار کھلنے سے اُن بدوؤں کی بھی بن آئی تھی جنہیں اپنے جانور وادی حنوم میں لے جانے کیلئے لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔وہ اب گلی سے گزرنے لگے تھے۔تنگ سی گلی میں جانوروں کے گزرنے سے عجیب بدنظمی سی پھیل جاتی۔

جیوٹنسکی کے نوجوان شاگرد جب اشتعال انگیز تقریریں کرتے اور یہودی پرچم لہرا لہرا کر اشتعال دلاتے تھے تب بھی وہ امن پسند یہودیوں سے کہتا تھا کہ وہ باہر نکلیں۔یورپ سے آنے والے یہودیوں اور عرب یہودیوں میں جو لڑائی جھگڑے اور تنازعے آئے دن ہوتے رہتے تھے وہ تو اپنے جاننے والے یہودیوں کے درمیان بھی صلح صفائی

کیلئے بھاگا پھرتا۔

ڈاکٹر ابوشدائد گو کہنے کو یہودی تھے پر بہت روشن خیال سمجھے جاتے تھے۔فارس خالدی کے ساتھ ہمیشہ شانہ ملا کر کھڑے ہوتے۔دونوں یہودیوں اور عرب مسلمانوں کو ترکوں کے ساتھ اتحاد پر زور دیتے۔بیت الحم میں عیسائیوں کے مذہبی فرقوں میں مسلمانوں کے شیعہ سُنیوں کی طرح آئے دن جو لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے وہ اُن میں مفاہمت کیلئے بھی سرگرم رہتا۔گذشتہ سال چرچ کے اندر مرمت کی ضرورت محسوس ہونے پر ہر فرقے کا اصرار تھا خصوصاً رومی کچھ زیادہ ہی جوشیلے تھے کہ یہ سعادت تو انہیں ملنی چاہیے۔یہ تو اُنکا حق ہے اور یہ کشمکش روز بروز بڑھتی ہی جارہی تھی۔

وہ ایک دن وہ گورنر کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور انتہائی تلخی سے بولا۔

''لگتا ہے جیسے آپ لوگ خود خون خرابہ چاہتے ہیں۔آخر استنبول حکومت کو اطلاع کیوں نہیں دیتے کہ یہاں حالات انتہائی مخدوش ہورہے ہیں۔سر پھٹول ہوگی۔بیس لوگ مارے اور پچاس زخمی ہوں گے اور دُنیا بھر میں رولا اور شور شرابا مچے گا تب ایکشن ہوگا۔''

اس ساری بھاگ دوڑ کا نتیجہ مثبت ہی نکلا اور حکومت نے خود مرمت کروادی۔

یہ صرف ایسے لوگوں کی کاوش کا نتیجہ تھا کہ شہروں میں تھوڑا سا امن وامان تھا مگر یہ سب کتنا عارضی تھا۔

پہلی جنگ عظیم نے پانسہ پلٹ دیا۔انگریز قابض ہو گئے اور سیاسی کھیل نے تیزی پکڑلی اور دونوں قومیں دہشت گرد جتھے بنانے میں اُلجھی ہوئی تھیں۔دوسری جنگ عظیم میں یہودیوں کی فلسطین کے شہروں پر جو یلغار ہو رہی تھی اُس نے عربوں کو پریشان کر دیا تھا۔ہنگاموں نے زور پکڑلیا تھا اور انہی ہنگاموں میں وہ پیارا سالٹر کا بھینٹ چڑھا۔اس کی شہادت پر وہ اور یوسف مہینوں ملول رہے۔سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی حالات کے

غیر یقینی رُخ ''سب ٹھیک ہے'' جیسے الفاظ سُننے کے متمنی رہتے تھے۔

رات انہوں نے کئی بار رضالیہ سے نابلوس کے بارے میں پوچھا اور پھر بڑی لمبی سرد سی آہ بھرتے ہوئے انہوں نے شکر ادا کیا تھا کہ نابلوس میں اُن کا گاؤں ابھی اِن صیہونی کتوں سے محفوظ ہے۔ہاں زیتون کے تیل کے عیسائی تاجروں اور کسانوں کے درمیان لڑائی جھگڑوں کا ذکر سُن کر بولی تھیں۔

''چلو ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے تو معمول کی باتیں ہیں۔یہ سب تو سانسوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔''

وہ خاموش ہو گئیں۔بہت دیر بعد یہ خاموشی ٹوٹی اور انہوں نے مدھم سے لہجے میں کہا۔

''میں تمہارے انتظار میں تھی کہ تم آؤ اور میں حیفہ جاؤں۔گو ملازم جان نثار اور وفادار ہیں مگر اب تو زور زبردستیوں والے معاملے ہیں۔ابھی تک تو چلو احترام والا معاملہ چل رہا ہے۔یہ کب ختم ہونا ہے اللہ جانے۔''

قاسم سو گیا تھا۔اُسے لٹا کر وہ باہر نکلی۔تبھی کچن سے نکل کر باقیا اُس کے پاس آئی تھی اور مدھم آواز میں بولی۔

''مردان خانے میں کامل الحسینی آئے ہیں۔قہوے کے ساتھ کیا چیز بھجواؤں۔''

''باقیا تمہیں بھی لیلیٰ کی قربت نے رنگ چڑھا دیا ہے۔میں ڈھائی ماہ بعد رات کو آئی ہوں۔مجھے کیا پتہ کہ گھر میں اس وقت کیا کیا چیزیں ہیں؟ اگر حلوہ پڑا ہے تو وہ بھیجو۔عمو الحسینی بہت شوق سے کھاتے ہیں۔''

عمو کامل الحسینی اُس کی ساس کے خلیرے بھائی اُس کے سر یوسف ضیا کے گہرے دوست اور یروشلم کے سر کردہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔جب بھی قومی سطح کی کوئی پریشان

کن بات ہوتی یا کوئی ذاتی مسئلہ ہوتا وہ خود بھاگے آتے یا انہیں بُلا لیتے۔

''اللہ'' ضالیہ نے بھی لمبی سانس بھری تھی۔

''پروردگارا میرے فلسطین کو اپنی پناہ میں رکھ۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے میں کتنے بڑے طوفان اُٹھ رہے ہیں کہ اُن کی دھمک سے دل دہلے جاتے ہیں؟ چاولوں کے دانوں کی طرح کہیں کہیں بکھری یہ یہودقوم کیسے اس پر قابض ہونے کیلئے سیلاب کی طرح اُمڈی آرہی ہے؟

عین اُسی وقت اُس نے دیکھا کہ بیرونی پھاٹک نما دروازے کی چھوٹی کھڑکی تھوڑی سی کُھلی۔ پھر تھوڑا سا اور کُھلی اور پھر اُس میں سے سات آٹھ سال کی ایک صحت مند گلاب رنگ چہرے والی گھبرائی ہوئی بچی نے قدم اندر رکھا اور اُسے دیکھتے ہی فرش پر جیسے ساکت ہوگئی۔ وہ برق رفتاری سے بھاگی۔ دونوں ہاتھوں میں اُس کا چہرہ تھامتے ہوئے اُس نے پہلے عربی میں پھر فوراً انگریزی میں پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

بچی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اُس کی آنکھوں سے نکل کر اُس کے سُرخ وسفید رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔

اُس نے تڑپ کر بچی کو بانہوں کے کلاوے میں لیا اور بیوقوفوں کی طرح اپنا سوال پھر دہرایا۔ اُس کے آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی۔ پہلے ضالیہ کو خیال آیا کہ شاید بچی انگریزی نہیں سمجھتی مگر جب اُس نے اُس کے ماتھے پر بوسہ دیتے اور اس کے آنسوؤں کو اپنی پوروں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میرے بچے مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔ آخر ہوا کیا ہے اور آپ کہاں سے آئے ہو؟''

''میری ماما بیہوش ہیں'' اور ساتھ ہی ہاتھ دروازے کی طرف اُٹھ گیا۔ یقیناً اس

اشارے میں گلی کا ہی کوئی گھر مقصود ہوگا۔ کون سا تھا؟ مزید سوال جواب کے کسی چکر میں پڑنے کے اُس نے باہر نکلنے کی تیزی کی اور جب وہ بچی کا ہاتھ تھامے گلی میں آئی۔ پوری لین میں سناٹا تھا۔ چوکور موزیک کے گملے میں لگے سرو کے دراز قامت بوٹے کے پاس ایک کتا بیٹھا تھا۔ گذشتہ ایک سال سے مسلسل نظر آنے والا کتا ویسے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ضالیہ کو اگر جلدی نہ ہوتی تو اُس نے رُک کر اِسے پیار بھری نظروں سے دیکھنا تھا۔ گلابی پتھروں اور محرابوں والی گلی کی ابھی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ دو منزلہ سہ منزلہ گھروں کی کھڑکیاں بند تھیں۔ بچی عین سامنے والے گھر میں داخل ہوئی۔

''اوہو'' یہ تو دراصل ضالیہ لوگوں کا ہی گھر تھا جو یوسف ضیا نے کوئی پندرہ سال پہلے ایک شامی فیملی سے خریدا تھا جو بیروت چلی گئی تھی۔ یہ کرایے پر دیا جاتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے خالی تھا۔

ضالیہ نے خود سے کہا تھا۔ ''اچھا تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر موسیٰ نے رات گھر آتے ہوئے بات کی تھی۔ وہ گزشتہ ڈھائی ماہ سے اپنی والدہ کے پاس نابلوس گئی ہوئی تھی۔ ایک تو اس کے ہاں دوسرا بچہ متوقع تھا۔ دوسرے اُس کا بھائی بہت سالوں بعد فرانس سے آیا تھا۔ تیسرے اُس کے شوہر ڈاکٹر موسیٰ کو بھی دو ماہ کیلئے امریکہ جانا تھا۔ واپسی میں اُسے دو ہفتوں کیلئے لندن اپنے دونوں بڑے بھائیوں کے پاس ٹھہرنا تھا۔ بڑا بیٹا منصور یروشلم کے سینٹ جارج سکول میں تھرڈ سٹینڈرڈ میں پڑھتا تھا۔ اُسے دادا دادی کے پاس چھوڑنا پڑا۔ اُس کی ساس حیفہ میں ہوتی ہیں۔ انہیں وراثت میں اولڈ حیفہ کا قدیمی گھر باغ اور زمینیں ملی تھیں۔ کچھ سالوں سے ان کا زیادہ وقت حیفہ میں گزرتا تھا۔ یروشلم یوسف ضیا کی کمزوری تھا۔ اِس شہر کے علاوہ وہ کہیں زیادہ دن نہ ٹکتے۔

ڈاکٹر موسیٰ واپس آئے تو بیوی بچے کو لینے نابلوس اپنی سسرال گئے۔ راستے میں

ڈاکٹر موسیٰ نے اس فیملی کی بابت ذکر کیا تھا۔ایموس وِلسن ابا کے ترک یہودی دوست قراسو آفندی کی جاننے والی ہیں۔وی آنا میں اُن کے گھر بھی آیا کرتی تھیں۔اماں ابا سے بہت دوستی تھی۔ہمیں بھی بہت پیار کرتی تھیں۔خاص طور پر مجھے۔میرے سرخ سرخ پھولے ہوئے رخسار انہیں بہت پسند تھے۔کوئی دس بار تو انہیں چومنا وہ ضروری سمجھتی تھیں۔مجھے یاد ہے کہ اگر انہیں آنے میں کچھ دن زیادہ ہو جاتے تو ہم ان کے آنے پر روٹھ جاتے تھے اور پھر وہ ہمیں کن جتنوں سے مناتیں۔اماں اور ابا کو کبھی کبھی خط بھی لکھتی تھیں۔

جرمن نازیوں کے ہاتھوں تباہ ہو کر شوہر، بیٹی اور اس کے دو بچوں کے ساتھ لندن پہنچی تھیں۔برطانیہ تو خود جنگ سے نڈھال ہوا پڑا ہے۔روزگار بھی دیہاڑیوں میں بٹا ہوا ملا۔شوہر زور زبردستی سے یہودیوں کے اِس نئے وطن لے آیا۔بحری جہاز سے حیفہ کے ساحل پر اُترتے ہی یہودی ویلفیئر تنظیم نے انہیں سنبھال لیا مگر ایموس کو بڑی بے گانگی اور اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی۔چند دن بعد اُس نے بیٹی سے کہا۔

''یرڈینا میں یروشلم جا کر یوسف ضیا سے ملتی ہوں۔وہ بہت مخلص اور محبت والے لوگ ہیں۔تم جتنی ٹوٹی پھوٹی ہو تمہیں ہمدرد اور غم گسار لوگوں کی ضرورت ہے۔مجھے تمہیں اکیلا چھوڑ کر پھر واپس جانا ہے۔تمہارے ماموں سے پیسے لانے ہیں۔وہ یروشلم آئی۔گھر کا مسئلہ حل ہوا اور جب واپس حیفہ گئی تو اگلے دن شوہر بیٹھے بٹھائے چل بسا تھا۔

ایموس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر دامن میں گرتی تھیں۔

''سارہ مجھے لگتا ہے جیسے خدا نے ساری دُنیا کی مصیبتوں کیلئے مجھے اور میری بیٹی کو چُن لیا ہے۔''

''ایموس یہ ہماری آزمائشیں ہیں۔ہمارے امتحان ہیں۔یہ وہ دکھ ہیں جو ہمیں سہنے ہیں۔''

دلداری کرتے سارہ نے اپنی آنکھوں کی لڑیوں کو اپنے سکارف میں سمیٹا۔ بیٹے کو منصور کے سکول سینٹ جارج میں داخل کروایا۔ ایک بچی بھی ہے۔ امّو سے ملنے آتی رہتی ہے۔ بتاتی ہیں بہت دُکھی اور اکھڑی اکھڑی سی ہے۔ شاید اب کوئی جاب بھی کر رہی ہے۔

یہ سب وہ باتیں تھیں جو صحن پار کرتے کرتے اُسے یاد آئیں۔ تیز رفتار بچی کے تعاقب میں جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو جیسے دھک سے رہ گئی۔ تقریباً اُسی کی یا اُس سے کچھ بڑی عمر کی عورت بیڈ پر بے سُدھ پڑی تھی۔

اُس نے فوراً اُس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر سر اُونچا کیا۔ ناک کو چند لمحوں کیلئے بند کیا۔ عورت کا پورا وجود جیسے جاں بلب انسان کی طرح پھڑ پھڑایا۔ پھر آنکھیں کُھلیں۔ اُسنے جھرجھری سی لی۔ وہ ساری جان سے کانپی تھی۔ کیسی آنکھیں تھیں جیسے ویرانیوں کے ڈیروں میں بڑھی پلی ہوں۔

اُس نے بچی کو تکیہ لانے کیلئے کہا۔ بچی بھاگ کر گئی اور ایک چھوڑ دو تکیے کلاوے میں بھر کر لے آئی۔ اُس نے دونوں تکیے سر کے نیچے رکھے۔

''پانی پانی!''

بچی گلاس لے آئی۔ چند گھونٹ اُسے پلائے۔

ابھی وہ اُس کے ہوش میں آنے پر شکر بھی ادا نہ کر پائی تھی کہ وہ پھر بیہوش ہوگئی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ ڈاکٹر موسیٰ کو فون کروں یا ابّی کو بلاؤں۔''

ضالیہ کا ہر انداز تفکّر اور بے چینی کا غمّاز تھا۔

''اللہ ابّی کے پاس تو عموالحسینی آئے ہوئے ہیں۔ وہ کہاں بھاگتے آئیں گے۔''

آدھ گھنٹہ بعد بھی جب وہ اپنی سی کوششوں میں کامیاب نہ ہوسکی تو بھاگی بھاگی گئی

اور مردان خانے میں جا کر اطلاع دی۔ دونوں معمر مرد فوراً اس کے ساتھ بھاگے۔ یہ اُن کے آنے، آیات کا ورد کرنے، اس پر پھونکنے اور یوسف ضیا کی ناک بند کرنے کا اعجاز کا تھا یا دورے کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ کسی گرفتار شدہ پھڑ پھڑاتے پرندے کی طرح اُس کا پورا وجود پھڑ پھڑایا تھا۔ پھر آنکھیں کھلیں۔ اُس نے پانی پیا اور نحیف آواز میں دونوں بزرگوں کا شکریہ ادا کیا۔

اور جب یوسف ضیا اور کامل الحسینی واپس آ کر مردان خانے میں بیٹھے تو ان کے درمیان انیسویں صدی کے یروشلم کی بہت سی باتوں کے دروازے کھل گئے جو وہ اپنے باپ داددوں سے سُنتے تھے۔ جب یروشلم کے مغربی محلے کے مسلمانوں کے یہودیوں سے اچھے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہودی اُن کی گلیوں سے گزر کر دیوارِ گریہ پر جاتے۔ خوشگوار اور محبت بھرے انداز میں ایک دوسرے سے ملتے۔

پھر گفتگو اگر اور کاش کے لمبے سلسلوں میں بدل گئی۔ عثمانی سلطنت اگر جاپان کی طرح لندن اور پیرس کی حامی بن کر پہلی جنگ عظیم میں حصّہ لیتی تو منظر نامہ مختلف ہوتا۔ بالفور معاہدہ کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ اہم نہ ہوتا اگر برطانوی فوج ہندوستانی سپاہیوں کی مدد سے یروشلم اور بغداد پر قبضہ نہ کر لیتی۔

دفعتاً یوسف ضیا نے اپنے دونوں ہاتھوں کی پوروں سے اپنی آنکھوں کے پپوٹے مساج کے سے انداز میں چند بار مسلے جیسے وہ ان کی تھکن اور ان کے اندر پھیلی پژمردگی کو تھوڑا سا آرام اور سکون دینے کے متمنی ہوں۔ ماضی اور اس سے وابستہ یادیں بھی کیسی ظالم ہوتی ہیں۔ ہواؤں کے گھوڑوں پر بگٹٹ بھاگتی سامنے آ جاتی ہیں۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ کچھ تصویریں آنکھوں کے سامنے اُبھری تھیں۔ محبت اور خلوص کے شیرے میں لتھڑے چند لوگ یاد آئے تھے وہ جنہوں نے دل کی دُنیا میں کھلبلی سی مچا دی تھی۔ بیسویں صدی کی

ابتدائی دہائیوں میں ہند کے زائرین میں کچھ صاحب علم لوگ بھی وقتاً فوقتاً یروشلم آتے رہتے تھے جو اخبارات میں چھپنے والے یوسف ضیا کے مضامین کے حوالوں سے اُس سے غائبانہ متعارف ہوتے تھے، جب آتے تو اُسے کھوج کرتے ۔یہ لوگ ترکوں سے محبت کے ساتھ ساتھ خلافت کے زبردست حامی اور عرب قومیت کے قدرے مخالف لوگ تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں عرب قومیت پرستی کی وجہ سے کوئی تفرقہ پڑے۔وہ ان کا متحد رہنا مسلم امہ کیلئے بہت ضروری سمجھتے تھے۔ترکوں نے دُنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے یروشلم میں جو زمین کے ٹکڑے مخصوص کر رکھے تھے انہی میں ایک حضرت بابا فرید گنج شکر کے نام سے تھا جہاں ایک خوبصورت سی عمارت ہندوستانی لوگوں کیلئے مخصوص تھی ۔یہیں ہند کی اُسی جید صاحب علم شخصیت فرید الدین احمد نے ان کے سامنے بیٹھ کر گلوگیر لہجے میں اُن سے رواں عربی میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے دوران مختلف اوقات میں یروشلم آنے اور اپنے تاثرات بابت گفتگو کرتے ہوئے اُنکا لہجہ کیسا دلگیر سا تھا۔

یوسف ضیا ہم ہندی مسلمانوں کو اگر اہل حجاز اور اس سرزمین سے عشق ہے تو عثمانی سلطنت بھی ہماری کمزوری تھی۔وہیں اِس القدس آئے بغیر بھی ہماری مسلمانیت صیقل نہیں ہوتی تھی۔پہلی بار کوئی 1911ء کے وسط میں یروشلم آیا تھا۔تب تم فلسطین میں نہیں تھے۔اُنہی دنوں نئے گورنر کی تعیناتی ہوئی تھی۔مجھے اور میرے علم کو جس طرح یہاں سراہا گیا اور گورنر نے ذاتی طور پر میری پذیرائی کی وہ میرے لیئے مسرور کن ہونے کے ساتھ قابلِ فخر بھی تھا۔میرا دل ترک گورنر کی شان وشوکت دیکھ کر پھولے نہ سماتا تھا۔یروشلم شہر کے امراء اور مختلف مذہبی فرقوں کے رہنماؤں نے اکٹھے ہو کر گورنر کا استقبال کیا۔زرنگاری سے مرصع تھیلے سے شاہی فرمان نکالا گیا۔میرمنشی نے اِسے پڑھ کر سُنایا۔استنبول حکومت کی طرف سے نئے گورنر کے ساتھ شہریوں کو تعاون کیلئے کہا گیا تھا۔قطاروں میں کھڑے

عیسائی، یہودی، آرمینائی اور مسلمان سبھوں نے مسرت بھرے نعرے لگائے اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ فوجی بینڈ بجا اور یوسف میں خدا سے دُعا کو ہوا کہ مسلمانوں کی اِس شان کو سلامت رکھے کہ حالات دن بدن مخدوش ہو رہے تھے۔ 1917ء کے سقوط یروشلم پر باتیں کرتے ہوئے کہا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے ان کے آنسو نہ تھمتے تھے۔

میں تو اِس سانحے سے کوئی بیس دن پہلے اسکندریہ سے ٹرین کے ذریعے جیفہ (یافہ) اور وہاں سے القدس آیا تھا۔ موسم میں ٹھنڈک اور افسردگی کا رچاؤ تھا۔ ماحول میں تلخی، شورش اور بے یقینی کے سے احساسات کا بہاؤ تھا۔ میں قدس کے قاضی صاحب (بیسویں صدی کے آغاز میں یروشلم کو القدس کہا جاتا تھا) سے ملنے گیا تو بڑی لمبی سی آہ ان کے سینے سے نکلی تھی جب انہوں نے کہا۔ برٹش پرائم منسٹر جارج لائیڈ نے اپنے کمانڈر انچیف جنرل ایلن بی سے کہا ہے کہ برطانیہ کے لوگوں کو کرسمس کا تحفہ یروشلم کی فتح کی صورت ملنا چاہیے۔ غزہ شدید مزاحمت کے بعد ترک فوج نے اُن کے حوالے کر دیا ہے اور اب آگے انہوں نے بات اُدھوری چھوڑ دی کہ آنسو بہنے لگے تھے۔

غزہ اور یروشلم کے ڈھے جانے کے درمیان زیادہ وقت نہیں تھا۔ صرف ڈیڑھ ماہ بعد یروشلم پر وہ قابض ہو گئے۔ آپ کے دل کی کیفیت کیا ہو گی؟ گو اس وقت تک میری آپ سے بالمشافہ کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی پر میں جانتا ہوں کچھ پوچھنے اور بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ میری آنکھوں سے خون برستا تھا کہ میرے باپ دادا، خود میں اور میرے ہم وطن جس قوم کے غلام تھے وہ قوم اب ہمارے مقدس مقامات اور مسلمانوں پر غالب آگئی تھی۔ اُن کی برسوں کی محنت، منصوبہ بندی اور ذہین و عیار ایجنٹوں کی محنتیں رنگ لائی تھیں۔ لارنس اف عریبیا اور جوٹروڈ بیل جیسے شاطر ایجنٹ اور منتظم جن کی مکارانہ سازشوں اور اپنوں کی غداریوں، بے وفائیوں اور ہوس زر نے ایک عظیم سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا

تھا۔باب دمشق پر برٹش کمانڈر انچیف جنرل ایلن بی اپنے گھوڑے سے اُترا تھا۔اُس کے ساتھ جو سپاہی تھے اُن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی ۔ہندی مسلمان،عرب،افریقی حبشی ۔میں نے آسمان کو دیکھا اور خود سے کہا تو یہ وقت بھی ہم پر آنا تھا۔

یوسف ضیا کی آنکھیں گیلی ہوگئی تھیں ۔کامل مجھے ہندی فریدالدین احمد یاد آیا تھا جس نے ایک ملاقات میں کہا تھا ۔بالفور معاہدہ کی حیثیت کاغذ کے ایک ٹکڑے جتنی ہی ہوتی اگر برطانیہ کی فوج ہم ہندوستانی سپاہیوں کی مدد سے یروشلم اور بغداد پر قبضہ نہ کرلیتی ۔

ہمارے پاس بہت سے پچھتاوے ہیں۔کامل الحسینی بولے۔کاش آرمینیائی لوگوں کے سلسلے میں ترک پالیسی قتل عام پر مشتمل نہ ہوتی ۔کاش عرب ریاستیں فلسطین کے ساتھ مخلص ہوتیں ۔کہیں اندر خانے کے کھیتا رسیس تھے۔کہیں یہودیوں اور ان کی چالبازیوں پر حاشیہ آرائیاں تھیں ۔اگر ہٹلر نے ان کی نسل کشی کی تو یہ اس سلوک کے مستحق تھے ۔پہلی جنگ عظیم میں جرمنوں کی شکست کے ذمہ دار بھی یہی لوگ تھے ۔اسلحے کی گھٹیا سپلائی ،جرمن مزدوروں اور کارکنوں کو ہڑتالوں اور پُرتشدد مظاہروں کی ترغیب اور امریکہ کو برنارڈ باروچ جیسے لوگوں کے ذریعے جنگ میں کود پڑنے کیلئے دباؤ ۔احسان فراموش قوم ہے ۔جس مُلک میں گئے اسی مُلک کا حشر نشر کردیا ۔روس اور فرانس میں ان کی حرکتیں ۔فری میسن تحریک کے پیچھے سازشوں کی لڑیاں ۔تاہم اپنی نالائقیوں پر بھی حاشیہ آرائیاں تھیں ۔اچھی لیڈرشپ ،اتفاق اور وسائل کی کمی کا بھی رونا تھا۔برطانیہ نے حال میں ہی صیہونیوں کی طرف سے اُن ایک لاکھ یہودیوں کو جو نازی کیمپوں میں پڑے تھے فلسطین لانے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا پر تھوڑا سا مسرت بھرا اظہار تھا۔

بس جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے والی باتیں تھیں۔

بہت دیر بعد یرڈینا اپنی تکلیف کے حصار سے ذرا سا باہر نکلی اور اُس نے ایک

چاند چہرے کو اپنے پاس پریشان سا بیٹھے دیکھا۔چہرے پر معذرت خواہانہ انداز لیے اُس نے ملتجی لہجے میں کہا کہ بچی بھوکی ہے۔ابھی سکول سے آئی تھی۔پریشان ہے اور وہ چاہتی ہے کہ وہ اُسے اپنے گھر لے جائے۔طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ کچھ تیار بھی نہیں کرسکی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ یقیناً ضالیہ ہی ہے اور وہ اُس سے غائبانہ متعارف ہے۔ضالیہ نے محبت سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور خفیف سا مسکرائی اور دل میں کہا یہ ممتا بھی کیا چیز ہے؟وہ کیا کھائے گی؟ اُس کے پوچھنے پر اُس نے انکار میں سر ہلایا۔اب اس کی ہر حرکت ایک ہی وضاحت کرتی تھی کہ بچی بھوکی ہے۔وہ بچی کو گھر لے جائے۔گھر آ کر اُس نے قہوہ بنایا۔چند پتے پودینے کے بھی ڈالے۔باقیا سے بچی کو کچھ کھلانے کا کہتی ہوئی چاندی کی طشتری میں گلاس کے ساتھ دوبارہ آئی۔

''یہ چند گھونٹ آپ کی طبیعت کو بہتر اور آپ کے جسم میں توانائی لے آئیں گے۔''

ضالیہ نے اُسے بازو کے سہارے اُٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ نے کیوں اتنی تکلیف کی؟''

ضالیہ نے اُس کے بکھرے بالوں کو سمیٹا اور گلاس اُس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا تھا۔آپ بھی تکلف والی باتیں مت کریں۔

''مجھے پرڈینا کہو۔'' گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اُس نے ضالیہ کو دیکھا۔

چھوٹا سا گلاس خالی کرنے کے بعد اُس نے قریبی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ضالیہ تم ٹھیک کہتی تھیں میں خود کو بہتر محسوس کر رہی ہوں۔''

اسی دوران کوئی نو،دس سال کا لڑکا اندر آیا۔لڑکی کا بھائی لگتا تھا۔پریشان سا ماں سے کچھ پوچھنے لگا تھا۔پرڈینا نے بچے کے گال پر بوسہ دیا۔اُسے بازوؤں میں سمیٹا اور پھر

ضالیہ کی طرف ممنونیت بھری آنکھوں سے دیکھتے اور پلیز ضالیہ کہتے ہوئے اُسی انداز میں اشارے بازی کی جیسی اُس نے بیٹی کیلئے کی تھی۔

وہ بچے کو بھی پہلے کی طرح ہاتھ سے تھام کر اپنے گھر لے آئی۔لڑکی بھائی کی صورت دیکھتے ہی چہک اٹھی۔اُس کا اپنا بارہ سالہ بیٹا منصور بھی سکول سے آچکا تھا۔لڑکے تو دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔لڑکا ٹوٹی پھوٹی عربی میں بات کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

لیلیٰ نے لڑکی کو کچھ کھلا پلا دیا تھا۔ضالیہ اپنے حسابوں بچوں سے تعارف کا مرحلہ طے کروانے لگی تو منصور نے فوراً ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''امّو یہ ایڈمنڈ ہے۔میرا بہت پیارا دوست۔میرے سکول میں پڑھتا ہے۔اِسے بھی فٹ بال کھیلنا بہت پسند ہے۔یہ بھی سائیکل بہت شوق سے چلاتا ہے۔پر ابھی اس کے پاس سائیکل نہیں۔اور یہ پائل ہے۔امو پائل بہت شرارتی اور چٹوری ہے۔ہر وقت کھاتی رہتی ہے۔''

اور پائل ضالیہ کا دامن پکڑے پوچھتی تھی۔''آنٹی میری مما اب ٹھیک ہیں نا۔''

ضالیہ کو اُس گل رنگ سی لڑکی پر بے اختیار ہی پیار آیا۔اُس نے جھک کر اُس کا ماتھا چوما اور بولی ''بالکل ٹھیک ہیں''۔

منصور بہت خوش تھا۔ایڈمنڈ ''پائل'' اُس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ہمارے ہاں چھوٹا سا بے بیbaby آیا ہے۔میرا چھوٹا بھائی۔میری امو اِسے میری جدہ کے ہاں سے رات کو لے کر آئی ہیں۔اتنا پیارا گول مٹول سا۔''

پائل کی آنکھوں میں جگنو سے ٹمٹمائے۔''چھوٹا سا بے بیbaby۔چلو مجھے دکھاؤ۔''

وہ ننھے قاسم کے جھولے کے پاس کھڑے ہوکر اُسے دیکھتے اور خوش ہوتے رہے۔پائل نے ڈرتے ڈرتے اس کے رخساروں کو چھوا۔

ایڈمنڈ نے منصور کی سائیکل پر للچائی ہوئی نظر ڈالی اور کہا۔

"میں تمہاری سائیکل چلاؤں۔""ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

کچن میں کام کرتی باقیا نے ضالیہ کوان کے برلن میں اُس گھر کا بتایا جس پر بمباری ہوئی تھی۔جو جل گیا تھااور جس کی سیڑھیوں کے نیچے بچے دو دن بیٹھے رہے۔

بیچارے ایڈمنڈ کے ننھے سے ذہن میں بڑی بھیانک تصویر ہے کہ اُس کا بڑا بھائی کمرے میں جل گیا تھا۔

پائل جھولے کے پاس سے ہٹنے کا نام نہ لے رہی تھی۔

"منصور مجھے تمہارا گھر بہت اچھا لگتا ہے کیونکہ اس میں نارنگیاں لگی ہوئی ہیں۔مجھے نارنگیاں بہت پسند ہیں مگر اب یہ ننھا قاسم تو نارنگیوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔پلیز منصور اسے میری گود میں بٹھاؤ۔"

ایڈمنڈ سائیکل چلا چلا کر جب تھک گیا تب اندر آیا۔دونوں ابھی تک قاسم کے جھولے کے پاس بیٹھے باتیں کرتے تھے۔

"منصور وہ بنجمن دیکھا ہے تم نے۔ایڈمنڈ نے اُس کی توجہ اپنی طرف کی۔میری کلاس میں میرے ساتھ والی سیٹ seat پر بیٹھتا ہے۔آج مجھے کہتا تھا۔مسلمان خراب ہوتے ہیں۔مار دیتے ہیں۔میں نے کہا "نہیں۔وہ تو بہت اچھے ہیں۔دیکھو تمہاری ماما کتنی اچھی ہیں۔"

ضالیہ کچن میں گئی۔باقیا نے چاول اُبال رکھے تھے۔بھیڑ کا شوربا اور سلاد بھی تیار تھا۔مردانے میں کھانا بھجوا دینے کا کہہ کر اُس نے ساس کو پوچھا تھا۔انہوں نے کھانا کھالیا

ہے۔اطمینان بھری سانس لے کر وہ بولی تھی۔

''باقیا میں ذرا قاسم کو دیکھ آؤں۔تم لڑکوں کو کھانا دو اور ٹرے میں پائل کی مما کیلئے بھی رکھو۔''

قاسم سو رہا تھا۔لیلیٰ پاس تھی۔اُس نے ضالیہ سے پوچھا۔

''پائل قاسم کو گود میں لینے کیلئے ضد کر رہی ہے۔''

''اُٹھ جائے تو ذرا دھیان سے دے دینا اور پاس ہی رہنا۔''

اُسے کھانے کی ٹرے کے ساتھ آتے دیکھ کر ریڈینا بے اختیار بول اُٹھی۔

''میری مما ایموس روز ٹھیک کہتی تھی۔یوسف ضیا کا خاندان تم جیسی بکھری عورت کو محبت دے گا۔''

ضالیہ نے اُس کی پلیٹ اُس کے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی بھر دی تھی مگر اُس سے بہت تھوڑا کھایا گیا۔

''ضالیہ''

اُس نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ کے ساتھ رکھے میز پر کھلی پڑی تالمود(تورات کی تفسیر)اُٹھائی اور بولی۔

''آج میں ہگادا(Haggadah)پڑھ رہی تھی۔تالمود مما پڑھتی ہیں۔آج یونہی باکس سے کچھ نکالنے بیٹھی تو یہ ہاتھ میں آ گئی۔ایسے ہی پھولا پھرولی شروع کردی تو یہ ہگادا(Haggadah)کا حصہ سامنے آ گیا۔یہودیوں کی مصر سے شام و فلسطین کی جانب ہجرت کا بیان۔پھر جیسے وہ پھٹ پڑی۔تالمود اُس نے میز پر رکھ دی اور آنسوؤں سے بھرے پیالے اُٹھائے اور اس کے لرزتے ہونٹوں سے آہوں میں ڈوبے الفاظ نکلے۔

''یروشلم تو میں آنا چاہتی تھی اس مقدس شہر میں جسے امن کا شہر کہتے ہیں۔صیہون

کی اُس پہاڑی نے بھی مجھے ہمیشہ ہانٹ کیا جہاں داؤد نے یروشلم فتح کر کے جشن منایا تھا اور جہاں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ہیکل سلیمانی اور گریہ دیوار کو بھی دیکھنے کی چاہت تھی۔ مذہبی رغبت سے کہیں زیادہ اُن کے بارے میں سُنے ہوئے قصے ہانٹ کرتے تھے۔''

وہ چند لمحوں کیلئے رُک گئی تھی۔ اُس کی افسردگی سے لبالب بھری آنکھیں کہیں خلاؤں میں کچھ دیکھتی تھیں۔ دیر بعد وہ بولی تھی۔

ضالیہ اِس خوبصورت قدامتوں والے حُسن و تاریخ سے لبالب بھرے شہر نے مجھے ڈسنا شروع کر دیا ہے۔ یہاں ہر طرف آگ اور خون ہے۔ ظلم اور بربریت ہے۔ ویسی ہی جس میں مَیں اپنا چاند سا بیٹا کھو کر آئی ہوں۔ میں تو ہجرتوں کی مسافر بن گئی ہوں۔ میری جڑیں اُس دھرتی سے کیوں کٹ گئیں جس کے ساتھ میں جڑی ہوئی تھی۔ ہم لندن بھاگے گویا آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکے۔ پھر یہاں آئے یہاں آ کر تو مجھے لگتا ہے جیسے ہم دوزخ میں گر گئے ہیں۔ میری آنکھیں اور میرے کان وہ سب سُن رہے ہیں جو میں سُننا اور دیکھنا نہیں چاہتی کہ یہ بہت خوفناک ہے۔

یہ کب سٹی آف پیس peace ہے اِسے تو سٹی آف بلڈ blood بنایا جا رہا ہے۔ ضالیہ کی اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔

وہ رو رہی تھی ہچکیوں کے ساتھ۔

سچ تو یہ تھا یڈینا کیلئے یہ دُنیا ایک نئی جہنم تھی۔ عبرانی اُسے نہیں آتی تھی۔ انگریزی میں بھی بس ٹھیک ہی تھی۔ حیفہ میں جرمن بولنے والے بہت تھے۔ یروشلم میں کم تھے۔ جرمن زبان میں ایک دو رسالے اُسے نظر آئے تھے۔ انہیں خرید کر پڑھا تو دماغ چکرا گیا۔ The Palestine Post (اب The Jerusalem Post) بائیں بازو کا اخبار۔ ''یہودیوں کیلئے ان کا وطن'' جیسے نعرے لگاتا۔ مار دھاڑ کی خبریں دیتا۔ ہفتے کے

دن Saabat کی چُھٹی کرتا۔ بڑا عجیب سا شہر ہے۔ جلدی سوجاتا ہے اور منہ اندھیرے اُٹھ بیٹھتا ہے۔ موٹی موٹی اُونچی دیواروں میں مقید جیسے کوئی قلعہ ہو۔ وہ کون سی اتنی مذہبی تھی کہ ناقوس (بھیڑ کا سینگ جسے دُنیا بھر میں یہودی عبادت کے بلاوے کیلئے پھونکتے ہیں) سُنے بغیر اُس کا ایمان مکمل نہیں ہوتا تھا۔

''پتہ نہیں مقدر نے ابھی مجھے کیا کیا دکھانا ہے؟''

''ارے یرڈینا آپ افسردہ نہ ہوں۔ آپ نے ابھی یروشلم نہیں دیکھا۔ یہ بہت خوبصورت ہے۔ شاندار پارکوں اور باغات کا سلسلہ اس کے اردگرد پھیلا ہوا ہے۔ مغربی یروشلم تو بہت جدید انداز میں بن رہا ہے۔ قامن، مصرارہ، ماملا، شیخ بدر، ابوطور جیسی آبادیوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جرمن، امریکن، روسی اور یونانی بہت خوبصورت کالونیاں ہیں۔ بڑے ہوٹل، شاپنگ آرکیڈ، سینما، تھیٹر، میوزیم، کلب، بازار، قہوہ کافی کیفے سب کچھ ہے۔ جیفہ گیٹ کے پاس ایک نیا پارک ہے جس میں میونسپلٹی کا بینڈ روزانہ شام کو موسیقی کی دُھنیں بکھیرتا ہے تو لُطف آتا ہے۔ بس امن اور سکون نہیں۔ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ ایک قوم غلبے کیلئے مررہی ہے تو دوسری اپنا گھر بچانے کیلئے۔

ضالیہ دل پر بوجھ لیے گھر آئی تھی۔ ساس کے پاس بیٹھی تو دوپہر کا سارا واقعہ انہیں سُنایا۔

ہاں وہ بھی مجھے ہم جیسے فلسطیوں کی طرح ٹوٹی پھوٹی اور عدم تحفظ کا شکار نظر آئی ہے۔ پھر وہ شکست خوردہ سی ہنسی ہنسیں۔

''کس کس کا ماتم کریں۔ اپنے اُس ہاشمی النسل پاسبان حرم کی کرتوتوں کا کہ جس نے نے ہمیں چاندی کے سکوں کے عوض بیچ دیا اور بے غیرت نے یہ بھی کہا کہ اسرائیلی یہ سمجھیں کہ میں نے یہ سودا انہیں بہت رعائت میں دیا ہے۔ میرے اللہ وہ ڈوب کر نہ

مر گیا۔ کو سلطان عبدالحمید ثانی نے میرے شوہر کے ساتھ بہت ذلّت آمیز سلوک کیا مگر اُس کے کردار پر یہ فخر اور اعزاز ہمیشہ جگمگائے گا کہ اُس نے ہمیں بیچا نہیں۔ یہ جاہل، خود غرض، دولت کے بھوکے عرب اُس دغاباز لارنس آف عریبیا کے ہتھے چڑھے۔ یہ جھوٹی عرب قوم پرستی بھی جوڑوں میں بیٹھ گئی۔ یہ منحوس مارا چرچل اسے تو دیکھو کیسے کہا اُس نے۔ یہودی نسل کے اعتبار سے برتر ہیں۔ بے غیرت ہم مسلمانوں کو گھٹیا بنادیا۔ کھر لی پر کھے کھانے والے یعنی دو ہزار سال سے ہم اس سرزمین پر موجود ہیں تو ہماری حیثیت یہ ہے۔ ہم جاہل، اُجڈ اور غیر مہذب ہیں اور رہم سے برتر ایک دوسری نسل وہاں آ گئی ہے۔ انہیں تو یہ بھی شرم نہیں کہ اُس ڈیوڈ بن گوریاں کے پالے ہوئے جتھے ہمارے ساتھ ساتھ ان کے اپنے لوگوں کو بھی گولیوں سے بھون رہے ہیں۔

تبھی لیلیٰ قاسم کو نہلا کر اُسے نرم کمبل میں لپیٹے رنگین دو ڑیوں سے اُس کا نصف دھڑ باندھے لے کر آئی تو سارہ نے خفگی سے لیلیٰ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیلیٰ یہ دیہاتی ان پڑھ عورتوں کی طرح تم نے اِسے کپڑے میں لپیٹ کر نہیں باندھنا۔ موسیٰ نے دیکھ لیا تو تمہاری شامت آجائے گی۔''

''جدّہ سب کہتے ہیں۔ بچہ نظر بد اور بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔''

''نری جہالت ہے۔'' انہوں نے قاسم کو کھولتے ہوئے کہا۔

رات کے کھانے پر ڈاکٹر موسیٰ کا انتظار تھا اور وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ دفعتاً یوسف ضیا اندر آئے اور انہوں نے کہا۔

کنگ ڈیوڈ ہوٹل کے اُس حصے میں آگ لگا دی گئی ہے جو برٹش آرمی ہیڈ کوارٹرز کے زیر استعمال تھا۔ بہت جانی نقصان کی اطلاع ہے۔ موسیٰ اس وقت آگستا وکٹوریہ ہسپتال کی ایمرجنسی میں ہے۔ مجھے نہیں اُمید کہ وہ رات کو بھی آسکے گا۔

سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑتی تھیں ۔دیر بعد سارہ نے پوچھا تھا۔

کس کی کارستانی ہے یہ۔شیخ قاسم کے گوریلے یا ارگن (Irgun) سٹرن جتھے۔

یہی بد بخت ارگن جتھے ہیں ۔برطانیہ نے جوانکار کردیا تھا۔اب ان کے سپاہیوں کی لاشیں بھیج کر انہیں پیغام نہیں دینا گیا۔

سارہ نے اپنی نم آلود آنکھوں کو ہاتھ کی پوروں سے چُھوا تھا۔

اور شاعر کہیں پاس سے ہونٹوں پر آگیا تھا۔

راتوں نے اپنے پردے ڈال دیئے ہیں

میرے گرد گہرے صدمے کے بیچ

اُس نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا ہے سمندر کی طرح

لہر کی طرح غم و اندوہ کی آزمائش کیلئے

باب نمبر: ۴

سکول سے آیا ہوا چھٹیوں کا ایک ماہ کا پروگرام اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ لازمی فوجی تربیت کی ہر تفصیل سے بھرا ہوا لیٹر Letter جو والدین کی جانکاری کیلئے چھٹیوں سے پہلے بھیجا گیا تھا۔

پندرہ دن یروشلم کے سخت گرم اور ریتلے علاقے میں میلوں کی دوڑ دھوپ پندرہ دن حیفہ اور وہاں سے بحیرہ روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ کفر سمر Kfar Samer، بایلک Bialik، کفر گلم Kfar Galim سے آگے تک۔ پیدل مارچ، ہائیکنگ، رائیڈنگ، سکیٹنگ، کیمپنگ۔ اتنے چھوٹے بچے۔ موسم کی اتنی شدت۔ یہ تو بچوں کو سیدھی سن سٹروک Sun stroke کے منہ میں بھیجنے والی بات ہوگی۔

اُسے غصہ آیا تھا۔ پل بھر کیلئے اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ پھر وہ رُک گئی اور اپنے آپ سے بولی۔

''بچوں کیلئے یہ آؤٹ ڈور سرگرمیاں بہت ضروری ہیں مگر اس کے پیچھے جو عزائم ہیں مجھے وہ پسند نہیں۔ مضبوط جسم کا حصول غلبہ حاصل کرنے اور دشمن پر حاوی ہونے کے خیال سے نہیں ہونا چاہیے۔

ڈیوڈ جس وقت گھر آیا وہ بھری بیٹھی تھی۔ نوٹس اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے غصّے سے بولی تھی۔

''میں نے اپنے بچوں کو کہیں نہیں بھیجنا۔'' یرڈینا کے لہجے میں غصّے کے ساتھ ساتھ اندر کے دُکھ اور اضطراب کا واضح چھلکاؤ تھا۔

''کیوں۔اچھا ہے بچے سخت جان ہو جاتے ہیں۔''

''ہاں تا کہ کل انہیں توپوں کے آگے کھڑے کرنے میں کوئی دشواری نہ آئے۔ڈیوڈ میں نے تمہیں کتنا کہا تھا مجھے اسرائیل نہیں جانا۔مجھے ایک ایسے معاشرے میں نہیں رہنا جہاں تہذیبی ٹکراؤ اور برتری کا زعم آپ کی ساری اچھی قدروں کو ملیا میٹ کرنے پر تُلا ہوا ہو۔''

''چلو اب کافی ملے گی یا تمہارا لکچر ہی اِس طلب کا پیٹ بھر دے گا۔''

وہ بُڑ بُڑاتی ہوئی کچن میں گئی۔چائے بنائی۔کیک نفKnafeh کے دو ٹکڑے کاٹ کر پلیٹ میں سجائے اور بڑے کمرے میں آئی۔

تبھی بڑے دروازے پر منصور نے پہلے سلام پھر شلوم کہتے ہوئے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

''ارے آؤ آؤ بیٹا۔رُک تو یوں گئے ہو جیسے میں تمہارے سکول کی پرنسپل ہوں اور تم میرے آفس کے سامنے کھڑے ہو۔''

منصور ہنستے ہوئے بولا۔

''آنٹی پرنسپل تو آپ لگتی ہیں۔''

دونوں میاں بیوی کا ملا جُلا قہقہہ کمرے میں گونجا۔

''آنٹی ماما نے پوچھا ہے کہ آپ بازار اور آنٹی ایما کے ہاں چلنے کیلئے تیار ہیں۔''

''بالکل تیار ہوں۔اتنے دنوں سے تو تمہاری ماں کی جان کھا رہی تھی۔جابرہ بھی دنوں سے ایما کے ہاں چلنے کا کہہ رہی تھی۔ہاں منصور تم ذرا ایائل اور ایڈمنڈ سے کہو۔وہ شاید ہوم ورک کر رہے ہیں۔''

دونوں بچوں نے آوازیں سُن لی تھیں۔وہیں سے شور مچا دیا۔

''اب آپ نے ہمیں چھوڑ کر نہیں جانا مما۔ہم تیار بھی ہیں اور ہم نے اپنا ہوم ورک بھی ختم کرلیا ہے۔ہم جائیں گے۔''

ریڈینا نے کمرے سے ہی آواز لگائی۔

''یائل ذرا مسز جابرہ سے بھی پوچھ آؤ کہ تین تو بج گئے ہیں۔اب نکلنا چاہیئے۔ ہمیں دو تین جگہوں پر جانا ہے۔''

یائل اپنا چینٹ اور فرل لگا فراک لہراتی کمرے سے نکل گئی۔

مسز جابرہ نکولا اس گلی کے آخری کونے والے گھر میں رہتی تھیں۔ فلسطینی عیسائی تھیں اور یہ گھر اُن کا اپنا تھا۔

یائل جونہی باہر بھاگی ڈیوڈ نے منصور سے کہا۔

''بیٹے دیکھو گلی میں کوئی کتا تو نہیں۔یائل بہت ڈرتی ہے ان سے۔''

تھوڑی دیر بعد جب دونوں واپس آئے یائل اپنے باپ سے بولی۔

''ڈیڈی منصور بہت بہادر ہے۔وہاں آنٹی کے گھر کے سامنے کتا تھا اور منصور بالکل نہیں ڈرا۔مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے گیا۔''

باپ ہنستے ہوئے بولا۔''یہ فلسطینی ہے بیٹا۔''

ڈیوڈ نے بیوی سے کہا۔''دیکھو اگر ڈاکٹر گھر پر ہیں تو ہم بھی چلتے ہیں۔''

ریڈینا نے پل نہیں لگایا فوراً شوہر کی بات کاٹ دی۔''آج ہم عورتوں کو جانے دو۔ہم نے بازاروں میں پھرنا ہے۔بچوں نے ریڈنگ بکس Reading Books خریدنی ہیں۔چھٹیاں ہونے والی ہیں۔پھر جابرہ کی دوست کے گھر بھی جانا ہے۔تم لوگوں کو کہاں گھسیٹتے پھریں گے؟اگر ڈاکٹر گھر پر ہیں تو نرد(پچسی) کھیلنے کی مشق کرو۔تم نہایت پھسڈی ہو اس میں۔''

''ریڈیناتم لوگ بچوں کو بھی لے کر جارہی ہو۔آج کل حگانا Hagana اور اسٹرن جیسے اسرائیلی دہشت گرد جتھوں کی سرگرمیاں بہت بڑھی ہوئی ہیں ۔ فلسطینی لڑا کے بھی جان ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں۔جہاں موقع ملتا ہے تخریبی کاروائیوں سے باز نہیں آتے۔ریڈینا نے بیڈ پر بکھری سلائیاں تیزی سے سمیٹتے ہوئے ڈیوڈ پر ایک سی نظر ڈالی اور بولی۔

''ڈیوڈ وہ جو کہتے ہیں کہ انسان پر جب مشکلات پڑیں تو وہ انہیں جھیلنے کا عادی ہو جاتا ہے تو اب میرا حال بھی وہی ہے۔سچ تو یہ ہے ڈیوڈ ہم اوکھلی میں سر دے بیٹھے ہیں اب موسلوں سے کب تک ڈرتے رہیں گے؟''

تینوں عورتیں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ یروشلم کے پرانے گلی کوچوں سے ہوتی عرب مارکیٹ میں جا دھمکیں۔

مارگریٹ اور رضالیہ دونوں کیلئے پرانے شہر کے پتھروں سے بنے محل نما گھر، چھوٹے چھوٹے گھر، تنگ تنگ گلیاں اور ایک دوسرے کے لب و رخساروں کو چومتی عمارتیں اور بہت قدیم محرابیں مانوس تھیں۔وہ ان راستوں کی بھول بھلیوں سے بھی واقف تھیں۔پیاز رنگ پتھروں والی گلیوں جن کے اکثر پتھر گھس کر چکنے ہو گئے تھے اور اُن پر پھسلنے کا ڈر رہتا تھا مگر وہ اُن پر تیز رفتاری سے چلنا کیا دوڑیں بھی لگا سکتی تھیں کہ وہ اس دھرتی کی بیٹیاں تھیں۔ہاں البتہ ریڈینا کیلئے یہ سب مسحور کن ہونے کے ساتھ ساتھ سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھانے کا کہتے تھے۔وہ دائیں بائیں آگے پیچھے مڑتی بل کھاتی گلیوں جن میں اُونچے اُونچے میناروں والی مسجدیں تھیں جن کی پیشانیاں نقشین کام سے سجی تھیں۔وہ مسلم کواٹر سے گزر رہی تھیں۔اُن کے آگے یہودی کواٹر اور اطراف میں عیسائی اور آرمینیائی کواٹر تھے۔

کوئی دو ماہ پہلے جابرہ کے ساتھ ریڈینا نے کرسچین اور جیوش کواٹر دیکھے تھے۔گرجاؤں کے تاریک پراسرار کمروں میں جلتی شمعوں اور دیواری تصویری نقاشی نے اُسے حیران کیا تھا۔ایسا ہی حال شینی گاگوں کا تھا۔

شام کے وقت شوفر (مینڈھے کا سینگ جسے بعض عبادات کے دوران بجایا جاتا ہے) کی آواز پورے ماحول میں گونجتی تھی اور یہودی مرد عورتیں کہیں سیاہ ہیٹ اور سیاہ سوٹوں میں ملبوس اور کہیں صرف کیپاہ Kipah (چھوٹی سی ٹوپی جو سر کے درمیانی حصّے پر رہتی ہے)اور کہیں تفلن Tefflin (بازو میں پہننے والا تعویز) پہنے عبادت کیلئے بھاگے جاتے تھے۔

ریڈینا کیلئے ارمنی وسطی کا یہ ماحول جس کی فسوں خیزی اُس کا دامن دل کھینچنے کے ساتھ ساتھ اُسے خوفزدہ بھی کرتی تھی۔

سارا بازار ہی کہیں نشیب میں اُترتا کہیں بلندی پر چڑھتا تھا۔برتن،بھانڈوں،کپڑوں،ہلدی،مرچ مسالوں،بیکری،قہوہ خانوں،قالینوں اور آرائشی اشیاء سے سجی دوکانوں سے بھرا پڑا تھا۔کہیں زمین پر پھسکڑا مارے بیٹھی موٹی موٹی فلسطینی عورتیں کڑھائی سے بھرے پہناوے پہنے اپنے سامنے موسمی ترکاریاں،سلاد کے پتے،پالک،پودینے کی گٹھیوں کے ڈھیر سجائے فروخت میں مصروف تھیں۔سُرخ لمبی ترکی ٹوپیاں،ہیٹ اور کفایہ پہنے مرد گھومتے پھرتے تھے۔یہاں دُنیا جہان کی قوموں اور نسلوں کے لوگ تھے۔ان کی رنگ رنگیلی بولیوں اور آوازوں کی گونج فضاؤں میں بکھری ہوئی تھی۔بوڑھے نوجوان بچے،عورتیں،لڑکیاں اوران کے رنگارنگ پہناوں سبھوں نے ماحول کو رنگینی دے رکھی تھی۔

سفر اسکوائر میں جب مائیں گروسری Grocery کی چیزیں خریدتی تھیں اور

بچے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اُچھلتے کودتے چیزیں دیکھتے تھے یائل نے سہم کر منصور کا بازو پکڑ لیا کہ چوک میں ایک اُونٹ بوجھ کی زیادتی سے لم لیٹ ہُوا پڑا تھا۔ اس پر اتنے بورے لدے ہوئے تھے کہ اُسے اُتارنے میں سات آدمی ہلکان ہو رہے تھے۔

''یہ مر گیا ہے اُف دیکھو منصور یہ مر گیا ہے۔''

وہ منصور کی طرف دیکھتے گھگیاتے ہوئے کہے چلی جاتی تھی۔

''مائی لارڈ! پور کیمل My Lord! Poor Camel۔''

منصور کیلئے اُسے سمجھانا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ ایک بار نہیں بہت بار اُس نے کہا ''یائل کیوں پریشان ہو رہی ہو؟ ابھی جب بوجھ اُترے گا تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ عرب میں اونٹ بہت بوجھ اُٹھاتے ہیں اور وہ بالکل نہیں مرتے۔ ذرا فکر نہ کرو۔''

منصور کیلئے ایسے مناظر اُس کے شب و روز زندگی کا ایک حصّہ تھے جب کہ یائل کیلئے یہ سب کچھ بہت عجیب اور اجنبی تھا۔ وہ اُس وقت تک وہاں کھڑی منصور کا ہاتھ پکڑے لرزتی رہی جب تک کہ اونٹ کروٹ کے بل سیدھا ہوا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

''تھینک گاڈ'' کہتے ہوئے یائل کی آنکھیں جگمگا اُٹھی تھیں۔

کتابوں کی ایک دوکان پر بچوں نے جاسوسی کہانیوں اور کومک پر ہلّہ بولا تو پرڈیٹا کو احساس ہوا کہ دوکان پر کہانیوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ ٹارزن، ہرکولیس Hercules، آربیئین نائٹس Arabian nights، Tales from Tolstoy اور Stories from Tagore وہاں شیلفوں میں سجی تھیں۔ ضالیہ کا ارادہ تو فلسطین ایجوکیشن کمپنی کی دوکان پر جانے کا تھا کہ وہ اکثر کتابیں وہیں سے خریدتی تھی مگر یہاں بھی کمال کی ورائٹی تھی۔ کچھ بچوں نے پسند کیں اور کچھ اُن کی ماؤں نے۔ جارج فارمیسے George Formsy اور بلی بنٹر Billy Bunter ضالیہ

پیرس میں اپنے قیام کے دوران پڑھ بیٹھی تھی مگر یہاں دیکھ کر وہ انہیں خریدے بنا نہ رہ سکی۔کانن ڈائل اور ڈیوماس Dumas کی کہانیاں بھی بہت پُرکشش تھیں۔ہیملٹ اور میکبتھ کے ڈرامے بچوں کیلئے آسان صورت میں موجود تھے۔کرسٹوفر مارلو کی The Jew of Malta بھی وہاں پڑی تھی۔ایڈمنڈ نے لپک کر اُٹھائی۔

یرڈینا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایڈمنڈ نے صحیح کتاب کا انتخاب کیا ہے۔یہودی فطرت کی نمائندہ۔''

سارا سامان انہوں نے ساتھ لائے نوکر کے حوالے کرتے ہوئے اُسے گھر بھیج دیا کہ انہیں نئے یروشلم جانا تھا۔مارگریٹ نے بھی ابھی ان کے ساتھ شامل ہونا تھا۔مارگریٹ جابرہ کی دوست آرمینین کواٹر میں رہتی تھی۔طے یہ تھا کہ وہ انہیں دیوارگریہ کے پاس ملے گی۔ضالیہ جب ایک قہوہ کیفے پر رُکنے لگی جابرہ نے اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور کہا۔

''ارے ہم ایما کے گھر جا رہے ہیں۔ایک شاندار چائے وہاں ہمارا انتظار کر رہی ہے۔''

اور جب وہ اپنے اپنے بچوں کو بازوؤں سے پکڑے ایک دوسرے کے آگے پیچھے تیز رفتاری سے چلتے ہوئے سلیمان سٹریٹ سے شعیب ابو مدین کے وقف کی تنگ گلیوں اور ایک دوسرے پر چڑھے مکانات سے گزرتی ہوئی کھلی جگہ پر آئیں تو ساتھ ہی ضالیہ نے یرڈینا کو بتایا کہ شہر کا یہ حصّہ مراکشی کواٹرز کہلاتا ہے جہاں شمالی افریقہ کے زائرین اور طلبہ کے رہائشی مکانات اور ان کے ہوسٹل ہیں۔

''ضالیہ''یرڈینا ہنسی۔تمہاری اور جابرہ کی دوستی نے اِس قلعہ بند شہر کو میرے لیے بہت دلچسپ اور خوبصورت بنا دیا ہے۔وگرنہ میں نے تو چھوٹی اینٹ کی اس بلند و بالا فصیل

جس کے محرابی دروازوں اور دیواروں میں قید شہر کو وقت سے دیکھا تھا۔شاید میں تب شدید ڈپریشن Depression کا شکار تھی۔

ضالیہ کی سُسرال کے تین چار گھر نئی مضافاتی بستیوں میں بھی تھے۔اُس نے کہا۔''دراصل کچھ عرصہ ہم مغربی یروشلم کی شمالی جانب نئی آبادی شیخ جراح میں رہے تھے۔شہر میں جب خون خرابے بڑھنے لگے تب سوچا کہ چلو پرانے گھر چلتے ہیں۔وہ محفوظ تو ہیں۔

ضالیہ خاموش ہوئی تو جابرہ نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔یرڈینا قدیم یروشلم کی جس اینٹ کو بھی دیکھو گی اُس کی زمانوں پرانی تاریخ ہوگی۔یہ قلعہ بند شہر مذہبی اور نسلی اعتبار سے چار حصّوں میں منقسم ہے۔مسلم،یہودی،عیسائی اور آرمینائی۔چھوٹا سا حصّہ جہاں سے ہم ابھی گزر کر آئے ہیں مراکشی لوگوں کے پاس ہے اور ہاں معلوم ہے اِس دیوار کی تاریخ کتنی پُرانی اور دلچسپ ہے؟عثمانی سلطان سلیمان ذی شان Suleman The Magnificent نے اس کی تعمیر کا ٹھیکہ دو بھائیوں کو دیا تھا۔انہوں نے باب الخلیل یعنی جیفہ گیٹ Jaffa Gate سے مختلف سمتوں میں کام شروع کیا۔سات سال گزر گئے۔بیچاروں نے ایک دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی۔پھر اس کا گھیرا مکمل ہوا تو دونوں بھائیوں کی ملاقات سینٹ سٹیفن گیٹ جسے جریکو گیٹ بھی کہتے ہیں پر ہوئی۔

''اُف یرڈینا نے آنکھیں پھاڑیں۔''

جابرہ نے بات کو جاری رکھتے ہوئے تجسّس کو ہوا دی۔

''یہ سُننا بھی تمہارے لیئے حیران کن ہوگا کہ اُن بیچارے دونوں بھائیوں کے ساتھ سلطان نے کیا کیا؟دونوں کو قتل کروا دیا گیا کہ وہ اس جیسا کوئی اور شاہکار نہ بنائیں۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ جبل صیہون دیواروں کے اندر لینے میں ناکام ہوگئے

تھے۔جب ہم ایما کے گھر جانے کیلئے جیفہ گیٹ سے نکلیں گے تو میں تمہیں ان کی قبریں دکھاؤں گی۔"

جب ریڈینا تاسف کا اظہار کرتی تھی جابرہ نے کہا۔"ایسا کرنا تو سلطانوں اور شاہوں کی سرشت میں ہے۔یہ کوئی نئی بات ہے کیا؟"

ایک اُونچے سے پتھر پر بیٹھتے ہوئے ریڈینا نے لمبی سانس بھری۔

ازمنہ وسطیٰ کا افسانوی ماحول۔کیا رنگینی ہے اس میں؟ آنکھوں نے سمت بدلی تو کہیں مشرق کی انتہاؤں میں جبل زیتون پر نظر پڑی۔جابرہ نے بتایا وہاں زیتون اورانجیر کے باغات ہیں۔کھیت ہیں۔

"ہاں جابرہ!ریڈینا ایک کیف میں بولی۔میری آنکھوں میں جیسے تازگی اور لطافت کی لہریں موجیں مار رہی ہیں۔"

سامنے کیدرون کی پہاڑیاں تھیں اور جب وہ خاموش نظروں سے ماؤنٹ آف Zionst دیکھتی تھی اُس نے گہرے تاسف سے کہا تھا۔

"مجھے تو آج تک اِس صیہونی پروپیگنڈے کی سمجھ نہیں آئی۔کتنا جھوٹ تھا ان کی باتوں میں۔گینٹر گرگ لندن آفس کے انچارج نے تو سچی بات ہے ہمارے گھر کی دہلیز اُکھاڑنے والی بات کی تھی۔اتنے چکر کہ میں خود پریشان ہوگئی۔دسووں بار کہ فلسطین ایک بے آب و گیا صحرا ہے جو بھی وہاں جتنی چاہے زمین خریدلے۔باغ لگائے،فارم ہاؤس بنائے۔ڈیری کا بزنس کرے۔ہماری مراجعت اپنی زمین کی طرف نیز اس کے ساتھ ساتھ اس طرح کی مزید حاشیہ آرائیاں۔ارے عرب تو نرے جاہل اور وحشی قوم ہیں۔نہ کھانے کی تمیز،نہ رہنے کا سلیقہ،نہ کوئی کلچر،نہ تہذیب۔سچی بات ہے وہ A Land without a people for a people without a Land کا راگ الاپ رہے تھے۔

وہ چند لمحوں کیلئے رکی اور پھر تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

''اُف ہم اپنی مطلب برآریوں کیلئے کیسے کیسے نیچ کام کرتے ہیں؟ میں تو عرب موسیقی کی دلدادہ ہوگئی ہوں۔ بلا سے اتنی سمجھ نہ آئے پر اتنی رچاؤ اور دل کو چھونے والی جیسے اندر تک اُترتی جائے اور دیکھو لوگ بھی پڑھے لکھے اور باشعور ہیں۔ اب ضالیہ کو ہی دیکھو پر ضالیہ کو چھوڑو یہ تو نئے زمانے کی ہے۔ اس کی ساس کا وژن vision کتنا وسیع ہے؟ کتنی صاحب علم خاتون ہیں؟ کیا فراٹے کی فرنچ اور انگریزی بولتی ہیں؟ مجھ سے تو ان کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا۔ میں تو اپنی ماں کی طرح اس خاندان سے بہت متاثر ہوں۔ پیاری عادات کی مالک فیملی۔

جابرہ کا لہجہ بہت تلخ تھا جب وہ بولی۔

''ریڈینا شکر ہے تم نے احساس کیا۔ تم نے سچ بات کی۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ اس خطہ زمین پر قابض ہو جانا چاہتے ہیں اور اُن کا بس نہیں چلتا کہ ہمیں اُٹھا کر کس جہنم میں پھینک دیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہمیں دوسرے عرب ملکوں میں چلے جانا چاہیے کہ ہمارے تہذیبی اور لسانی رشتے ان لوگوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بتاؤ ریڈینا کوئی اپنی جنم بھومی چھوڑتا ہے۔ ہم تو مسلمان بھی نہیں۔ عیسائی ہیں۔''

''اس اتنے وقت میں مَیں نے تو جو کچھ دیکھا ہے وہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ سچی بات ہے۔ میں تو ظلم کو ظلم کہوں گی اور قطعی اِس کا خیال نہیں کروں گی کہ میں یہودی ہوں۔''

ضالیہ نے لمبی سانس بھرتے ہوئے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اب اگر یورپ میں یہودیوں پر بڑا ظلم ہوا تو وہ ظلم عربوں نے تو نہیں کیا۔ یورپ کو انہیں یورپ میں سیٹ کرنا چاہیے تھا جہاں وہ صدیوں سے رہتے چلے آرہے

ہیں۔جرمنی میں کسی بھی جگہ یہ ریاست بنائی جا سکتی تھی۔چلیے ان کی دلجوئی ہو جاتی۔ایک سٹیٹ بن جاتی۔

ویسے سچی بات ہے میں چونکہ جرمنی میں پیدا ہوئی وہیں بڑھی پلی۔ظاہر ہے آپ کی محبت اور رشتے بھی اسی سرزمین سے استوار ہو جاتے ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ کمبخت جرمن بھی بڑے ذلیل ہیں۔انہیں بھی اپنے آریائی ہونے کا بڑا زعم ہے۔یہودیوں سے انہیں بھی بڑی نفرت ہے۔قوم پرستی اُن کی بھی ہڈیوں گوڈوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔

وہ خاموش ہو گئی تھی۔کتنی دیر افسردگی سے خالی خالی نظریں اپنے دائیں بائیں گھماتی پھراتی رہی۔اپنے،ضالیہ اور جابرہ کے بچوں کو کھیلتے دیکھتے رہی پھر بولی۔

''دیکھو یہ تین مختلف مذاہب کے بچے اور ہم تین عورتیں۔کسی خطہ زمین کو آپ ایک مذہب کے نام پر مخصوص کر دیں تو یہ کتنی احمقانہ بات ہے؟ مختلف نسلوں،مختلف مذاہب اور مختلف مسالک کے لوگوں کو جب اکٹھے رہنے کا موقع ملتا ہے تو اُن میں برداشت،رواداری اور انسانیت فروغ پاتی ہے۔اب مجھے دیکھو کہ میں یہودیوں کی جرمن کالونی میں نہیں رہ سکی۔یہاں میں زیادہ سکون محسوس کرتی ہوں۔چند لمحوں کیلئے وہ پھر خاموش ہو گئی تھی جیسے کچھ سوچتی ہو دیر بعد سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے ذرا مزاحیہ اور سنسنی خیز سے انداز میں بولی تھی۔

بڑی دلچسپ سی بات سنو۔میں جس جگہ کام کرتی ہوں وہ مجھ سے میری رہائش کا پوچھتے ہیں اور یہ جاننے پر کہ میں اولڈ یروشلم میں مسلمانوں کے محلے میں رہتی ہوں تو وہ حیرت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ارے تمہیں ڈر نہیں لگتا''۔میں مزے سے کہتی ہوں۔''بھئی وہ تو میری ماں کے پرانے ملنے والے بڑے خلوص اور محبت والے لوگ ہیں۔مجھے تو بیٹی کی طرح مانتے

ہیں۔گھر کا کرایہ بھی نہیں لیتے۔جانے ہم اتنے مہذب ہو کر وحشی کیوں بن جاتے ہیں؟"

جابرہ نے بڑی لمبی اور افسردہ سی آہ بھری تھی۔

تلوں سے سجے گرم گرم سمون جو یقیناً تنور سے نکلنے کے ساتھ ہی یہاں بکنے کیلئے آگئے تھے اور بچے بھی جو بھاگتے دوڑتے دُور چلے گئے تھے واپس آ کر ضالیہ کے گھر دائرے کی صورت کھڑے ہو گئے۔ضالیہ نے خریدے۔بچوں کو دیئے اور ایک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سب کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولی۔

"اُف کتنے گرم اور خستہ ہیں۔"

یرڈینا بہت خاموشی سے دیوارِ گریہ کو دیکھتی تھی۔پھر جیسے دُکھ اور کرب کی گہری ہوک سی اُس کے اندر سے اٹھی،باہر نکلی اور سارے میں پھیل گئی۔اُسے تو یروشلم ہمیشہ ایک خوفناک اساطیری کہانی کی مانند لگا۔خون کی ندی میں ڈوبا،انسانی جانوں کی ارزانی میں لتھڑا ہوا۔جب کبھی کسی محفل میں اِن الفاظ کا وِرد ہوا "ملیں گے اگلے سال یروشلم میں"۔

وہ خوابناک سی آواز میں بولی تھی۔

جب میں چھوٹی تھی تب فوراً مما سے ذرا سرگوشی کے انداز میں پوچھتی۔"مما کون سے یروشلم میں؟"

مما ایک قصیدہ پڑھ دیتیں،ایک داستان سُنا دیتیں جس میں ایک پازیب کا ذکر ضرور رہتا جو یروشلم کی باسی سارہ نے وی آنا کے ایک گھر میں ان کے پاؤں میں پہنائی تھی۔

جب اور بڑی ہوئی کچھ جانی تو خود سے ضرور کہتی۔

"اس خونی یروشلم میں جہاں یہودی،عیسائی اور مسلمان لڑتے رہتے ہیں۔"

پھر کسی بھی تقریب میں مَیں نے کبھی نہیں کہا تھا۔

"تو پھر ملیں گے یروشلم میں اگلے سال۔"

ہاں یار اب وقت بھی ہے۔تھوڑی سی تاریخ سے جانکاری بھی ہو جائے تو اچھا ہے

تو 33 تینتیس صدیاں نکلنے والے اِس یروشلم پر کتنی قوموں کا اپنا ہونے کا دعویٰ ہے۔تو سب سے پہلے یہ کن کا تھا؟

اُس نے جابرہ اور ضالیہ کو دیکھا اور کہا۔

''تو میرا تھوڑا سا تعارف تو کرواؤ اس سے۔''

ضالیہ ہنس پڑی۔

''یرڈینا یہ کام جابرہ کرے گی کہ تعصب سے پاک اس کا تاریخی شعور اور مزاحیہ انداز اس کی داستان گوئی کو بہت دلچسپ بنا دیتا ہے۔''

دُبلی پتلی کھلتی رنگت والی جابرہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔

''آل سام کا جو کنعانی تھے۔پھر تمہارے،میرے اور ضالیہ کے مشترکہ جدامجد ابراہیم اُر کے شہر سے آئے اور یہاں ہیبرون Hebron میں رہے اور دفن ہوئے۔یعقوب جب یہاں رہے تو یہ اسرائیل بن گیا۔یوسف،موسیٰ،سموئیل،طالوت ایک لمبی تاریخ۔داؤد بادشاہ بنے۔جنگیں لڑیں اور قابض ہوئے اور یروشلم پہلی بار اسرائیلوں کے زیر آیا۔تو یہ داؤد تھا جس نے گروہوں میں بٹے لوگوں کو اسرائیلی قوم بنایا اور تابوت سکینہ کو محفوظ کیا اور اللہ کا گھر بنانا چاہا۔''

جابرہ کو تابوت سکینہ کی وضاحت کرنی پڑی کہ یرڈینا کی آنکھوں میں سوال تھا۔حضرت یوسفؑ کی ہڈیاں اور کپڑے تھے اُس میں۔پر داؤد کو یہاں خدا کا گھر بنانا نصیب نہ ہوا کہ شاید خدا کا حکم تھا کہ گھر تو تمہارا بیٹا سلیمان بنائے گا۔

''چلو اچھا۔تو میں اس کی مدد کر دیتا ہوں''انہوں نے خود سے کہا۔سونا،چاندی، لوہا،پیتل اور دیودار کی لکڑی اکٹھی کرنے پر جُت گئے۔بہت قیمتی پتھر بھی جمع کیے۔فنِ تعمیر کا

نادر شاہکار جسے مصری اور لبنانی ماہر تعمیرات نے کوہ موریہ پر قبتہ الصخرہ سے تھوڑی دُور مغرب میں بنایا اور اس کے اندر پاکیزہ ترین جگہ پر صندوق ''تابوت سکینہ'' رکھا۔

سلیمان بڑی عظمت اور شان و شوکت والا بادشاہ تھا۔ سونے کے میز پر اور سونے کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا اور ہزاروں خدام کے ساتھ رہتا تھا۔ ہدہد کے ذریعے ملکہ سبا کو پیغام بھیجا تھا۔ وہ لاؤ لشکر کے ساتھ اُس کے پاس یروشلم آئی۔ اُس کے قافلے میں خوشبوؤں سے لدے ہوئے اونٹ تھے۔ اِن خوشبوؤں نے یروشلم کو معطر کر دیا تھا۔

''واہ واہ! یہ ہوئی نا بات۔'' تینوں کھلکھلا کر ہنسیں۔ تب یہ ایک خالص عبرانی اور یہودی شہر تھا۔ پر جونہی اُس کی آنکھیں بند ہوئیں بنی اسرائیل کی یہ ریاست دو طاقتوں میں بٹ گئی۔ یہودا اور اسرائیل اور دونوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے اوپر سے فلسطینیوں اور عربوں نے مل کر یہودا پر حملہ کر دیا۔ ہیکل سلیمانی کو تو خوب لوٹا گیا۔

یرڈینا کھل کھل کر کے ہنسی تھی۔ ''اُف اتنا قیمتی سامان سامنے ہو تو لالچ کا غالب آنا فطری بات ہے۔''

جابرہ نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا تھا۔ ''سامان کے ساتھ شاہ کی بیویوں کو بھی لے گئے۔''

''لو بھئی وہی تو سب سے پہلے لے جانے والی چیزیں تھیں۔''

یرڈینا کی بات پر ضالیہ کا قہقہہ گونجا تھا۔

بڑا لمبا سلسلہ ہے بادشاہوں کا۔ فلاں کے بعد فلاں۔ لڑائیوں اور مار کٹائیوں کا۔ ہیکل کے لٹنے اور مرمت ہونے کا حتیٰ کہ بابل کے بخت نصر کہ جس نے ہیکل کو جی بھر کر لوٹا اور اس کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔ یروشلم کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہیں۔ یہاں صرف دھواں تھا اور راکھ کے ڈھیر تھے۔ یہودیوں کے صحیفے جلا دیئے گئے۔ تابوت سکینہ کو غائب

کردیا اور لاکھوں یہودیوں کو وہ جانوروں کے ریوڑوں کی طرح ہانک کر اپنے ساتھ لے گیا۔

تو یہودی قوم کی یہ بدترین تباہی تھی۔ تو ریت بھی غائب ہوگئی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ یہودی بابل میں تو ریت کو یاد کر کے روتے اور اس تباہی کی یاد میں سلیمان کے روزے رکھتے۔ دریائے فرات کے جس کنارے پر بخت نصر نے انہیں آباد کیا اس بستی کا نام انہوں نے تل ابیب رکھا۔

پرڈیتا پھر ہنستی تھی "تو موجودہ تل ابیب بھی اسی یاد میں ہے۔ جیفہ (یافہ) کی بندرگاہ کے ساتھ ہی یہودیت کے اس نئے شوکیس کو بنانے کیلئے تو وہ مرے جا رہے تھے میرے نکھٹو چچا نے بھی جی جان سے یہاں کام کیا تھا دراصل یہودی قوم کے ساتھ سارا سیاپا کمبخت ماری یادوں کا ہے۔"

یہی وہ وقت تھا جب دانیال اور عزیز بی نے یہود قوم کی دل داری اور رہنمائی کی اور حضرت داؤدؑ کی نسل سے بابل بن سالتی ایل نے صیہونیت کی پہلی تحریک کا آغاز کیا۔

صیہونی تحریک کا مقصد دراصل یروشلم کو دوبارہ آباد کرنا اور ہیکل سلیمانی کی ازسرنو تعمیر تھی۔

تو پھر یوں ہوا کہ ایران کے کسریٰ خسرو جسے بائیبل خورس بھی کہتے ہیں نے بابل فتح کیا اور یہودیوں کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دی۔ ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر ہوا۔ نئی تو ریت بنی۔ اب یہ اُوپر والا جانے کہ کتنی صحیح تھی اور کتنی غلط۔ فصیل کی تعمیر بھی ہوتی رہی حتیٰ کہ سکندر آیا اور ایران نے شکست کھائی۔ تاہم ہیکل اور شہر بچا رہا۔ سکندر تو یہیں مرا اور اس کی لاش سونے کے تابوت میں بند ہو کر سکندریہ پہنچی۔ اب یروشلم مصر کے یونانی حکمرانوں کے حصے میں آیا۔ یونانی تہذیب نے یہودیوں کو متاثر کیا۔

پھر لوٹ مار اور تباہی کے بازار جرنیلوں نے گرم کیے۔جنرل سکوپس، پومپائی، جولیس، سیزر سبھوں نے اِسے برباد بھی کیا اور قبضہ بھی کیا۔

''بھئی جرنیل پیچھے کیوں رہتے؟ اُن کا کام تو ہمیشہ فرنٹ لائن کا ہوتا ہے۔''

حضرت عیسیٰؑ چار سال کی عمر میں بیت المقدس آئے تا کہ ہیکل میں خدا کے حضور نذرانہ پیش کریں۔

ایک روایت اور بھی ہے۔حضرت عیسیٰؑ بارہ سال کی عمر میں بیت المقدس آئے اور لوگوں کے سامنے اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہونے کا دعوے پیش کیا اور انجام میں یہیں Golgatha صلیب پر چڑھ کر ہلاک ہوئے۔

ایک لمبی تاریخ قیصروں، رومیوں اور اسپین کے شاہوں کے ساتھ لڑائیوں کی ہے۔پھر ہیکل کے جلنے کا قصہ کہ جب ہیکل جلتا تھا سپاہی کشت و خون میں مصروف تھے۔لاشوں کے ڈھیر تھے، خون پانی کی طرح بہتا تھا اور سارے میں چیخیں اور نالے تھے۔فاتحین نے دراز قد خوبصورت عورتیں چُنیں۔ڈیڑھ لاکھ یہودیوں کو تہ تیغ کیا یہ کہتے ہوئے کہ بڑا گھمنڈ اور تکبر ہے انہیں اپنی اعلیٰ نسلی پر۔دوسری قوموں کو تو بڑا گھٹیا سمجھتے ہیں۔ایک بندہ نہیں چھوڑنا اور سچ تو یہ ہے کہ واقعی کوئی بچا ہی نہیں تھا کہ یہ بتاتا کہ ہیکل مغربی پہاڑی پر تھا یا مشرقی پر۔

اب راکھ کے ڈھیر سے پھر کوئی چنگاری پھوٹی۔

قیصر قسطنطین خسرو ثانی شاہ ایران روم کے شاہ ہرقل کے درمیان معرکے میں یہودی پھر فلسطین سے باہر۔

اب اِس کھیل اور ڈرامے میں ایک تیسری قوم شامل ہوئی۔

ضالیہ زور سے ہنس پڑی۔

''کیا بات ہے جابرہ تیری داستان کوئی کی۔

یرڈینا خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ قدرے حیرت بھی چہرے پر بکھرائے ضائیہ کو دیکھتی تھی۔

''بھئی یہ قوم میری یعنی مسلمانوں کی ہے۔نئی صف آرائیاں ہوئیں۔مسلمان غالب اور یروشلم ان کے قبضے میں۔تاہم یہ اعزاز تو مسلمانوں کے خلیفہ عمر کو جاتا ہے کہ خون ریزی نہیں ہوئی۔ایک پر امن اور اچھا معاہدہ وجود میں آیا۔اب طاقت اور غلبے کا کھیل ایک نئی اور پرانی قوم میں شروع ہوا۔عیسائی اور مسلمان آمنے سامنے صف آرا ہوئے اور یہودی مُلکوں مُلکوں بتر بتر۔صدیوں بعد رومی اُٹھے۔مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔مسجدیں جلا دی گئیں۔

پھر فاطمی آئے۔سلجوقی آئے۔عیسائی متحد ہوئے اور طبل جنگ اس زور سے بجا کہ فاتح کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں تک مسلمانوں کے خون کے بہتے پانیوں میں چلے۔یرڈینا نے جُھر جُھری لی۔

''مائی گاڈ۔'' وہ چیخی۔

عباسی، سلجوقی، فاطمی سب اپنی اپنی چھوٹی موٹی کچھاروں میں گم ہو گئے۔

پھر ایک جیالا سورج کی طرح طلوع ہوا۔صلاح الدین ایوبی سو سال بعد اُس نے یروشلم پر قبضہ کیا۔عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کو صلیبی جنگوں کا نام دیا گیا۔مسلمان فاتح اور عیسائی مفتوح۔

عثمانی ترک پانچ صدیوں تک اِس علاقے پر غالب رہے اور بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اختتام پر دسمبر 1917ء میں ہماری ماؤں نے جو کچھ دیکھا اور ہم نے جو سُنا وہ کچھ یوں ہے۔

دسمبر 1917ء کے دن تھے۔ موسم میں دُکھ گھلا ہوا تھا۔ ہواؤں کے چیخیں مارتے جھکڑوں میں ہمارے والدین کی خوف سے لبریز دھڑکنوں کی آہیں تھیں۔ برستی بارش کے قطروں کی لڑیوں میں ان کے اندیشوں کے آنسو تھے۔ گورنر جمال پاشا نے ترکوں کو شہر خالی کرنے کا حکم دیا۔ مئیر یروشلم سلیم الحسینی نے سفید جھنڈا ہاتھوں میں پکڑا اور یافہ (جیفہ) گیٹ سے باہر آکر برطانوی سکاؤٹوں کو چابیاں دیں اور جنرل ایڈمنڈ ایلن بی اپنی گاڑی سے اُترا تو شہر کی گھنٹیوں نے اُسے خوش آمدید کہی۔ شہر پناہ کی سیڑھیوں پر رُک کر اُس نے شہریوں کو یقین دلایا کہ وہ مقدس مقامات کو تحفظ دے گا اور دوسری طرف برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج پارلیمنٹ میں چیخ رہا تھا۔ آج ہم نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لے لیا ہے اور دمشق میں وہ ہوچھا سا فرانسیسی جرنیل گورد صلاح الدین ایوبی کے مزار پر جوتا پھینکتے ہوئے کہتا تھا۔

صلاح الدین ہم پھر آگئے ہیں۔ ہم نے ہلالی پرچم سرنگوں کر دیا ہے۔

اب پھر یروشلم کیلئے جنگ جاری ہے۔ آگ خون کا ایک طوفان ہے جس میں گھرے ہم سب سہمے ڈگمگاتے پھرتے ہیں۔

جب مارگریٹ آئی تو یرڈینا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم نے بڑے وقت پر اپنی انٹری دی ہے۔ تینتیس صدیوں پر پھیلی ہوئی داستان جابرہ نے دس منٹ میں سُنا ڈالی ہے۔ چلو اب چلیں۔''

''ہم بھی بڑی بدذات عورتیں ہیں۔ اپنے مذاہب کے تدریجی ارتقاء اور تاریخ پر کیسے ٹھٹھے لگاتی اور اُس کا مذاق اُڑاتی ہیں۔''

جب وہ کھڑی ہوئیں جابرہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''لو اور کیا کریں۔ یہ تھوڑی بات ہے کہ جی کو جلانے، ڈرانے، دھمکانے اور

سہانے والی باتیں خوشدلی سے سُن لیں۔ وگرنہ تو یہ بھی کہہ سکتے تھے بھئی ہٹاؤ دفع کرو گولی مارو۔'' حال میں جو ٹینشن ہے وہی کافی ہے۔ ماضی کے قصّوں سے بھی یہی کچھ نکلے تو فضول میں ہلکان ہونے کا فائدہ۔

پھر وہ سب ایک سیدھ میں ڈیوڈ سٹریٹ میں چلتیں جس کے ایک طرف آرمینین کواٹر اور دوسرے ہاتھ کرسچین کواٹر تھا۔ یرڈینا آرمینائی حصّے کی عمارتوں کا آرٹسٹک سٹائل Artistic Style اور خوبصورتی دیکھ کر حیران تھی۔ اُس نے رُک کر ضالیہ کو دیکھا اور کہا۔

''میں ایک بار پہلے یہاں آئی تھی۔ تشنہ ہی رہی کسی دن ادھر پھر چکر لگانا ہے۔''

جیفہ گیٹ Jaffa Gate اب نظر آنے لگا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے ضالیہ اور جابرہ یرڈینا کو ایک چھوٹے سے احاطے میں لے گئیں جہاں درختوں کے نیچے دو قبریں تھیں۔

فصیل بنانے والے دو معمار بھائیوں کی قبریں۔

یرڈینا باہر نکلنے سے پہلے پیازی رنگے بڑے بڑے پتھروں کی بلند و بالا دیواروں، محرابی چوبی دروازوں اور فرش کے پتھروں کی ٹکڑیوں کو جو دائروں میں رقص کرتی مڑتی تھیں کو دیکھنے کیلئے ڈیوڑھی میں رُک گئی تھی۔

جیفہ گیٹ کو باب ہیبرون بھی کہتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ سے منسوب ہے۔ خدا کا محبوب۔ باہر سڑک کی طرف ضالیہ نے اشارہ کیا تھا۔ یرڈینا نے اُسے بغور دیکھا۔ یہ جرمنی کے قیصر ولیم کیلئے خصوصی طور پر سلطان عبدالحمید نے بنوائی تھی کہ قیصر کی بگھی سیدھی یہاں آکر رُکے۔

یمین موشے یروشلم کا مغربی حصّہ تھا یہاں خاصی آبادی تھی۔ آبادی کی اکثریت عیسائیوں اور یہودیوں پر مشتمل تھی۔ ایبا کا گھر بہت خوبصورت دو منزلہ حویلی کی صورت میں

تھا۔صحن میں تالاب تھا جو خشک تھا۔گھر کے سامنے گراؤنڈ تھا۔چاروں عورتیں ایما سے پیانو pionoسُننے لگیں اور بچے باہر گراؤنڈ میں کھیلنے لگے۔ایما کا بچہ کوئی سال بھر کا تھا۔

چاروں نے ایما سے بتھیووین کی نویں سمفنی symphony سُنی۔سُر اور ساز کی دُنیا سے اُس وقت باہر نکلیں جب نوکر نے میز پر چائے اور لوازمات سجا دیئے۔

چائے پیتے ہوئے ایما نے ریڈینا سے کہا۔

''ایک تو تمہاری صورت لارنس الیور سے بہت ملتی ہے۔اُوپر سے تم نے لباس اور بالوں کا سٹائل بھی من وعین اُس جیسا بنا رکھا ہے؟''

''ارے سچ مچ۔''

ریڈینا نے بالوں میں سجے خوبصورت بینڈ کو چھوتے اور خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بھئی تم نے تو مجھے اتنا بڑا کمپلیمنٹ دے دیا''

اب بقیہ تینوں نے اُس کا ناقدانہ جائزہ لیا اور کہا۔

''ارے واقعی ایما کی نظر بہت گہری ہے۔ہم نے تو غور ہی نہیں کیا''۔ضالیہ ہنس رہی تھی۔

''ہاں دیکھو''ریڈینا نے انہیں مخاطب کیا۔ The Lady Vanishes یہاں ریجنٹ سینما میں لگی ہے۔چلو کسی دن دیکھ کر آتے ہیں۔

''گولی مارو مارگریٹ لاک وڈ کو۔ذرا اچھی نہیں لگتی۔''جابرہ نے ناک سکوڑی۔

ارے ہاں ریڈینا نے انہیں گذشتہ ہفتے کا قصہ سُنایا۔

پچھلے منگل جب ڈیوڈ گھر آیا اُس نے خوشی سے لبریز آواز میں مجھے بتایا کہ ولیم فرٹوانگلر یروشلم آیا ہے اور اتوار کی شام کو ریکس سینما میں میوزیکل پروگرام کر رہا ہے۔ٹکٹ دھڑا دھڑ بک رہے ہیں۔میں نے بالکونی کیلئے دو سیٹیں بُک کروا دی ہیں۔''

سچی میں بھی یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔ہم نے بچوں کو ضائیہ کے گھر بھیجا اور چپکے سے نکل گئے۔چند دن پہلے بھی ہم نے ریجنٹ سینما میں بچوں کے ساتھ فلم دیکھی۔یہ وہ پہلی تفریح تھی جو میں نے اِس ہجرت کے دنوں میں کی اور خوش ہوئی۔میں نے بے اختیار ڈیوڈ سے کہا۔

''چلو شکر ہے۔میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا اچھا سینما یہاں ہوگا۔''

''یہاں ایک اور بھی سینما بہت اچھا ہے'ریکس' مگر اس میں عیسائی اور گورے زیادہ جاتے ہیں۔یہ یہودیوں کا سینما ہے۔ڈیوڈ نے بتایا۔''

''ڈیوڈ گولی مارو عیسائیوں اور یہودیوں کو۔دیکھو تھوڑی سی دل پشوری ہو جائے تو کافی ہے۔باقی گھٹن اور تعصب تو یہاں بہت ہے پر اب کیا کریں؟''

فرٹوانگلر جرمن ہے۔میں دیوانی ہوں اُس کی۔کیا فنکار آرٹسٹ ہے مگر پوڈیم پر کھڑے جس شخص کو میں دیکھتی تھی وہ نہایت فضول سا نظر آیا۔گنجا اور کمزور سا۔پر کیا میوزک تھا۔سُروں میں جیسے سارا جہان بہتا تھا۔اور ہاں ایک اور حیرت انگیز بات سُنو وہ Baton سے مدد بھی نہیں لے رہا تھا۔میں نے ڈیوڈ سے یہ کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ڈارلنگ تم اُس کے ہاتھوں اور بازوؤں کو نہیں دیکھتی ہو وہ چھڑیوں سے کم ہیں کیا۔''واقعی میں بڑا ہنسی۔

میں اِس پروگرام سے اتنا محظوظ ہوئی کہ اگلے دن ضائیہ سے کہا۔

''چلو ہم دونوں چلتے ہیں۔''پر ضائیہ کا بچہ اتنا چھوٹا سا ہے کہ اس کی معذرت پر مجھے خود بھی احساس ہوا کہ اس کا جانا ابھی مناسب نہیں۔

''اللہ کاش کبھی فرنچ بیلے Saison Lyrique یہاں یا قاہرہ آئے۔میں نے پیرس میں اُسے دیکھا تھا۔اُف کیا کمال کی فنکارہ ہے جین بیلی۔ضائیہ کی

آنکھوں میں گئے دنوں کے دیکھے گئے اِس بیلے کی یادوں کی مسروری جھلک ابھری تھی۔

بہت دیر بعد اُن کی واپسی ہوئی۔چاروں بہت خوش تھیں۔

باب نمبر: ۵

بڑے شہروں میں تکلیف دہ حد تک پہنچا ہوا اضطراب اور تناؤ موجزن تھا۔ خوف و دہشت کے سائے لرزاں تھے۔ ہواؤں میں کچھ ہونے والا ہے جیسی سرگوشیاں رقصاں تھیں۔ ہاں البتہ قصباتی جگہوں اور گاؤں وغیرہ میں کو لوگ حالات سے آگاہ تو تھے۔ برطانیہ کی چالوں اور صیہونی دستوں کی بدمعاشیوں کے تذکرے تو سنتے تھے پر فلسطین عالمی سطح پر جس سازش کا شکار ہونے والا تھا اُس سے عام دیہی عرب کو آگاہی کے باوجود خطرے کی اُس سنگینی کا احساس نہ تھا جس سے بڑے شہر دوچار تھے۔

صیہونی اور عرب دہشت گردٹولوں کی سرگرمیاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ ایک طرف برطانیہ دوسری جنگِ عظیم سے نڈھال دوسری طرف صیہونی دہشت گردوں کا نشانہ بن رہا تھا جو پہلے برطانیہ اور پھر عربوں کی بے دخلی کے فارمولے پر تیزی سے عمل پیرا تھا۔ اقوام متحدہ نے یروشلم کی حیثیت بین الاقوامی زون کی کردی تھی۔ عربوں نے اِسے نامنظور کردیا۔

گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے یروشلم شہر کو کئی زونوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ برٹش آرمی اور پولیس نے جگہ جگہ چیک پوسٹیں بنا رکھی تھیں۔ لوگوں کو پاس جاری کیئے گئے تھے۔ یہ سب انتظامات اُس خون خرابے سے بچنے کیلئے تھے کہ جس کا نشانہ برٹش آرمی کے ساتھ ساتھ فلسطینی عرب بھی بن رہے تھے۔

شہر مذہبی اعتبار سے کئی خانوں میں بٹ گیا تھا۔ وہ خلوص، رواداری اور محبت جو مختلف مذہبی فرقوں میں دو تین دہائیاں پہلے تھی اب تقریباً ختم ہی تھی۔ تاہم یرڈینا کا خاندان ابھی بھی اُسی گلی میں رہ رہا تھا۔ گو یوسف ضیا نے دونوں میاں بیوی کو سمجھایا۔ بہت زور ڈالا

کہ اُنہیں یروشلم کی جرمن کالونی یا پرانے شہر کے جیوش کواٹر میں چلے جانا چاہیے مگر دونوں نے انکار کر دیا تھا۔

جاہدہ مغربی یروشلم کے کونین علاقے میں شفٹ کر گئی تھی۔عیسائیوں کے دونوں فرقے آپس میں دست و گریبان تھے۔مسلمان اور یہودی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔شہر کیسا دُکھی دُکھی اور اُداس سا نظر آتا تھا۔

ڈاکٹر موسیٰ کے پاس ڈاکٹر ہونے کے ناطے ملٹی زون Multizone پاس تھے۔منصور جب سکول داخل ہوا تو ساتھ ہی اُسے سائیکل کی پریکٹس کروا دی گئی۔ڈیوڈ کچھ عرصہ ایڈمنڈ کو چھوڑ کر آتا رہا۔گذشتہ سال سے دونوں لڑکے سائیکل پر جانا شروع ہو گئے تھے اور بہت خوش تھے۔سینٹ جارج سکول پرانے یروشلم کی بیرونی دیوار کے باہر تھا۔یائل کا کنڈرگارٹن دمشق گیٹ سے ذرا فاصلے پر نابلس روڈ پر تھا۔یائل کو ڈیوڈ چھوڑنے جاتا تھا۔

دونوں ماؤں کی دونوں لڑکوں کو تاکید تھی کہ وہ سکول سے سیدھے گھر آئیں مگر ایسا کم کم ہی ہوتا۔آدھ پون گھنٹہ تو وہ اِدھر اُدھر کی منہ ماری میں ضرور گنواتے۔ایڈمنڈ بالعموم سائیکل چلانے کی زیادہ خواہش رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ چُھٹی کے بعد وہ ایک کلاس فیلو کے ہاں سے دوسرے کے پاس جائیں یا یونہی سڑکوں پر تیز تیز رائیڈنگ Riding کا لطف اٹھاتے رہیں۔

چیک پوسٹوں پر کھڑے گورے سپاہی انہیں جانتے اور پہچانتے تھے اور حیران بھی ہوتے کہ ان کے گھرانے کیسے ہیں جو ایسے حالات میں بھی گھی شکر بنے ہوئے ہیں؟ کبھی کبھار وہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کر دیتے۔

ایسے ہی دنوں میں ایک دن انہوں نے سوچا بلکہ سوچ تو وہ بہت دنوں سے رہے تھے پر سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا وقت نہیں مل رہا تھا۔بالآخر ایک دن انہوں نے اُس پہاڑی

پر جانے کے پروگرام کو ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے۔

''بس بھئی بہت ہو گیا کل آندھی آجائے طوفان آئے ہر صورت اُوپر چلنا ہے فائنل کر دیا تھا۔اُوپر پہاڑی پر جہاں برٹش آرمی دوپہر کو بگل بجاتی تھی۔یہ بگل لڑکوں کو عجیب انداز میں مسحور کرتا تھا پر وہاں جانا مشکل تھا۔چڑھائی ذرا عمودی تھی۔حل انہوں نے نکالا کہ اپنے ساتھ دو اور کلاس فیلو امین اور عمود کو ملایا۔سکول سے چُھٹی کے بعد عقبی پہاڑی سے وہ اوپر چڑھے اور درختوں کے پیچھے سے چُھپ کر انہوں نے اس ریہرسل کرتے فوجیوں کو دیکھا اور سنا۔دفعتاً ایڈمنڈ نے کہا۔

''منصور میں تو بھول گیا تمہیں بتانا۔یائل کو سکول سے لینا ہے ڈیڈی آجکل حیفہ گئے ہوئے ہیں۔مما لینے جاتی تھیں اُسے۔مگر صبح جب میں سکول آرہا تھا انہوں نے کہا تھا کہ وہ آج اُسے لینے نہیں جا سکیں گی اور ہم دونوں واپسی پر اُسے لیتے آئیں۔''

''تم بھی سٹوپڈ stupid ہو ایڈمنڈ۔اب بتا رہے ہو۔وہ وہاں بیٹھی رو رہی ہوگی۔''

منصور نے بڑے ہونے کی ذمہ داری دکھائی مگر ساتھ ہی جیسے دل میں بھی کچھ ہونے لگا تھا۔

اب بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔سائیکل کے ساتھ اُوپر چڑھے تھے اُسے اُتارنا مسئلہ بن گیا۔ایک دو بار پھسلے بھی۔کچھ کہنیوں اور ہاتھوں پر رگڑیں بھی لگوائیں۔بہر حال سڑک پر اُترے اور دمشق گیٹ کو جانے والی سڑک پر بھاگے۔منصور اُس وقت کوئی بارہ برس کا تھا اور ایڈمنڈ نو سال کا ہوگا۔قد و قامت کے اعتبار سے منصور کھلے ہاتھ پاؤں کا ذمہ دار لڑکا تھا جبکہ ایڈمنڈ دُبلا پتلا طبعاً لاپرواہ سا۔

دفعتاً منصور کو محسوس ہوا جیسے سڑک پر گاڑیوں کی تیز رفتاری اور لوگوں کی بھاگ

ڈور خلاف معمول سراسیمگی والی تھی۔ چیک پوسٹ پر سپاہیوں نے دونوں کو ہالٹ کروایا اور درشتی سے پاس کا پوچھا اور ساتھ میں ڈانٹا بھی کہ شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے اور ان کے والدین کو ہوش نہیں۔ شتر بے مہاروں کی طرح چھوڑ رکھا ہے۔''

یہ دسمبر کی سہ پہر تھی۔ موسم بہت خنک تھا۔ اونی دستانوں کے باوجود منصور کو اپنے ہاتھ یخ سے محسوس ہوتے تھے۔ گاڑیاں شوں شوں کرتی پاس سے گزر رہی تھیں۔ سائیکلوں پر تیزی سے پیڈل مارتے چند عربی باتیں کر رہے تھے اور منصور نے جانا تھا کہ عربوں کے ایک ہجوم نے بن یہودا سٹریٹ پر یہودی کمرشل سینٹر کو لوٹ لیا تھا جس کے نتیجے میں فوراً یہودی ارگن دہشت گرد جتھوں نے شمال میں فلسطینیوں کی مضافاتی آبادی شیخ جراح اور مغرب میں قامن کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔

اور جب وہ اندھا دُھند سائیکل چلاتے کنڈر گارٹن کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ گیٹ کیپر Gatekeeper نے اُسے اور ایڈمنڈ کو روک لیا۔

''یائل کو لینا ہے۔''

منصور نے تیزی سے کہا۔ اُسے ڈر تھا کہ وہ رو رہی ہوگی اتنی دیر ہوگئی تھی۔

''شاباش ہے تمہارے والدین پر۔ گھر میں کوئی بڑا نہیں تھا ایسے قیامت کے سمے تم چوچے سے بچے آگئے ہو۔ تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟ شہر میں حشر ہوا پڑا ہے اور ان لوگوں کو کچھ خبر ہی نہیں۔''

ایڈمنڈ نے شکستہ سی آواز میں باپ کے یروشلم میں موجود نہ ہونے کا بتایا۔

''جاؤ وہ سُپر مدر کے پاس ہے۔''

بھاگتے ہوئے دونوں نے راہداری طے کی۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ ایڈمنڈ ماں کے ساتھ یہاں آچکا تھا اور سُپر مدر کے کمرے کو جانتا تھا۔ اس کی نشان دہی پر منصور نے

کمرے کے پردے کو ذرا سا ہٹا کر اندر جھانکا اور ساتھ ہی ''منصور منصور'' کہتے ہوئے پائل بھاگی اور اس کے سینے سے آ کر چمٹ گئی۔ مُنیر مدر شاید دوسرے کمرے میں تھیں۔ اس کی آوازیں سُن کر باہر آئی اور جاننے پر کہ وہ اسے لینے آئے ہیں اس نے ترشی سے کہا۔

''دیکس قدر غیر ذمہ دار ہیں مسز ڈیوڈ؟''

تاہم گیٹ کیپر کو اُن کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ انہیں باب دمشق سے اندر کر آئے۔

یرڈینا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ ڈیوٹی پر بھی نہیں گئی تھی۔ وہ سو رہی تھی جب ضائیہ نے آ کر اُسے جگایا اور بتایا کہ بچے سکول سے ابھی تک نہیں آئے اور شہر میں بلوہ ہو گیا ہے۔

یرڈینا ہڑبڑا کر اُٹھی۔ پتھرائی سی آنکھوں سے ضائیہ کو دیکھنے لگی۔

نوکر اور یوسف ضیا خود بچوں کی تلاش میں نکل گئے تھے۔

وہ چونکہ بچے تھے گو خطرے کو محسوس تو کرتے تھے پر شاید اس کی شدت سے آگاہ نہ تھے۔ بگٹٹ سائیکل چلاتے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ لوگ دائیں بائیں دیکھے بغیر دوڑیں لگا رہے تھے۔ سڑک پر قیامت کا سا منظر تھا۔ وہی جگہ جہاں چند لمحے پہلے زندگی ہنس رہی تھی اب جان بچانے میں گھائل ہو رہی تھی۔

ایک نوجوان مرد اُونچے اُونچے چلّاتا ہوا بھاگتا جا رہا تھا۔ یہ جنگ آزادی کے جیالے، مادرِ وطن فلسطین کے محافظ، اُن کی جان و مال کے راکھی دھرتی کو ان کوروں، ان صیہونیوں سے پاک کر رہے ہیں۔ آفرین ہو اُن پر۔ ابھی کچھ پتہ نہیں تھا کہ کتنے لوگ مارے گئے؟ کتنے گھر مسمار ہوئے؟

یہ کیسی جان کنی کی سی کیفیت تھی جس میں وہ دونوں عورتیں اس وقت گزر رہی

تھیں۔سب سے مخدوش حالت ضالیہ کی ساس کی تھی جسے وہ دونوں جانے کن جتنوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر کمرے تک لائی تھیں اور بار بار کہے جاتی تھیں۔

''اموخدا پر بھروسہ رکھیں۔''

ضالیہ کے اندر آس کی منی سی قندیل ضرور تھی کہ منصور کیلئے یہ گلی کوچے مانوس ہیں۔وہ اکیلے اکثر آتا جاتا تھا۔کچھ وہ یوں بھی بہت ذمہ دار اور دلیر لڑکا تھا۔ان کی گلی بہت لمبی نہ تھی۔تین چار گھروں کے بعد شکو کر بہت پتلی سی صورت میں پھر آگے بڑھتی تھی تبھی جیسے گلی میں آواز آئی۔

''خدا کا شکر ہے۔بچے تو سلامتی کے ساتھ آگئے ہیں۔''

بچوں کے ساتھ یوسف ضیا اور نوکر اندر آگئے تھے۔''

منصور کے ہاتھ پر کچھ خراشیں تھیں۔راستے میں بہت رش تھا۔ایک بازو سے اُس نے دونوں کو اپنے بازوؤں کے حصار میں رکیا۔دوسرے سے سائیکل کو سنبھالا۔درمیان میں لوگ تھے جو آندھی طوفان کی طرح بھاگتے پھر رہے تھے۔وہ اُنہیں لے کر فوراً گلی میں گھسا۔ایک بزدل پائل کی چیخیں اُسے ہراساں کیئے دیتی تھیں۔ایک بار سائیکل کی فرنٹ روڈ پر بٹھانے کی کوشش کی پر وہ صحت مند تھی۔دھڑام سے خود بھی گری اور اُسے بھی گرایا۔کسی بھاگتے آدمی کا پاؤں پڑا جس کی جوتی نے ہاتھ زخمی کر دیا۔اب اُسے لے کر کِس مشکل سے گھر تک پہنچا؟

یرڈینا منصور کے رخساروں اور پیشانی پر ان گنت بوسے ثبت کرتے ہوئے بھیگی آنکھوں سے تکرار کیئے جاتی تھی۔

''منصور ساری غلطی میری جو کہہ بیٹھی کہ پائل کو لیتے آنا۔''

ڈاکٹر موسیٰ تو اسپتال میں تھا۔

یوسف ضیا نے ہی بچے کے ہاتھ کی پٹی کروائی۔باہر فوج گشت کر رہی تھی اور شام تک کرفیو لگ گیا تھا۔

رات کو یرڈینا منصور کے گھر اُسکا زخمی ہاتھ چومتی تھی اور بہتی آنکھوں سے کہتی تھی۔

''منصور تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے میرے بچے میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں؟''

اور جب یوسف ضیا اُس سے پوچھتے تھے کہ یائل کے سکول سے تمہارے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں وہاں پہنچ گیا تھا تو تم نے اتنی دیر کہاں لگائی؟

''جدّی راستے میں رش بہت تھا۔دوسرے میں گلیاں بدلتا رہا''

پتہ نہیں وہ یہ بات کیوں چھپا گیا تھا کہ فلافل کی دوکان پر یائل پھنڈا ڈال بیٹھی تھی کہ اُسے بہت بھوک لگ رہی ہے۔اور اُس سے چلا نہیں جا رہا ہے۔

فلافل کی دوکان پر مضافاتی بستیوں کے لوگ پناہ کیلئے آ کر کھڑے ہوئے تھے۔باب دمشق اور رباب جیفہ کو اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔

شہر میں کرفیو کی وجہ سے بہت سے لوگ ملنے کیلئے نہ آ سکے۔کوئی ہفتے میں حالات نارمل ہوئے اور کرفیو کی پابندیاں بتدریج کم ہوئیں۔

اُس شام یوسف ضیا کے کمرے میں باپ بیٹا دونوں ہی متفکر سے بیٹھے دن بدن اِس بگڑتی صورتِ حال پر کھانا کھاتے ہوئے باتیں کرتے تھے۔امریکہ اور برطانیہ میں مقیم یوسف ضیا کے تینوں بڑے بیٹوں نے باپ اور بھائی کو فیملی سمیت باہر آ جانے پر زور دیا تھا۔

''میں فلسطین کو چھوڑ کر کیسے کہیں جا سکتا ہوں؟''انہوں نے یکسر انکار کر دیا تھا۔

ڈاکٹر موسیٰ کا کہنا تھا کہ جنرل اسمبلی نے یروشلم کو بین الاقوامی زون بنا دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اُسے مان لینے میں ہی بہتری تھی۔

دراصل یہ بہت گہری شازش ہےاوراس کے پیچھے برسوں کی منصوبہ بندی اور بڑی طاقتوں کے مقاصد حائل ہیں۔ فلسطینی رہنماؤں کی سیاسی بصیرت بہت کمزور اور محدودیت کے دائروں میں گھومتی ہے۔عرب قومیت کا جوحشر ہورہا ہےوہ بھی آپ کے سامنے ہے۔رہے حکمران تو وہ کس درجہ انتشار،افراتفری اورذاتی اغراض میں اُلجھے ہوئے ہیں۔عالمی سطح کے بڑے پن کا اُن میں شعور ہی نہیں مخلص قیادت بھی نظر نہیں آتی۔سیاسی پارٹیاں،ریفارم ہو،پان عرب استقلال یاڈیفنس پارٹی کی کارکردگی دیکھ لیں۔یوں وسائل بھی نہیں۔ایسے میں معجزوں کی توقع تو فضول ہے۔" یوسف ضیا راکھ کے جس ڈھیر سے چنگاریاں پھوٹنے کے متمنی اور منتظر تھے وہ سب اُمیدیں توختم ہوگئی تھیں۔

پھرباپ بیٹے میں اس کے سپیشلائزیشن specialization کے بارے میں بات ہوئی۔

"میں امریکہ جانے کوترجیح دوں گا۔ریسرچ میں وہ بہت آگے چلا گیا ہے۔"

لکھنو کے عالم دین مولانا سلیمان ندوی کے بارے میں باتیں ہوئیں جو یوسف ضیا کا گہرا دوست تھا۔ہندوستان کی تقسیم اورایک نئی ریاست پاکستان کے حوالے سے بھی کچھ دیر گفتگو رہی۔

بس ایسے ہی امید وبیم میں دن گزرتے گئے اور نئے سال کا آغاز ہوگیا۔

اِس بارموسم میں تھوڑی سی تیزی تھی۔فروری کے آخری ہفتے سے دوپہر کودھوپ میں تلخی سی آگئی تھی۔انہی دنوں میں دیر یاسین سے یوسف ضیا کی میری بہن کا خط آیا۔بیٹے کی شادی میں شرکت کا دعوت نامہ تھا۔پورے خاندان کوآنے کی درخواست تھی۔خط ہاتھ میں لیے وہ بہت دیر بیٹھے سوچتے رہے۔

وہ ابھی کل ہی کوئی چاردن بعد مکہ سے عرب ہائیر کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے

بعد گھر لوٹے تھے۔ یہ بات وہاں بھی زیرِ بحث آئی تھی کہ کوئی دو ماہ کے اندر اندر یہودیوں کے پیرا ملٹری گروپس کے دہشت گرد ٹولے ارگون (Irgun) اور اسٹرن (Estern)، دیر یاسین گاؤں کا صفایا کرنے والے ہیں۔ چونکہ یہ تل ابیب اور بیت المقدس کے درمیانی راستے میں اُونچائی پر واقع جگہ ہے۔ تکنیکی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں اُن کا پروگرام ایرپورٹ بنانا ہے تاکہ بیت المقدس تک فوری رسائی ہو۔

یہ محض افواہ ہے یا حقیقتاً خبر سچ ہے۔ اس پر باقی معاملات کے ساتھ غور و غوض بھی ہوا۔ مگر بات تو وہی وسائل کی تھی۔ مفتی اعظم فلسطین کی فوج آزادی کے پاس ہتھیاروں کے بے حد کمی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال اخوان مجاہدین کا تھا۔ منہ زور جذبے فقط شہیدوں کی تعداد بڑھا رہے تھے۔ اندرخانے کچھ کالی بھیڑیں بھی تھیں جو غداری کے پیرھن پہنے دشمنوں کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔

کل رات جب وہ عشاء کی نماز کیلئے مسجدِ اقصیٰ گئے تو نماز کے بعد یہ بات وہاں بھی کسی نے کہی۔

بہت سے لوگوں کی زبانوں پر انہی خدشات کا اظہار تھا جو انہوں نے مکّہ میں سُنے تھے۔

ایسی پریشان کن خبریں سُننے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے خود سے پوچھا تھا کہ ایسے حالات میں اُن کا خاندان کے ساتھ سفر کرنا موزوں بھی ہے۔ اپنے طور پر وہ فوری جانا چاہتے تھے کہ حالات کا بغور جائزہ لے سکیں۔ تاہم جب ڈاکٹر موسیٰ سے بات ہوئی اُس نے متانت سے کہا۔

ہم خالد بن ولید کی نسل کے وارث ایسے کب تک چھپیں گے؟

جو جی داری اور دلیری زندگی بھر آپ کے وجود کا حصّہ رہی ہے اور جس ایمان پر

آپ کی حیاتی کا ایک ایک لمحہ بسر ہوا ہے۔بس اُسی ایمان اور جذبے کو ہماری زندگیوں میں بھی اُترنے کی ضرورت ہے۔اور ایسا کرنے میں ہی ہماری بقا اور نجات ہے۔یوسف ضیا نے زیر لب خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے بیٹے کو اِک نگاہ تفاخر سے دیکھا تھا۔ڈاکٹر موسیٰ نے متانت سے کہا تھا۔

اُن کی بیٹی کی شادی میں ہم سب چلیں گے کہ آپ کی ماموں زاد بہن آپ سے بہت محبت کرتی ہے اور میرا خیال ہے کہ بارہا انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار آپ سے ملنے پر کیا تھا کہ یوسف میرے بچوں کی شادیوں پر تمہارا اہل خانہ کے ساتھ آنا گاؤں میں میری توقیر میں اضافے کا باعث ہوگا۔

ریڈینا اور بچوں کو جب معلوم ہوا انہوں نے شور مچایا،اُچھلنا کودنا شروع کردیا۔

''ہمیں بھی جانا ہے۔عرب شادی ہمیں بھی دیکھنی ہے۔''ریڈینا نے ضالیہ سے پوچھا اُس نے کہا۔

''دراصل ابّی تو ذرا تامل میں تھے پر ڈاکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ تمہیں چلنا ہے۔''

ریڈینا نے بچوں کے جوش وجذبے اور عرب شادی دیکھنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ضالیہ چند لمحوں کیلئے خاموش ہوگئی۔اُس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی محسوس کرتے ہوئے ریڈینا نے ابھی صرف ''ضالیہ'' ہی کہا تھا جب وہ بولی۔

''ریڈینا تمہاری کمپنی مجھے ہمیشہ مسرور کرتی ہے اور میں دل سے چاہتی ہوں تم ہمارے ساتھ چلو۔مگر جو خوف اور خدشات ہمارے پیش نظر ہیں ان کے پیش نظر تمہیں اس رسک risk میں شامل نہیں کرسکتے۔ہر آئے دن کہیں نہ کہیں بم پھٹ رہے ہیں۔سنگینوں کے سائے میں فلسطینیوں کو دیس بدر کیا جارہا ہے۔نئی بستیاں بن رہی ہیں۔

''ضالیہ تم مجھے اور میرے خیالات سے اچھی طرح آگاہ ہو۔تمہاری اِس بات

نے مجھے ہرٹ hurt کیا ہے۔"

"یرڈینا میری جان۔"

ضالیہ نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔

"حالات کا چہرہ کیا تم سے چُھپا ہوا ہے۔ کیسے ایک قوم دوسری کا تخم مارنے اور اُسے دیس نکالا دینے پر تُلی ہوئی ہے۔ زمانوں سے اِس معاشرے میں رہنے والوں کے درمیان سے محبت اور اعتماد کی خوشبو اُڑ گئی ہے۔ انسانیت کا فقدان ہو گیا ہے۔ مذہبی تعصب اور نسلی تفاخر اپنی انتہا پر پہنچ گئے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ آواز روندھ گئی تھی۔ دیر بعد کہیں جا کر اس نے بات مکمل کی۔

تب سوچنا پڑتا ہے۔ ہم تو موت کے منہ میں جائیں گے ہی تمہیں کیوں اپنے ساتھ گھسیٹیں۔

"ضالیہ تم سے زیادہ مجھے کون جانتا اور سمجھتا ہے۔ اپنے بارے میں کوئی بھی وضاحت کتنی عامیانہ سی لگتی ہے۔ یہ کہنا کہ میں کتنی کٹر یہودی ہوں انتہائی فضول بات ہے۔ تمہاری اور تمہارے گھرانے کی صحت نے مجھے تو کل آشنا کر دیا ہے اور میں نے یہ جان لیا ہے کہ مقدر میں جو کچھ لکھ دیا گیا ہے اُس سے کہیں فرار نہیں۔ میں اِس نکتے کو بھی اب جان گئی ہوں کہ اگر زندگی ہے تو موت خود اس کی حفاظت کرتی ہے۔

یوسف ضیا کو پتہ چلا تو انہوں نے بھی پیار سے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مانی ہی نہیں اور سب کے روکنے کے باوجود جانے کیلئے ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

یہ کتنی خوبصورت جگہ تھی۔ سبزے سے لدی پھندی۔ زیتون کے پیڑوں سے بھری ہوئی، شاندار باغیچوں سے سجی ہوئی۔

گرے پتھروں سے بنا ہوا محرابی صورت برآمدوں والا یہ دومنزلہ گھر جس کے اندر گلاب مہکتے اور مسکراتے تھے۔کیاریوں میں سبزیاں ہریالی کے رنگ چھوڑتی تھیں۔ٹائلوں کے فرشوں والے کمروں میں اطراف میں بچھے گدوں پر گھر کے سب افراد کے ساتھ کھانا کھانا، بانسری پر نغمے سُننا اور دُلہن کی آرائش و زیبائش کے مقامی رنگ زیتون کے تیل میں تلسی اور پودینہ کے پتوں کو پیس کر ملانے اور اُس سے مالش کرنے کے عمل کو دیکھنا۔رات کو مردوں کے رقص اور عورتوں کے ناچ اور ان سبھوں کے درمیان یہودیوں اور صیہونوں کے حملوں کا خوف۔زندگی کی رعنائیوں سے بھری خوشیوں کے سینوں میں کانٹوں کی طرح پیوست خوف، ڈر، دربدری اور سب سے بڑھ کر موت کے اندیشے سب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

یائل نے ایسے ہی عورتوں اور مردوں کے مشترکہ رقص کے دوران منصور کے ساتھ ساتھ پاؤں اُٹھاتے ہوئے اُسے کہا۔

''منصور مجھے اپنی دُلہن بناؤ گے۔''

بارہ سالہ منصور کا چہرہ شرماہٹ کی سُرخی میں نہا تا یائل کے گلاب رنگ کانوں کے پاس ہوا اور بڑی دھیمی سی سرگوشی نے اُن میں رس گھولتے ہوئے ایک سوال کیا۔

''سچ بتاؤ یائل تم میری دُلہن بنوگی۔''

منصور دُلہا کی طرح اپنی کمر پر تلوار کی پیٹی باندھے ہوئے تھا۔سر پر سُرخ کفیہ کے پھندنے اس کے ماتھے پر جھالر سی بنا رہے تھے۔یائل نے انہیں چھوا اور کہا۔

''منصور تم کتنے خوبصورت لگ رہے ہو۔''

''جب میں تمہاری دُلہن بنوں گی تو میں باسمہ اختی کی طرح ناچوں گی۔ساری رات ناچوں گی۔''

"پائل میں تمہیں گھوڑے پر بٹھاؤں گا اور اس کی نکیل تھام کر رقص کروں گا۔"

تین دن جیسے خوشگوار ہوا کے چند جھونکوں کی طرح تھے جنہوں نے بلندیوں سے اتر کر خوشبو کی طرح انہیں جی بھر کر سرشار کیا۔

واپسی کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد ہی دیر و یاسین میں جو طوفان اُٹھا جو ہولناک ہولی کھیلی گئی اور جس جس انداز میں اُس دھرتی پر بسنے والے لمکینوں کا صفایا کیا گیا اُس نے ظلم و بربریت کے پرانے قصّوں کو ماند کر دیا۔

دیر یاسین پُر امن شہرت رکھنے والا گاؤں تھا۔ پورے گاؤں کو جس میں تقریباً ساڑھے سات سو رہائشی لوگ تھے گوریلا دستوں نے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے۔ آرگن کے گوریلا دستے جن کی کمانڈ سٹرن کے مرنے کے بعد اب بیناحم بیگن کر رہا تھا۔ ڈائنامیٹ سے گھر اُڑائے گئے۔ معصوم بچوں اور بوڑھوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دیا گیا۔ وہ گھر جہاں صرف ڈیڑھ ماہ قبل خوشیوں کی بارات اُتری تھی اُس گھر کا تو ایک بندہ نہیں بچا کہ وہ یہ بتا سکے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا اور انہوں نے کیسے موت کا سامنا کیا؟

کتنے دن گزرے ہوں گے یہی کوئی پینتیس چالیس۔ ابھی تو وہ اُن دنوں کی لذت اور رنگینی سے باہر نہیں نکلے تھے۔ جہاں ذرا سا فارغ بیٹھتے۔ وہ اُس ماحول میں پہنچ جاتے۔ پائل انگلیوں کی پوروں پر دن گنتی اور کہتی۔

اُف اتنا لُطف کبھی نہیں آیا؟ اتنی خوبصورت جگہ اتنا خوبصورت آسمان، نیلا شفاف، اتنے پھول، جھاڑیاں، پہاڑیاں سچی جی چاہتا ہے گرمیوں کی چھٹیوں میں پھر وہاں جائیں۔ ادھر مائنز Mines بھی تھیں میں انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ منصور تو مجھے وہاں لے جانے کو تیار بھی تھا۔ یہ ڈیل ایڈمنڈ ڈر گیا۔ دوڑ کر ضالیہ آنٹی کو خبر کر دی۔ وہ ننگے پاؤں

بھاگیں۔چلاتے ہوئے منصور کو ڈانٹا کہ بس زیادہ ایڈونچرس Adventurous بننے کی ضرورت نہیں۔"

کبھی مارچ اپریل کے مہینے فلسطین کیلئے خوشبوؤں اور خوشیوں کے ماہ تھے۔یوسف ضیا خاموش بیٹھے بیوی کو سُنتے تھے جو شادی کے بعد ابھی واپس حیفہ نہیں گئی تھی۔اُن کے ساتھ یروشلم آگئی تھی اور اب کل واپس حیفہ جارہی تھی۔"ایام" سامنے میز پر پڑا تھا۔سارا صفحہ رُوتی کرلاتی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔

آج کوئی پانچ دنوں بعد یوسف ضیا غیر مُلکی ٹیموں کے ساتھ دیر یاسین سے لوٹے تھے۔کس قدر خوفناک مناظر انہوں نے دیکھے تھے جنہوں نے اُن کے پورے وجود میں طوفان اُٹھائے۔اُن کی آنکھوں سے آنسو نہیں خون برستا تھا۔ڈائنامیٹ سے اُڑے ہوئے گھر۔قبرستانوں کی بلڈوزروں سے صفائی۔کانوں اور گھاٹیوں میں لاشوں کے ڈھیر۔اُن کے عزیز رشتہ دار وہ گھر جہاں ابھی ایک ماہ قبل وہ سب آئے تھے۔جہاں شہنائیوں کی گونج میں گیت تھے۔قہقہے اور مسکراہٹیں تھیں۔کہاں تھے وہ سب جنہوں نے ان کے پیروں کے نیچے اپنے ہاتھ رکھے تھے کہ زمانوں بعد یوسف ضیا اپنی اُس عم زاد بہن کے گھر اپنی فیملی کے ساتھ مہمان ہوا تھا۔

جی دار اور دلیر لوگ تھے۔ان کے دلوں میں خوف ضرور تھا پر لبوں پر لعن طعن، شکوے اور سوال تھے۔ہم نے انہیں کیا نقصان پہنچایا؟ یہ ہمارے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ جیسے معصومانہ سوال بھی عام لوگوں کے اندر سے نکلتے تھے۔دیہاتیوں کے پاس پرانے ماؤزر اور بندوقیں تھیں۔عورتوں کی کس قدر بے حرمتی ہوئی۔یوسف ضیا تو سُن ہی نہ سکے جب گیوٹ شال یہودی نو آبادی میں غیر مُلکی صحافیوں کو تفصیلات دی جارہی تھیں۔اس کا بھی بیان ہولناک تھا۔

ارگونArgunاور اسٹرنEstern گینگ کے لیڈروں مناحم بیگن نے مدافعت میں بیانات جاری کرنے پر زور دیا۔

یرڈینا بہت دنوں ڈپریشن کا شکار رہی ۔یہ کتنے ظالم ہیں؟ خون کی جس ہولی میں نہاتے آئے ہیں اور جس کرب سے گزرے ہیں اُس میں دوسروں کو گزارنا شروع کر دیا ہے۔مظلوم ظالم بن گئے ہیں۔

ننھی سی پائل کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت سی دلہن اور دلہا مر گئے ہیں اور وہ گھر اور گاؤں تباہ ہوگیا ہے۔

راستے میں پڑنے والے چھوٹے چھوٹے گاؤں کچھ فلسطینیوں نے خوف زدہ ہو کر خالی کر دیے تھے۔کچھ بزور اسلحہ خالی کروا لیے گئے ایک نئے جہان کی تعمیر کیلئے۔

جوابی ردِّعمل اگرچہ کمزور صورت میں تھا مگر بھرپور تھا کہ صرف چند دن بعد عرب ہائیر کمیٹی کے ایک ٹولے نے اُس کانوائے پر حملہ کر دیا جو اُن آرگن دہشت گردوں کو کوہ سکوپس کے میڈیکل سینٹر میں لے جا رہا تھا جو دیر یاسین میں زخمی ہوئے تھے۔

ابھی اِس سانحہ کا زخم ہرا ہی تھا کہ برطانیہ نے اپنی فوجیں واپس بھیجنا شروع کر دیں ۔روس اور دوسرے ملکوں سے ایک یلغار تھی جس نے بحیرہ روم کے ساحلوں پر اُترنا شروع کر دیا۔ہائی کمشنر برطانیہ رخصت ہوگیا اور ساتھ 14 مئی 1948ءکو اسرائیل نے نئی مملکت کا اعلان کر دیا۔

اخوان کے پاس گولہ بارود ختم ہو رہا تھا۔انہوں نے عرب ریجن سے کہا کہ وہ انہیں نئی سپلائی دیں لیکن جنرل گلاب پاشا اور بقیہ عرب مُلکوں کے جرنیل سب خاموش اور برطانیہ کی مُٹھی میں تھے۔

محاصرہ پھر بھی جاری رہا کہ بیت المقدس کی پوری آبادی مقابلے پر نکل

آئی۔اُردنی فوج بھی جنرل گلب پاشا کی حکم عدولی کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوگئی۔یقیناً وہ کامیاب ہوتے اگر ماسکو کی ہدایت پر چیک حکومت کے ٹرینڈ trained کیے ہوئے اسرائیلی دستے اِس سارے کھیل کا پانسہ نہ پلٹ دیتے۔

ایسے میں حیفہ جانے کا فیصلہ کرنا کوئی آسان کام تھا۔دنوں وہ لوگ نڈھال سوچتے رہے۔حیفہ تو پہلے ہی اُن کے قبضے میں آچکا تھا لیکن جن ساڑھے تین ہزار فلسطینی عربوں کو وہاں رہنے کی باقاعدہ اجازت دی گئی اُن میں یوسف ضیا کا خاندان سرِفہرست تھا۔میئر حیفہ نے یوسف ضیا کو ذاتی طور پر فون کر کے حیفہ میں مقیم ان کی اہلیہ اور گھر کے تحفظ کی ضمانت دی تھی۔

وہ اب بہت بوڑھے تھے اور حالات سے دل برداشتہ بھی۔اِن دنوں وہ ''ال بساری'' Al-Busairi کی قصیدہ البردہ بہت پڑھنے لگے تھے۔باب آٹھ کھولتے رسولؐ اللہ کا جہاد پڑھتے۔کبھی سیدنا رسولؐ اللہ کی الفت ومحبت سے بھیگے ہوئے اشعار سے آنکھیں بھگوتے۔

پھر ایک دن انہوں نے ڈاکٹر موسیٰ سے ٹوٹتی پھوٹتی آواز میں اتنا کہا۔

''ایک تو لیڈر شپ نہیں کہ جو راہ دکھائے۔لوگوں کو بھی ہابڑے پڑے ہوئے تھے کہ زمینیں اِن کے ہاتھوں مہنگے داموں بیچ دو۔کچھ قانونی تقاضے پورے ہوگئے اور کہیں زور زبردستیوں والے معاملے ہو رہے ہیں۔جرنیل بکے ہوئے تھے۔سُنتے سُنتے کان پک گئے تھے کہ اومان کے فوجی دستے چل پڑے ہیں۔وہ کہاں گئے؟ان کے ساتھ کیا ہوا؟ آخر عرب فوجیں کیوں نہ ان کا راستہ روک سکیں۔فلسطین ختم ہوگیا ہے۔

''ابھی چند دن پہلے ارسکین چلڈرز مجھے شاہراہ الم پر ملا تھا۔''

ارسکین چلڈرز کے نام پر یوسف ضیا کی آنکھوں میں جھانکتی قدرے حیرت پر ڈاکٹر

موسیٰ نے کہا تھا۔

وہ شربتی سی آنکھوں والا آئرش صحافی جو اکثر میرے پاس اپنی کسی نہ کسی بیماری کیلئے آتا رہتا ہے۔ وہ سٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی خفیہ رپورٹ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

کیا مصر، کیا اُردن، کیا شام، کیا لبنان سبھی ہم سے خائف ہو گئے ہیں۔ ابھی تو آغاز ہی ہوا ہے اور وہ بلبلا بھی اُٹھے ہیں۔

قاہرہ کے سفارت خانے نے رپورٹ دی کہ اگر مہاجرین کو مصر میں دھکیلا گیا تو یہ مصر کی اقتصادی حالت کیلئے تباہ کن ہو گا۔ اُردن کا کہنا تھا کہ مہاجرین اُردن کے محدود ذرائع پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ہوں گے۔ لبنانی سفارت خانے کے مطابق مہاجرین کو برداشت کرنا لبنان کیلئے ممکن نہ ہو گا۔ شام بھی یہ بوجھ اُٹھانے سے معذور رہے۔ یوسف ضیا نے بیٹے کو دیکھا اور دھیمے سے بولے۔

یہ تو ڈپلومیٹک پریشر بھی ہے جو وہ امریکہ کو دینا چاہتے ہیں مگر حقیقت بڑی کڑوی ہے کہ انہیں ہمارا احساس ہی نہیں۔ عرب قومیت کے جھوٹے نعروں اور اس کے خوش کن سحر میں گرفتار عربوں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑے مار کر انہیں خود ہی کاٹ لیے ہیں ٹکڑوں میں بٹ کر ان کے طفیلی بن کر بڑے خوش ہیں۔

''تمہیں باہر جانا ہے سپیشلائزیشن specialization کیلئے۔ جاؤ اور بچوں کو ماں کے پاس چھوڑ دو۔''

بس چند دنوں میں ہی فیصلہ ہو گیا۔ حیفہ کے پرانے شہر میں ان کے آبائی گھر نے اُن کا استقبال کیا۔ بچے یوں خوش تھے کہ ڈیوڈ فیملی اپنی ٹرانسفر کے سلسلے میں پہلے ہی یہاں شفٹ ہو چکی تھی۔ گریک آرتھوڈوکس چرچ کے زیر انتظام حیفہ کے بہترین سکول میں منصور کا داخلہ ہو گیا۔ نوٹرڈیم کونونٹ میں پائل تھی اور یہ دُنیا اُس کے لیے بے حد

خوبصورت تھی جس میں پائل اس کے ساتھ تھی۔

باب نمبر: ۶

سکول جانے کیلئے بس اُسے Sahatal-Hanatir سکوائر جسے آجکل Paris-sq کہا جاتا ہے سے ملتی۔ گھر سے نکلنے سے قبل دادی کے کمرے میں جانا ضروری ہوتا۔ وہ دس آیتوں کا ورد اُس کے چہرے پر پھونکوں کی صورت کرتیں اور پھر اُسے خدا کی تحویل میں سونپ کر بے حد افسردہ اور دلگیر لہجے میں خود سے کہتیں۔

"یہ میرا حیفہ یہ میرے پُرکھوں کا حیفہ۔ یہ صلاح الدین کے ہاتھوں فتح یاب ہونے والا خوبصورت شہر صدیوں سے عرب تہذیب و تمدن کا عکاس۔ اِس نے کیسے ہم سے آنکھیں پھیر لی ہیں؟ یہ کیسے غیروں کا بن گیا ہے؟ ہمارا تو اب یہاں رہنا ایسے ہی ہے جیسے بھوکے خونخوار بھیڑیوں کے سامنے لاغر، بے بس اور مریل سے بھیڑ بکریوں کے بچے جن پر وہ بہانے بہانے سے جھپٹتے ہیں۔

اپنے سکارف کے پلّو سے گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے انہیں اپنی بہن یاد آجاتیں جس کا سُسرال عکّہ Acre میں زمانوں سے رہ رہا تھا۔ عکّہ پانچ ہزار سال کی تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹے مشرق و مغرب کا دلآویز امتزاج رکھنے، آرٹ اور مذہب کے حوالوں سے شہرت پانے والا شہر جس کی وہ دیوانی تھی۔ جب بھی بہن کی سُسرال گئی اُس کے قلعوں، گرجوں، مسجدوں اور شیشی گاگوں کو دیکھنے ضرور نکلی۔ اس کے ٹرکش بازاروں میں ضرور گھومی۔

یوسف ضیا کو بھی عکّہ بہت پسند تھا۔ جب بھی جاتا ہوا اُس کی خوبصورت اور وسیع و عریض مسجد الجزار میں انہوں نے نماز ضرور پڑھی۔ مگر کیا ہوا۔ انہوں نے عکّہ پر قبضہ

کرلیا۔صدیوں سے رہنے والوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک دیا۔بڑے سے چوبی پھاٹک سے اندر داخل ہو کر جب نوجوان فوجیوں نے انہیں دو گھنٹے بھی نہ دیئے تو اُن کے پاس مسجد الجزار میں پناہ لینے کے سوا کیا چارہ تھا؟بحر روم کی ساحلی پٹی کے کتنے گاؤں تھے جن کے لوگ وہاں جمع تھے۔

کوئی عمقہ سے تھا۔روتے ہوئے بتاتا تھا ہمارے گھروں کی انہوں نے اینٹ سے اینٹ بجادی۔

ہم کفر بریم سے ہیں۔ہمارا تعلق الکبڑی سے ہے۔

ہمارے باپ دادا صدیوں سے البہ کی مٹی سے جڑے ہوئے تھے۔ہمیں بھی اسی نے جکڑ رکھا تھا۔

یہی یافہ(جیفہ) کے ساتھ ہوا۔ستر ہزار عرب باشندوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر پھینکا گیا۔سنگینوں کے سایوں میں ہم سے ہمارے گھر خالی کروالئے گئے۔

صدیوں بعد قیامت ٹوٹی تھی۔

صلیبیوں نے بھی ہمارے اجداد کو خون میں نہلایا تھا۔اُن کے گھروں پر قبضہ کیا تھا۔عکّہ ان کے قبضے میں سو سال رہا۔صلاح الدین نے حطین کے معرکے کے بعد شہر کو ان کے قبضے سے نجات دلائی۔

اِس دھرتی کے مقدر میں ہی شاید خون خرابہ لکھا ہے۔

منصور کمرے سے نکل کر تیز رفتاری سے قدم اُٹھاتا محرابی کھڑکیوں والے وسیع و عریض گھروں کے سامنے والی گلی سے گزرتا۔

پہلے گول چکر پر کنوئیں پر کھڑی اپنے اپنے بچیوں میں پانی لیتی عورتوں،بوڑھے مردوں اور چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کا جمگھٹا ہمیشہ جیسے معمول کی طرح نظر آتا۔اس پر نظریں

ڈالے بغیر تیزی سے آگے بڑھ جانا کہیں ممکن تھا۔اس کا بوڑھوں اورعورتوں کوفوری سلام کرنا دادا اور دادی کی تربیت کا ایک ضروری حصّہ تھا جس سے کوتاہی اُس کے لیے ممکن ہی نہ تھی۔جواباً چند ایک کے ہونٹوں اور چہروں پر شفقت و محبت سے بھری مسکراہٹ نمودار ہوتی۔

کچھ دعائیں دینا فرض خیال کرتے۔چند چہرے بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے۔یہ لوگ یہودی، عیسائی اور مسلمان سبھی ہوتے۔ان کے محلّے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔حالات وواقعات کے کھچاؤ اور تناؤ نے بہت سے ذہنوں کو متاثر کردیا تھا پر درمیان میں محبت والے وجود بھی تھے۔

چوک میں ٹاک کٹی گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھنا، ریلوے اسٹیشن سے آتی انجنوں کی چھک چھک سُننا، اپنی ناپسندیدگی کا اظہار خود سے چہرے پر ہلکے سے تاثر سے دیتے ہیڈ پوسٹ آفس کی عمارت پر سے نظروں کو گزارتے ہوئے بائیں طرف دیکھنا جہاں سے بس کو آنا ہوتا۔

وہ ہمیشہ اُس بس میں بیٹھتا جو جرمن کالونی سے ہوتے ہوئے کونونٹ جاتی۔جرمن کالونی سے یائل اس میں چڑھتی۔دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی جیسے ہیرے سے چمکنے لگتے۔اگر منصور کے ساتھ والی سیٹ خالی ہوتی تو وہ چھلانگیں مارتی اُس کے پاس جا کر بیٹھتی اور اگر رش ہوتا تو آنکھوں سے باتوں کی کوشش کرتی۔اکثر منصور کھڑا ہو کر اُسے اپنی جگہ دیتا اور خود اس کے پاس کھڑا ہو جاتا۔بس میں سوار رُوس اور پولینڈ سے ہجرت کر کے آنے والی بوڑھی عورتیں اکثر دونوں کو گھورتیں۔

بس اسٹاپ پر اُترنے سے قبل وہ اپنے کتابوں سے بھرے چرمی بیگ سے سفید اور سیاہ پھولوں والی اُونی تھیلی نکالتا۔اُس کی پھندنے والی ڈور کو ڈھیلا کر کے اس میں سے

چھوٹے سے پیتل کے قلعی شدہ ڈھکن باکس میں رکھا سفید لفافہ نکال کر پائل کو تھما دیتا۔پائل کی آنکھیں اُسے پکڑتے ہوئے جگمگ جگمگ سی کر اٹھتیں۔

اس لفافے میں طبون بریڈ کے بیضوی پتلے اور مزیدار دو سلائس ہوتے۔منصور کھانے میں چور تھا۔ضائیہ کو اس کا احساس تھا۔صبح چھ بجے کا گھر سے نکلا وہ کہیں تین بجے لوٹتا تھا۔شاید اسی لیے وہ اُسے لنچ دینے اور اُسے ذائقہ دار بنانے کا خاص اہتمام کرتی تھی۔طبون بریڈ بنانے میں فرائی چکن اور پیاز کے علاوہ اس میں سمک sumac(مصالحے کی ایک قسم) آل سپائز کے ساتھ زعفران کا اضافہ بھی ضرور کرتی۔زعفران کتنا مہنگا تھا۔ضائیہ کو اس کی کبھی فکر نہ ہوتی۔

اُمی پائل کو یہ بہت پسند ہیں۔اس کے لیے بھی ایک دو رکھ دیا کریں۔

ضائیہ ہنس پڑی اور بولی۔

مجھے تو لگتا ہے تم اپنا لنچ بھی اُسے ہی کھلا دیتے ہو۔

''بالکل نہیں۔''اس معصوم سے چہرے پر مسکراہٹ کھیلی کتنی بھلی لگتی تھی۔حمس Hummas کے لنچ کیلئے منصور کی فرمائش بہت ہوتی۔

Pine nuts کی گارنش سے سجا حمس پائل کو بہت پسند تھا۔

پائل کو حیفہ بہت پسند تھا۔وہ جب سے یہاں آئی تھی اس شہر کے حُسن نے اُسے موہ لیا تھا۔یرڈینا بھی متاثر ہوئی تھی۔اپنی ماں کے ساتھ بیٹھ کر جب اُس نے بس میں سفر کیا اور نشیب سے پہاڑی ڈھلانوں پر بنے خوبصورت گھروں کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں اور درختوں کے پھیلاؤ کو دیکھا تو مسرّت کا فرحت آگیں احساس اُس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی پھیل گیا۔رات کو کبھی ساحل پر جانا ہوتا تو خاموش سمندر کو دیکھنا بھی ایک پُر سحر سا نظارہ ہوتا۔روشنیوں سے جگمگاتا شہر کہیں پانیوں میں ہلکورے کھاتا اور کہیں

کارمل ماؤنٹ کی ڈھلانوں پر بکھرا زینہ بہ زینہ بلندیوں سے اُترتا نظر آتا کہ وہ بے اختیار سوچتی اور خود سے کہتی۔ کاش منصور ہوتا تو وہ اِس سین scene کو اس کے ساتھ کتنا انجوائے enjoy کرتی۔ شاید یہ اس کی سچی طلب تھی کہ منصور کا حیفہ آنا ممکن ہوگیا۔ بس میں یا سب کے ساتھ کسی پکنک سپاٹ Picnic Spot پر کسی پہلے سے دیکھے گئے سین scene یا منظر پر وہ ضرور اُس سے کہتی۔

"منصور ان سبھوں نے مجھے متوجہ کیا تھا۔ یہ سب مجھے خوبصورت نظر آئے تھے مگر اتنے نہیں جتنے اب۔ سچی تمہاری موجودگی چیزوں کا حُسن بڑھا دیتی ہے۔"

منصور ہنس کر کہتا۔ "تمہیں باتیں کرنی بہت آ گئی ہیں یائل۔ تم حیفہ آ کر باتونی ہوگئی ہو۔"

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اُس کا اتنا لمبا چکر رائیگاں جاتا۔ یائل چُھٹی کر لیتی۔ بس میں سوار ہونے والوں کی لمبی قطار پر وہ آنکھیں جمائے دیکھتا رہتا، دیکھتا رہتا حتیٰ کہ وہ مایوسی سے سر نفی میں ہلاتا اور جیسے اُس کا وجود سرگوشی میں کہتا۔

"یائل تو اِن میں نہیں ہے۔"

اور پھر باہر کے کسی منظر میں اُس کیلئے کوئی جاذبیت نہ رہتی۔ وہ فطرت سے محبت کرنے والا لڑکا تھا۔ اُسے بھی حیفہ بہت پسند تھا۔ سب شہروں سے زیادہ۔ خوبصورت گھر کارمل پہاڑ پر بچھے کسی دیدہ زیب کپڑے پر جابجا ٹنکے رنگین حسین موتیوں کی طرح نظر آتے تو یوں لگتا جیسے وہ ابھی اُوپر سے لُڑھکتے مڑھکتے ہوئے نیچے بحرِ روم کے پانیوں میں گُھلنے ملنے کیلئے چلے آ رہے ہیں۔ بس جونہی Annunciation چرچ کے نزدیک ہوتی جاتی وہ اپنی نشست سے اضطرابی انداز میں کھڑا ہو جاتا اور وہ اُترنے والوں میں سب سے آخری لڑکا ہوتا۔

سکول کے اندر داخل ہونے اور اپنے بلاک میں جانے تک وہ پژمُردہ سا رہتا۔بریک میں سائنس بلاک کے سامنے والی سیڑھیوں جس کے عقب میں محرابی صورت والے لمبے برآمدوں پر محیط تین منزلہ بلڈنگ تھی۔یہاں دائیں بائیں دس بارہ زینوں والی سیڑھیاں کھجور کے درختوں کی پاسبانی میں سیاہ گِرل کے ساتھ ساتھ اُوپر اُٹھتی ٹیرس پر جارُکتیں،اور یہیں وہ بیٹھا اپنی کوئی کتاب کھولے ساری بریک گزار دیتا۔بس کبھی کبھی وہ آنکھیں اُٹھا کر خالی خالی نظروں سے پیڑوں سے گھرے اپنے بلاک اور گملوں میں سجے گل داؤدی کے پھولوں کو دیکھتا،گھورتا نظروں کو گھماتا دوسری اور تیسری منزل کی چھوٹی چھوٹی دو پٹوں والی سفید اور آسمانی پینٹ paintوالی کھڑکیوں پر آکر رُک سا جاتا۔اُسے لگتا جیسے ابھی کھڑکی کے پٹ کُھلیں گے۔اُن پٹوں کے درمیان ایک چاند چہرہ طلوع ہوگا۔بلوری آنکھیں تجسّس سے بھری اِدھر اُدھر دیکھتی دفعتاً ایک جگہ رُک جائیں گی۔تب خوشی سے لبریز ایک تیز آواز فضا میں گونجے گی۔

”منصور تم بھی کیسے چغد ہو؟تمہیں میں اتنی دیر سے نظر ہی نہیں آئی۔“

”پائل کانوتر ڈیم کونونٹ اُس کے سکول کے ساتھ ہی تھا۔لڑکے لڑکیاں بے محابا یہ ایک دوسرے کے حصّوں میں آتے جاتے نہیں تھے۔سختی تھی مگر پھر بھی لائبریری میں ریفرنس بکس Reference Books کے بہانے لڑکیاں داؤ لگا لیتیں۔

اور جب کبھی مدرز کا چھاپہ پڑتا تو لڑکیاں نارنگیوں کے پیڑوں پر گلہریوں کی طرح پُھدک کر چڑھ جاتیں۔کبھی کبھی پکڑی جاتیں اور سخت سزائیں جھیلتیں۔پائل کی تو سُپر مدر کے سامنے پیشی بھی ہو چکی تھی۔پرڈینا کو بھی ایک بار اِس سلسلے میں بُلایا گیا تھا۔

سُپر مدر نے شکایات کا ڈھیر اس کے سامنے لگا دیا تھا۔پرڈینا اطمینان سے یہ سب سُنتی رہی۔جب وہ خاموش ہوئیں اُس نے متانت سے کہا تھا۔

''مدر میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔میری غلطی میں نے آپ کو اپنے پس منظر سے کبھی آگاہ نہیں کیا۔جس عذاب جس کرب اور جن دُکھوں سے میں گزری ہوں انہوں نے مجھ سے جینے کی ہر اُمنگ چھین لی تھی۔یائل کا شوخ و چنچل روّیہ مجھے زندگی کا احساس دلاتا ہے۔مجھے ایک پل کیلئے اس کی خاموشی برداشت نہیں ہے۔میں چاہتی ہوں یہ ایسی ہی ہنستی، کھل کھل کرتی، شرارتیں کرتی اور ستاتی رہے۔

رہا اس کا منصور سے ملنا آپ اس بارے میں کچھ مت چنتا کیجیے۔منصور کی فیملی سے ہمارے بہت گہرے مراسم ہیں۔ان کا بچپن ایک دوسرے کے ساتھ گزرا ہے۔''

اور جب مدر نے مزید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی ایسی حرکتوں کو ڈسپلن کی خلاف ورزی گردانا۔یرڈینا نے لبوں پر میٹھی سی مسکان بکھیری اور بولی۔

''میں جانتی ہوں۔میرا گھرانہ اس مسلم فلسطینی کے بہت قریب ہے۔اُن کا کھانا پینا اُٹھنا بیٹھنا سب ایک دوسرے کے ساتھ تھا۔یروشلم میں امریکن کالونی یا مغربی یروشلم کے کسی احاطے میں رہنے کی بجائے میں ان کے ہی گھر کے ایک حصّے میں رہی ہوں۔

''مدر''اُس نے لمبی سانس بھرتے ہوئے انہیں دیکھا اور گفتگو کو جاری رکھا۔میں نے انسانی بربریت اور درندگی کو اتنے قریب سے دیکھا اور اس کا شکار ہوئی ہوں کہ اب میں مذہب اور ان کے درجوں کی قائل نہیں رہی۔یہ لوگ بہت نفیس اور محبت والے ہیں۔سچی بات ہے میں نے یہاں سے بھاگ جانا تھا اگر مجھے اِن کی قربت نہ ملتی۔میں صرف ان لوگوں کی وجہ سے یہاں ہوں اور اب تو بیچارے فلسطینی عتاب میں ہیں۔

سُپر مدر نے اپنے کسی اندیشے، وسوسے اور فکر کے اظہار یے کو زبان نہ دی۔وہ فرانس سے تھیں۔اُن کی چند اور ساتھی ننز Nuns نے مل کر اسے بنایا تھا اور وہ اس کے پہلے والے محبت بھرے ماحول میں جو انسانیت اور خلوص کا نمائندہ تھا کے عنقا ہو جانے

اور صیہونیت، یہودیت کے تعصب و برتری، ظلم وستم اور جبراً بے دخلی کے ظالمانہ طریقوں کو تشویش سے دیکھتی اور اُنہیں سخت ناپسند کرتی تھیں۔

اسی دن شام کو وہ پرانے حیفہ اُن کے گھر آ ئیں۔ یرڈینا کو ہمیشہ یہاں آنا اچھا لگتا تھا۔ جرمن کالونی کو جدید تھی اِسے 1869ء میں Templar سوسائٹی نے بنایا تھا۔ تب گھر بہت خوبصورت اور شاندار تھے۔ کشادہ سڑکوں اور پارکوں سے تجی یہ کالونی پورے حیفہ میں بہترین خیال کی جاتی تھی۔ تب حیفہ اتنا خوبصورت نہ تھا۔ میلا میلا سا لگتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ برطانیہ کی چھتر چھاؤں تلے سانس لیتے اِن شہروں میں ہر اُس تنظیم پر شک کیا گیا جس کا تعلق کسی نہ کسی انداز میں جرمنی سے تھا۔ اُس نے سوسائٹی کے ارکان کو جرمن ہونے کے ناطے یہاں سے باہر نکال دیا۔ کالونی نظر انداز ہوئی۔ تاہم جنگ کے خاتمے کے بعد اسے دوبارہ مرمت اور رنگ روغن سے سجایا گیا اور اس کی پرانی شان وشوکت کو بحال کیا گیا۔ جدید لوازمات سے آراستہ اِس کالونی میں رہنا یرڈینا کو اچھا لگا تھا۔

لیکن ضالیہ کی ساس کے اِس گھر کا کیا کہنا تھا جس کے کشادہ آنگن میں تالاب تھا کنواں تھا۔ یہ گھر حلب اور دمشق کے معززین کے گھروں جیسا تھا۔ نارنگی، انجیر، آڑو اور اناروں کے پیڑوں سے سجا گلاب کے پھولوں اور یاسمین کی کلیوں سے مہکتا۔ کمروں کی چھتیں اتنی اُونچی تھیں اور شہتیر ایسے قد آور تھے اور اُن پر گُل کاری ایسی شاندار تھی کہ یرڈینا کی آنکھیں دیکھتے نہ تھکتیں۔ برآمدوں کی طوالت، دروازوں اور کھڑکیوں کا اُن میں کُھلنا۔ نشست گاہوں میں بچھے قالینوں پر مرصع کرسیاں اور صوفے اُن کا یروشلم کا گھر بھی بڑی فسوں خیزی لیے ہوئے تھا مگر اس گھر کی بالکونیاں، محرابی دروازے سبھوں میں قدامت کا بے پایاں حُسن تھا۔

اب یرڈینا نہ صرف عربی سمجھ لیتی تھی بلکہ اچھی خاصی بول بھی لیتی تھی۔ضایالیہ کی ساس کی محبت سے لطف اُٹھاتی۔اُن سے اُن کی جوانی کے دِنوں کی کہانیاں سُنتی۔یوسف ضیا جیسے بڑے صاحب علم آدمی کے ساتھ زندگی گزارنے کے تجربے کا احوال سُنتی۔کہیں کہیں چسکے لیتی۔کہیں ملول ہوتی۔پرانے ٹُونے ٹُوٹکے پوچھتی۔اُسے اُن سے گپ شپ کر کے بہت لطف آتا۔اُس کی ماں جب دی آنا ان کے گھر آتی تھی اُن کا دیا ہوا وہ بے مثل تحفہ طلائی پازیب اب یرڈینا کے پاس تھی۔اپنی ماں کی محبت اور چاہت وہ سارہ میں ڈھونڈتی اور سارہ بھی اُس پر اپنی ممتا لُٹاتی۔

میرے بہت سے تشنہ جذبات کی سیری ہوتی ہے آپ کے پاس آکر۔وہ اکثر اپنے جذبات کا ان سے اظہار کرتی۔

آج بھی جب ضایالیہ کھانے کو دیکھنے کے سلسلے اُٹھنے لگی۔اُس نے کہا۔"ضایالیہ میں عمو کے پاس چلتی ہوں۔ہاں پلیز سبزیوں کا ایپی ٹائزر ضرور بنوانا۔

"میری جان تمہیں کہنے کی ضرورت ہے کیا؟" کچن میں گئی وہ اُن کے کمرے میں آگئی۔وہ ضایالیہ کے لیے بے حد خوبصورت ثوب پر کشیدہ کاری کر رہی تھیں۔

"اللہ یرڈینا ان کے ہاتھ میں پکڑے فریم پر جُھکی۔"

"اُف اتنی نفاست، دھاگوں کی اتنی چمک اور رنگوں کی اتنی تازگی۔"

"ایسا ہی ڈیزائن تمہارے لونگ سکرٹ پر بھی بنا رہی ہوں۔اِس بار عید پر تمہیں تحفہ دینا ہے میں نے۔"

یرڈینا نے محبت سے ان کے گالوں پر بوسہ دیا، ان کے ہاتھوں کو چوما اور پاس بیٹھی۔انہوں نے فریم ایک طرف رکھ دیا اور باتیں کرنے لگیں۔یافہ کی باتیں جب یہ سادہ سا تھا۔اب تو اتنی سرعت سے پُر پُرزے نکال رہا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔باتوں اور گفتگو کے

لمبے چوڑے سلسلے کہیں اُن لوگوں کے ذکر کے بغیر مکمل ہوتے جنہیں دیس نکالا دیا گیا تھا۔صدیوں کے اس دھرتی سے جُڑے لوگ جو اجنبی بن گئے تھے۔وہ بہت لمبا سانس کھینچتیں اور بھیگی آنکھوں کو صاف کرتیں۔

یہ ڈینا میری بچی اپنے گھربار، اپنی زمین، اپنے ڈھور ڈنگر، اپنے باغ باغیچے جس کی ہر ہر پرت میں کچھ کرنے، کچھ بنانے، زندگی کو بتانے کے رنگ ڈھنگ کی تفصیل جو یادوں کی صورت میں نَس نَس میں رچ بس جاتی ہے۔اُن سب سے آپ کا رشتہ کٹ جائے کوئی آپ سے زور زبردستی آپ کا گھربار چھین لے اور آپ کو گولیوں سے بھون دے۔

کتنے خوبصورت گھر، اُونچی اُونچی حویلیاں، بڑے بڑے دروازوں والے گیٹ۔بدقسمت لوگ۔قہوے کی پیالیاں قہوے سے بھری ہوئی وہیں رہ گئیں۔نصیب میں نہ تھا کہ گھونٹ بھر سکتے۔کمرے سامان سے بھرے ہوئے، فرنیچر سے سجے ہوئے، سب لُٹ لُٹا گیا۔بہت سے صاحب ثروت تو دھوکے میں مارے گئے کہ زمانوں پرانے یاربیلیوں نے کہا تھا۔

”فکر مت کرو ابھی حالات ابتر ہیں۔سدا یونہی تو نہیں رہیں گے۔ڈیڑھ دو ماہ کی بات ہے۔“

وہ چابیاں اُنہیں سونپ گئے۔پر کہاں دوبارہ لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا کہ قانون اتنے سخت بنا دیئے گئے۔

پھر وہ توفیق زید کی شاعری اُسے سُناتیں۔

میں زمین کے اُس ٹکڑے پر اُس کا نام ضرور لکھوں گا

جس پر قبضہ کر لیا گیا

میرے گاؤں کا نقشہ جہاں پھیلا ہوا تھا

کیسا کیسا گھر اُجڑ گیا

کیسا کیسا درخت لُٹ گیا

کتنے خوبصورت جنگلی پھول پامال ہو گئے

مجھے انہیں یاد رکھنا ہے اور میں یہ سب لکھتا رہوں گا

اپنے دُکھوں کے ہر باب کو سانحہ کے ہر مرحلے کو

چھوٹی بڑی سب چیزوں کے ناموں کو

اپنے گھر کے آنگن میں کھڑے زیتون کے درخت کو

اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔جب وہ روتے ہوئے کہتی تھیں۔جی چاہتا ہے شاعر سے پوچھوں تمہارا گھر اور اس میں زیتون کا پیڑ بچے ہوں گے تو اُن پر کچھ لکھو گے اور پوچھو گے جب مکین اور گھر ہی بدل جائیں گے تو لکھا ہوا کس کے پاس لیکر جاؤ گے۔مگر یر ڈینا مسلمان اتنے ظالم کبھی نہیں رہے۔عمرؓ بھی تاریخ میں درج ہے اور عثمانی سلاطین بھی۔

یرڈینا اپنی لمبی پوروں سے آنکھوں کے گیلے کوشوں کو خشک کرتی۔یرڈینا سے زیادہ بھلا کون اِن جذبات کو سمجھ سکتا تھا۔سٹی میئر Shabtai Levy شیبتـــــی لیوی سے منصور کے دادا کی بہت یاری ہے۔چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ سلسلہ گفتگو پھر جوڑتی۔وہ کئی دوسرے لیڈروں کے ساتھ میرے گھر آئے۔میں نیچے تہہ خانے میں اپنے ملازموں کے ساتھ بند تھی اور یہ طے کیئے بیٹھی تھی کہ مجھے یہاں سے نہیں نکلنا۔یہ گھر مجھے وراثت میں ملا ہے۔یہاں میں نے جنم لیا اس کے کمروں میں میرا بچپن اور جوانی گزری۔اِن کمروں میں میرے بچوں کا بچپن محفوظ ہے۔یہیں میرا چچا مفتی فلسطین امین الحسینی ٹھہرتا تھا۔غربی طرف پہلے ہاتھ کا دوسرا کمرہ اسی کیلئے مخصوص تھا۔

میں زمیندار کی بیٹی ہوں۔زیتون اور نارنگیوں کے باغوں کی رکھوالن ہوں۔میرے باغوں کے سنگتروں کی سنہری رنگت،اُن کی مٹھاس اور اُن کی پھانکوں کی صحت کا کہیں کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔زیتون کا پھل میری انگلیوں کی پوروں میں کچلنے کے ساتھ میرے اوپر تیل کا راز کھولتا تھا۔زیتون کے پیڑوں کو کن حفاظتی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے اپنے کامیوں کو میں بتاتی تھی۔اس پھل سے میری محبت ہے۔پھل توڑ کر منوں کے حساب سے گھر آتا تو کولہو سے تیل نکلوانے اور مارکیٹ میں بھیجنے تک کے سب مرحلوں کو خود دیکھتی۔

اُنہوں نے اپنا سر اُٹھایا۔اُمنڈے ہوئے آنسوؤں کو پھر واپس لوٹانا چاہا۔

شہر میں غدر مچا ہوا تھا۔بحیرہ روم کے ساحل پر ہزاروں لوگ مہاجر بنے پڑے تھے۔وہ کشتیوں،لانچوں اور سٹیمروں کے منتظر تھے کہ جو انہیں کسی عافیت کی جگہ پر لے جائے۔لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوتا تھا کہ عرب فلسطینی اپنے گھروں کو خالی کر دیں شہر چھوڑ دیں۔

معتدل یہودی رہنما کہتے تھے کہ عربوں کو وہاں سے نکالنے کا سلسلہ بند کریں۔صُلح پسند یہودی بھی زور دیتے تھے کہ عرب اپنی دوکانیں کھولیں۔نارمل زندگی کا آغاز کریں۔

ایموس اُن دنوں بیمار تھی اور تم لوگ اُسے دیکھنے انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ مما جس کسمپرسی میں فوت ہوئیں اُس نے مجھے دنوں ہوش نہیں آنے دیا۔فلسطین بھی زیست کی اسی کشمکش میں تھا۔ریڈیو پر یہودیوں اور عرب لیجن میں لڑائی کی خبریں سُنتی تھی اور دہلتی تھی کہ جہاں پناہ ڈھونڈی ہے وہاں بھی آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔اموس یہاں آنا نہیں چاہتی تھی مگر دانہ پانی مجھے پھر اس جہنم میں لے آیا کہ مجھے

کہیں چھت ہی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔

میرا احیفہ تو کبھی ایسا نہ تھا۔یہاں عیسائی، یہودی، مسلمان سبھی تھے۔یہاں غیر مُلکی کتنے تھے۔یہ شہر کتنا قدیم اس کی ایک ایک اینٹ کے نیچے ہزاروں سال کی تاریخ دفن ہے۔

اور جب وہ گریہ کناں تھیں یائل منصور کو ڈھونڈتی بالائی منزل کے ٹیرس پر آئی اور منصور کو کتابوں میں جُتے دیکھ کر چلائی۔"اُف منصور یہاں کتابی کیڑا بنے بیٹھے ہو۔میں نے نیچے اُوپر ہر جگہ تمہیں ڈھونڈ مارا"۔

زندگی کی توانائی سے بھرپور یہ آواز جیسے منصور کے رگ و پے میں خوشی و سرشاری دوڑاتی اُس کی سیاہ خوبصورت آنکھوں میں دیئے سے جلاتی اس کے چہرے کو پھول کی طرح کھلاتی محسوس ہوئی تھی۔

منصور نے ہنستے ہوئے کیمسٹری کی کتاب سے سر اُٹھایا اور بولا۔

"یائل مجھے بتاؤ۔ہمارے گھر کا کون سا ایسا گوشہ ہے جو تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہے۔تمہاری بلّی کی سی آنکھیں پل بھر میں کونے کھدروں تک میں چھپی چیزوں تک پہنچ جاتی ہیں۔آج کیا مسئلہ ہوا؟

"شرم کرو میری آنکھیں بلّی جیسی ہیں۔معلوم ہے میں تمہارے لئیے تاہینا اور چکن والا فلافل لے کر آئی تھی ممّی نے بنائے تھے۔پورے تین لائی تھی کہ ایک دو سے تو تمہارا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔مگر اب میں نے تمہیں اس کی ایک بائٹ bite بھی نہیں دینی۔"

"مت دینا۔میں بھی تمہیں روتھ اور ایڈمنڈ کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے متعلق کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"ہیں۔یہ اُلو کی پٹھی روتھ ایڈمنڈ سے پھر اُلجھی تھی اور اُس نے اس کی تواضع نہیں

کی۔ دیکھو اس سٹوپڈ ایڈمنڈ نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا۔ کیا ہوا تھا؟''

''مجھے کیا پتہ۔'' منصور نے ہنستے ہوئے سر جھکا لیا۔

یائل آگے بڑھی۔ منصور کو پیشانی کے بالوں سے پکڑا اور اُس کا چہرہ اُوپر اُٹھاتے ہوئے بولی۔

''نہیں بتاؤ گے مجھے۔ سارے بال ابھی نوچ ڈالوں گی۔''

منصور ہنس رہا تھا۔

''بتاتا ہوں یائل بتاتا ہوں۔ خدا کیلئے میرے بال چھوڑو۔''

یائل نے انہیں ایک جھٹکا دیا۔

''خدا کیلئے یائل۔'' منصور چلّایا۔

''چلو مجھے فلافل تو دو۔''

یائل نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنا اُون اور دھاگے کے پھولوں سے بنا بیگ میز پر رکھا اور پیتل کے قلعی شُدہ لنچ باکس میں سے ٹھنسا ہوا فلافل نکالا اور اُسے کاغذ میں لپیٹ کر منصور کو تھمایا اور بولی۔

''منہ میں ٹھونسنا بعد میں پہلے مجھے بتاؤ۔ ہاں تمہارا ٹرپ trip گیا کہاں تھا؟ ویسے تم اور ایڈمنڈ ہو بڑے فضول۔ کوئی بات ہی نہیں بتاتے ہو۔''

منصور نے کیمسٹری کی کتاب اُٹھا کر ایک طرف کی۔ فلافل کو ہاتھوں میں پکڑتے اس کی بائٹ bite لیتے ہوئے اُس نے آنکھیں بند کیں۔ جُھوما۔

''یائل! یر ڈینا آئی ونڈرفل wonderful۔ اتنا مزے کا فلافل۔''

یائل کا چہرہ غصّے سے تپنے لگا تھا۔ اُس کے ہاتھوں سے فلافل چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے گرجی۔

''مجھے طیش دلا رہے ہو۔''

وہ ہنسا ''دیکھو پائل یہ اتنا لذیذ ہے۔ مجھے تھوڑا سا اور کھا لینے دو۔ پھر تمہیں ساری تفصیل بتاتا ہوں۔''

فلافل کی آخری بائٹ bite کو منہ میں ڈالتے اور اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اُس نے پائل کو دیکھا اور کہا۔

''کیا مزے کا تھا۔''

''تم اب مزے لیتے رہو گے یا مجھے کچھ بتاؤ گے بھی۔''

بتاتا ہوں یار بتاتا ہوں۔ ہوا کے گھوڑے پر ہر وقت سواری مت کیا کرو۔ ہمارا ایجوکیشنل ٹرپ ویلی ریجن گیا تھا تو وہاں گیلی بیت الحم کے گاؤں میں کسی بات پر البرٹ، ایگا، زیریان، جوڈی بلانک اور جونسن سموئیل میں جھگڑا ہو گیا۔

منصور کے چہرے پر تاسف اور دُکھ کا خفیف سا عکس بکھر گیا۔ وہ طنزیہ ہنسی ہنسا اور بولا۔

دراصل سارا رولا مصیبت مارے احساس برتری اور تاریخ پر غلبے کا ہے۔ خدا کی محبوب تخلیق یہودی باقی قومیں اور مذاہب خود ساختہ اور کوڑا کباڑ۔ ہزاروں سال قبل کے اِس گاؤں کے ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی ورثے میں لیزا کسی قوم کا حصہ ڈالنے کیلئے تیار نہیں تھی۔ نہ مسلمانوں کا نہ عیسائیوں اور نہ ہی آرمیناؤں کا۔ سچی پائل یہ لیزا اتنی فضول اور متعصب ہے کہ اگر جوڈی آ کر اس مسئلے میں مداخلت نہ کرتی تو وہاں سر پھٹول ہو جاتا تھا۔

اُس نے شور کر کے بیس لوگوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے جوڈی کس قدر سادی اور بھولی بھالی ہے۔ وہ ایڈمنڈ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اُس نے چلا کر کہا تھا۔

''لیزا تم ہر بات میں مذہب کو کیوں گھسیٹتی ہو؟''

سچ تو یہ ہے پائل میرا تو موڈ آف ہو گیا تھا۔ایک تو اتنی تاریخی، رومان بھری اور فطرت سے لبریز فضائیں۔اُوپر سے تمہاری عدم موجودگی۔میں تمہیں مس Miss کر رہا تھا۔جی چاہتا تھا تم ساتھ ہوتیں تو کتنا مزہ آتا؟ تب شاید میں اُس قدیم تعمیری ورثے سے تمہارے ساتھ واقعات کو شیئر share کرتے ہوئے زیادہ لطف محسوس کرتا۔

''تم نے مجھے مس Miss کیا جھوٹے کہیں کے۔''

پائل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ہنسنے سے اُس کے خوبصورت رخساروں پر جو گڑھے پڑتے تھے منصور انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو۔''

منصور اُس کا صبیح چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنا ماتھا اس کی پیشانی سے ٹکراتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''بتاؤ میں جھوٹا ہوں؟''

پائل تیز طرار منہ پھٹ مگر سمجھدار اور ذہین لڑکی تھی۔اپنی عمر سے زیادہ میچور mature تھی۔پر منصور کے یوں دفعتاً اتنا قریب آجانے سے سٹپٹا سی گئی۔منصور کے سوا اُسے کوئی لڑکا اچھا نہ لگتا تھا۔کسی کے بال اُسے ناپسند تھے، کسی کی آنکھیں، کسی کا قد، کسی کا بولنے کا انداز۔اُس سے تو کچھ بولا ہی نہ گیا۔اوائل جوانی کے جذبات سارے وجود میں سنسناتے ہوئے دوڑنے لگے تھے۔کوئی ملازم اُوپر نہ آجائے جیسے خوف نے منصور کو محتاط کر دیا۔آہستگی سے پیچھے ہٹتے ہوئے اُس نے کہا۔

پائل میں نے تمہیں اتنا یاد کیا تھا کہ اگر یہ کہوں کہ ہزار کی گنتی میں ہوگا تو مانوگی۔

''مانوں گی۔''اُس نے بوجھل سے لہجے میں کہا۔''جب تم ابھی حیفہ نہیں آئے تھے تو میں بھی تمہیں ایسے ہی یاد کرتی تھی۔لیکن اب تم نے امریکن یونیورسٹی بیروت چلے جانا

ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ تم نے بھی تو وہیں آنا ہے۔میڈیکل تو تمہیں بھی کرنا ہے۔''

''نہیں مجھ سے اتنا پڑھا نہیں جاتا۔ٹُپر مدر مجھ سے بہت ناراض رہتی ہیں۔''

تبھی نیچے سے منصور کی پکار پڑی۔وہیں جنگلے سے عباس (نوکر) کی بات کا جواب دے کر پلٹا جب پائل نے کہا۔

''تم جانتے ہو لیزا نے مجھ سے چند دن پہلے کیا کہا تھا؟''

''کیا؟''منصور کی خوبصورت آنکھیں اُس کے چہرے پر جم گئیں۔

تم ٹھیک کہتے تھے منصور لیزا واقعی بہت کمینی ہے۔مجھے طعنہ دی رہی تھی کہ جب منصور چلا جائے گا تو کیا کروگی؟ میں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

''ارے بھائی کرنا کیا ہے؟ میں بھی بیروت چلی جاؤں گی۔''

اور وہ پاگلوں کی طرح ہنسی۔

''تو تم نے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑنا۔''

''کیوں تم نے قابو کرنا ہے اُسے؟''

''تم تو لعنتی ہو۔کوئی (غیر یہودی) سے شادی کروگی۔''

''کوئی کیا انسان نہیں۔''میں نے چلاّ کر کہا۔

''زندہ باد پائل۔یہ کی نہ بات۔''منصور چہکا۔

دسترخوان سارہ کے کمرے میں ہی بچھا تھا۔باہر بکھری سونے رنگی دھوپ نے کمرے کی بلند و بالا مخروطی رنگین شیشوں والی کھڑکیوں کے رنگوں کو بہت چمک دار اور خوبصورت بنانے کے ساتھ ساتھ کمرے کے فرش پر جا بجا اس کی نقاشی کر دی تھی۔اِس کمرے کی چھت درمیان میں گنبد نما تھی۔آدھا کمرہ ترکی کے شہر ازمیر کے مہنگے چنبیلی رنگی

زمین پر بکھرے رنگین پھول پتیوں سے سجے قالین سے بھرا ہوا تھا اور اسی پر وہ سب دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔

اُمّ غسان سبزیوں کی مختلف انداز میں ڈشیں بنانے اور سجانے میں بڑی ماہر تھی۔ پیتل کی بڑی پلیٹ میں گوبھی کے پھول، بینگن کے قتلے، گاجروں کی قاشیں، توریوں کی پھانکیں عمدگی سے فرائی ہو کر سجی تھیں۔ پودینے اور سلاد کے پتوں کے ساتھ ہر سبزی اپنی اصلی رنگت کے ساتھ بہار دکھاتی تھی۔ دوسری پلیٹ میں سبزیاں اچار میں بنائی گئی تھیں۔ چاندی کی بڑی سی ڈش جس کی کندہ کاری بغدادی کاریگروں کی مرہون منت تھی مقلوبے سے سجی تھی۔ پتیلے کی صورت لیے چاولوں اور گوشت کا یہ چوکور پہاڑ بھی اپنی صورت گری میں ایک انفرادیت لیے ہوئے تھا۔ سبھی سینی کے گرد بیٹھے تھے۔ ضالیہ اور ریڈینا کے درمیان پائل تھی۔ سارہ کے ساتھ منصور بیٹھا تھا۔ ایڈمنڈ اپنی پھوپھی کے پاس یروشلم گیا ہوا تھا۔ گھر کے ملازم بھی دسترخوان پر ساتھ ہی بیٹھتے تھے مگر آج کچن میں اتنا برتنوں کا کھلارا پڑا ہوا تھا کہ اُم غسان اُسے سمیٹنے میں رہی۔

گاڑھے قہوے کی چسکی بھرتے ہوئے سارہ نے بہو کو دیکھا اور کہا۔

ضالیہ ڈیوڈ کا کھانا بھیجنا مت بھولنا۔

باب نمبر: ۷

منصور بہت دن گزرے تمہارا خط نہیں ملا ۔یقیناً تم مصروف ہوں گے ۔میری آنکھیں دیکھتی ہیں تمہارے اردگرد کتابوں کا ڈھیر ہوگا۔میں جانتی ہوں اس ڈھیر میں جب تم گھر جاتے ہوتو تمہیں سب کچھ بھول جاتا ہے حتیٰ کہ میری صورت بھی ۔تم لاکھ میری اس بات کی تردید کرو۔حتمی مگر زوردار انداز میں کہو۔

نہیں ہرگز نہیں ۔یا ئل ایک تو تم قیاس آرائیوں میں بڑی ماہر ہو۔اس اژدہام میں یہ مَیں ہی تو ہوں جو کبھی کتابوں کے صفحات پر جھلکیاں مار کر تمہیں بے چین کرتی ہے۔کبھی لکھتے لکھتے تمہارے قلم کو روک کر تمہیں مضطرب کردیتی ہے۔اب اگر تمہاری یاوہ گوئیوں پر یقین کرلوں تو پھر پوچھتی ہوں کہ بے چینی کو تو فوراً تم سے خط لکھوانا چاہیے تھا۔

تمہیں یقیناً عربی میں لکھے گئے میرے اس خط کو دیکھ کر تعجب ہوا ہوگا۔مجھے اس زبان کو تحریری طور پر سیکھتے ہوئے مزا آیا۔عبرانی بھی تو سیکھنی پڑی۔دونوں میں کچھ چیزیں مشترکہ ہیں ۔کاش کہ دونوں کے بولنے والوں میں بھی بہت زیادہ نہ سہی تھوڑی سی محبت اور تھوڑا سا اشتراک ہوجائے ۔یوں ابھی کچھ خاص مہارت تو نہیں ہوئی۔بس دال دلیہ والی بات ہے لیکن اخبار پڑھنے سے میں عام آدمی کی سوچ سے ضرور آگاہ ہورہی ہوں جو شاید دوسری صورت میں ممکن نہ ہوتا۔

یوں یہ بات ضرور ہے کہ میں ایلیزر بن یہودا Eliezer Ben Yehuda کی عبرانی جیسی اٹھارہ صدیوں سے نہ بولنے والی مردہ زبان کو اتنی متحرک اور فعال بنا دینے کی کاوش کو تحسین کی نظر سے دیکھتی ہوں۔

ہاں منصور انسانی رویوں کے تضادات اب بھی ہمیشہ کی طرح مجھے بہت متاثر کرتے ہیں اور میں اپنے بچپن کی طرح اب بھی مما کے سمجھانے کے باوجود خاموش رہنے کی بجائے اُن پر خوب بولتی ہوں۔گذشتہ دنوں میری پھوپھی پولینڈ سے یہاں شفٹ ہوئی ہیں۔مغربی یروشلم کی مامیلا کالونی میں انہیں گھر ملا ہے۔وہی مامیلا جہاں یروشلم کے مسلمانوں کا قدیمی تاریخی قبرستان تھا۔بے شمار علماء اور صوفیاء سے بھرا ہوا۔جس پر بلڈوزر چلے اور شاندار بستی تعمیر ہوگئی۔

وہاں شفٹ ہونے سے قبل وہ ایک ماہ ہمارے پاس رہیں۔ممی ڈیڈی خیر تو بڑے لبرل اور سیکولر لوگ ہیں۔پر ہماری وہ پھوپھی جن کا ایمان اس بات کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کہ دُنیا بھر کے یہودیوں کیلئے لازم ہے کہ وہ ارض موعود پر یورش کریں۔یہ اُن کے باپ دادا کی میراث ہے اور جب میں نے اُن سے بحث کرنی چاہی انہوں نے تین ہزار سال کی تاریخ کا میرے سامنے ڈھیر لگا دیا۔

''ارے یہ فلسطین کب ہے؟ یہ تو کنعان ہے۔ہم اسرائیلی جنہیں یہ فلسطینی عبرانی کہتے ہیں۔یہ تو مسیح سے بھی کہیں پہلے یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔کتنا دربدر پھرے ہم۔کتنے ظلم سہے۔کس کس قوم نے ہماری نسل کشی نہیں کی؟ صدیوں پر پھیلی تاریخ کھول کر دیکھ لو۔کہیں فرانسیسیوں نے، کہیں ان اچکّے روسیوں نے۔یہ منحوس مارے انگریز جنہوں نے ہمیں زمینیں خریدنے اور کاشت سے روکا۔ہنری دوم اور سوم نے ہم سے لاکھوں پونڈ بھی لیے اور ہمارے ماتھے پر شناخت کا ٹیکا لگوا کر ہمارا عام لوگوں کے ہاتھوں پٹڑا بھی کروایا۔یہی اُس کمینے فرانس کے شاہ فلپ نے کیا۔یہودیوں کو جیلوں میں بھی ٹھونسا۔اُن سے پیسہ بھی لیا اور انہیں دیس بدر بھی کیا۔پرتگالیوں کے بھی رویے ایسے ہی تھے۔جرمنوں کمینوں نے سبھوں کو مات دے دی۔اِن کے عیسائی پادری تو حلفیہ اقرار کرواتے۔

''میں نجس یہودی ہوں۔میرے آباء نے سچے مسیح کو صلیب پر چڑھایا''۔

یہ بدخُو پولش بھی اول درجے کے ہڈحرام۔ پیسہ بھی ہم سے لینا، ادائیگی بھی نہیں کرنی اور نزلہ بھی سارا یہودیوں پر۔ایسے بدبخت اُوپر سے نعرے۔یہ یہودی ہمارا خون چوس رہے ہیں۔دیکھو تو کیسے عالیشان گھروں کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔جلاؤ ان کے گھر۔تباہ کرو ان کی کالونیاں۔

اگر بے لاگ بات کروں تو یہ ہمارے عظیم سائنسدان ڈاکٹر ہیم ویزمین کا احسان ہے ہم پر کہ جس نے اپنے کیمیائی رازوں کی برطانیہ سے سودے بازی کی۔جنگ سے نڈھال برطانیہ کو تو جیسے خزانہ مل گیا۔ایسے ہی اُسے جنگ میں برتری نہیں ملی تھی۔روس نے بھی ہم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔کاروباری فراست ہماری قوم کو قدرت نے ودیعت کی ہے۔توڑ جوڑ اس کی گھٹی میں ہے۔غیر معمولی ذہانت و فطانت یہودی قوم کے انعام ہیں۔من وسلویٰ جیسا تحفہ بھی یہودی قوم کیلئے ہی آسمانوں سے اُترا۔اب تو میں جلتی ہیں تو بھئی جلو۔سچ تو پھر یہی ہے کہ ہم ہیں ہی خدا کے لاڈلے۔

بھلا مجھ سے صبر ہوتا میں بول اُٹھی تھی۔

''اگر سچی بات کہوں ڈھوڈا (عبرانی میں خالہ، چچی، ممانی) تو سُن لیجئے۔بُرا نہیں منانا۔حقیقت یہ ہے یہ یروشلم تو نہ آپ کا ہے اور نہ مسلمانوں کا۔ہاں آپ اِسے عیسائیوں کا کہہ سکتی ہیں۔یہودیت نے صحرائے سینا میں جنم لیا۔اب کوہ صیہون کیسے معتبر ہو گیا؟ کوہ سینا کیوں نہیں جہاں کتاب ملی اور خدا سے کلام بھی یہیں ہوا۔مسلمانوں کا تو براہ راست تعلق حجاز سے ہے۔بس ایک یاد کا واسطہ ضرور ہے۔البتہ عیسائیت یہاں پیدا ہوئی۔

ڈھوڈا تو تلملا اُٹھی۔''یہ تم تاریخ دان کب سے ہو گئی ہو؟''

''مجھے تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔''میں تو اُن کے تلملانے جھلانے سے محظوظ

ہوئی تھی۔

''ہاں ڈھوڈا آپ نے مسلمانوں کے کردار پر گل افشانی نہیں کی۔عثمانی سلاطین کے بارے میں کیا رائے ہے؟''

''ارے ہٹاؤ انہیں سارے زمانے کے اُجڈ اور گنوار۔کب سے قبضہ کیے بیٹھے تھے؟''

مما نے مجھے آنکھ سے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔

سچی بات ہے گھر میں عذاب آیا ہوا ہے۔یوم کپور کو بھی انہی دنوں آنا تھا۔ہم نے تو کبھی اس کا خصوصی اہتمام نہیں کیا تھا۔اب ممی تھوڑا بہت تو خیال کرنے لگ گئی ہیں کہ وہ لوگوں کی فضول بحث وتکرار سے گھبرانے لگی ہیں۔ڈیڈی کی اس بات کی وہ اب قائل سی ہو گئی ہیں کہ دُنیا داری بھی ضروری ہے مگر قاعدہ قرینہ اور ترتیبی عناصر کا ابھی بھی فقدان ہے۔

ہم یہودیوں کے عقیدے کے مطابق یہ توبہ استغفار کا دن ہے۔ماضی کے گناہوں سے توبہ کا دن،حال کیلئے زیادتی اور ظلم نہ کرنے کا عہد۔گناہوں اور اپنی زیادتیوں کا اعتراف۔

میری زبان تو تم جانتے ہی ہو سدا کی لُتری ہے بولنے سے باز نہ رہ سکی۔

ساری یہودی قوم کو اُن بیچارے فلسطینیوں سے معافی مانگنی چاہیے جنہیں انہوں نے دیس نکالا دیا ہوا ہے اور اُن کیلئے مغفرت کی دُعا مانگنی چاہیے جنہیں انہوں نے گولیوں سے بھون دیا۔دیر ویاسین ابھی بھی میری یادداشتوں میں محفوظ ہے۔

میری پھوپھی تو جیسے سان پر چڑھ گئیں۔

''ارے ہم نے اپنا حق لیا۔زمینوں پر ناجائز قبضہ نہیں کیا بلکہ اس کی قیمت دی اور یوں بھی ہمارے مذہب میں غیر یہودی کا قتل جائز ہے۔''

میں جواباً پھر کچھ سُنانا چاہتی تھی پر مما مجھے گھور رہی تھیں۔ مجھے اُن پر شدید غصہ آیا۔انہوں نے آنکھوں کے اشاروں سے میری مت ماردی۔ میری پھوپھی نے مجھ پر دہریئے ہونے کا لیبل label چسپاں کر ہی دیا۔کس تنفر سے انہوں نے ممی کو مخاطب کیا۔

''یرڈیناتم نے تو اس کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ایڈمنڈ کیسا ہے؟ وہ بھی اِس جیسے خیالات کا ہی مالک ہوگا؟ تم لوگوں نے تو تیّا ہی ڈبو دی۔اپنے مذہب کو کوڑا کر دیا ہے۔ابھی تو شکر ہے کہ ان کے قیام کے دوران ضالیہ آنٹی کے ہاں سے کوئی نہیں آیا اور نہ ہی ہم لوگ اولڈ حیفہ گئے۔وگرنہ تو سارا الزام یوسف فیملی پر دھرا جانا تھا۔

میرے فائنل ٹیسٹ سر پر۔سپر مدر راحیز تو ویسے ہی مجھ سے شدید نالاں۔میری صورت پر نظر پڑتے ہی ان کی لعن طعن عین اپنے عروج پر۔

''تمہارا تو دیدہ ہی پڑھائی میں نہیں۔فزیالوجی کے نمبروں کو دیکھو۔مر مر کے پاس ہونے والی بات ہے۔یوں تمہاری ماں کو تمہیں ڈاکٹر بنانے کی شدید تمنا ہے۔یا ئل تم قطعی سنجیدہ نہیں تمہارے ممی ڈیڈی سے بات کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔وہ بھی کسی بات کو ڈھنگ سے نہیں لیتے۔''

اب ایسے میں کتابیں پکڑتی ہوں پر سارے گھر میں اُدھم مچا ہوا ہے۔سفید پینٹ پالش۔گھر کے باہر تعویز کی موجودگی یقینی۔سفید کپڑوں کا اہتمام۔چمڑے کے بغیر جوتوں کی فراہمی۔ہمارے پاس گذشتہ سالوں کے خریدے ہوئے کچھ جوڑے پڑے تھے۔ایک پر کہیں چمڑے کی چھوٹی سی پٹی بھی تھی۔مما اُسے ہی پیروں میں اُڑس لیتی تھیں۔

''اُف''

کہتے ہوئے انہوں نے اپنی لانبی سی ناک نخوت زدہ انداز میں سکوڑی اور اُسے اُٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا کہ ہم ایسے ممنوعہ کاموں سے اپنے دین کو بھرشٹ کرتے

ہیں۔

منصور تمہیں یقیناً یاد ہوگا جب ہم یروشلم میں تھے۔ رمضان کے مہینے میں بہت گرمی تھی اور مجھے ضالیہ آنٹی کا نڈھال سا چہرہ، پپڑیاں جمے اُن کے ہونٹ دیکھ کر کوفت ہوتی۔

''مائی گاڈ ضالیہ آنٹی آپ کا چہرہ پچک گیا ہے۔ آپ کے ہونٹ کتنے پیاسے ہیں؟ آپ پانی پی لیں۔''

ضالیہ آنٹی ہنستے ہوئے میرے دونوں رخساروں پر پیار کرتے مجھے محبت اور نرمی سے سمجھاتیں اور میں قائل ہو جاتی۔ مگر یہاں ضد، ہٹ دھرمی اور انتہاپسندی کے جو مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں وہ میرا خون جلاتے ہیں۔ میں اپنے ڈیڈی ڈیوڈ کی اِس بات سے سوفی صد اتفاق کرتی ہوں کہ یہودیوں نے بہت سی فضول پابندیاں اپنے اُوپر از خود ہی مسلط کرلی ہیں مگر اب میری پھوپھی کو یہ سب کون سمجھائے۔

منصور یہ تھوڑی کہ میں یہ سب باتیں پہلی دفعہ کر رہی تھی یا اپنے گھر میں ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بس اس کی اِس درجہ شدت اور میری ذہنی بلوغت مجھے بار بار سوال جواب پر اُکساتی تھی۔

اور ہم جب سب Kittel (سفید لباس) پہنے شینی گاگ میں پاس پاس کھڑے نرسنگھے کی آواز سنتے پھر کتاب احبار Leviticus میں سے باب نمبر 23 کی آیت نمبر 27 پڑھتے تھے۔

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو کفارے کا دن ہے۔

میں نے خود سے پوچھا تھا لاکھوں یہودی یوم کپور منا رہے ہیں۔ کیا وہ خود سے

پوچھتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟

شیئنی گاگ جانے سے قبل مما نے دو موم بتیاں جلا کر کمرے میں رکھ دی تھیں ۔کھڑکی کا ایک پٹ جانے کیسے کھلا رہ گیا اور جب وہ شیئنی گاگ میں آنکھیں بند کیے دعائیں مانگتی تھیں یکدم وہ میری طرف پلٹی تھیں اور مضطرب سے لہجے میں بولی تھیں ۔

''یائل مجھے کھڑکی بند کرنی یاد نہیں رہی تھی ۔تیز ہوا سے موم بتیاں بجھ نہ جائیں ۔''

میں نے اپنی ماں کو دیکھا تھا سفید لباس میں وہ کس قدر دلکش لگ رہی تھیں ۔میں نے اُن کا ہاتھ دبایا اور دھیرے سے سرگوشی کی ۔

''تو کیا ہوا ۔قیامت آجائے گی ۔ریلیکس relax ہوں ۔''

مما میرے اور ایڈمنڈ کیلئے کتنی فکرمند رہتی ہیں ۔

یوم کفارہ کی تاریخ ستمی اور کول نڈری کی بھی ۔کچھ فائدہ نہیں ۔

ڈیڈی ریڈیو پر خبریں سُن رہے تھے اور کچن میں اہتمامی کھانا پک رہا تھا اور روزہ رکھنے میں اگر خدا کو صبر و قناعت کا کوئی سبق دینا مقصود ہے تو اُس سبق کو حاصل کرنے کیلئے مما قطعی طور پر بیزار اور کوفت زدہ نظر آتی تھیں کہ انہیں بھوک بہت لگ رہی تھی اور وہ بستر پر لیٹی ہوئی بار بار وقت دیکھتی تھیں ۔

کچن میں کام کرتی کارمیلا سیونا (نانی دادی) حریب کی پھلیاں کاٹتے ہوئے میری پھوپھی کی لن ترانیوں کے ساتھ ساتھ خود پر لگنے والے سُست اور لاپرواہ جیسے اعتراضات و الزامات بھی خاموشی سے سُنتی چلی جاتی تھی ۔اندر کمرے میں مما میری طرف دیکھتے ہوئے دکھ سے کہتی تھیں ۔

''اب کتنی بار اسے بتاؤں کہ ڈھائی پسلی کی یہ عورت جس کی اندر کو دھنسی آنکھوں میں زمانے بھر کی ویرانیاں ڈیرے ڈالی بیٹھی ہیں ۔کیسی مظلوم اور بے بس عورت ہے؟ منصور

تم ابھی کارمیلا سیوتا سے نہیں ملے۔اُسے ہمارے پاس آئے ابھی سال نہیں ہوا۔بڑی دل خراش داستان ہے بیچاری کی۔سفاردی یہودی ہے۔آباؤاجداد سپین سے نکالے جانے کے بعد تیونس آئے۔وہاں سے شام،شام سے فلسطین کے شہر رفید یہ۔

بیچارے وہاں بھی ٹھوکریں ہی کھا رہے تھے کہ کسی نے گلیلی جانے کا مشورہ دیا۔دیگانیہ گلیلی میں اجتماعی زرعی فارموں میں کام کرنا شروع کیا۔اتنی مشقت کے باوجود بھی غربت جان نہیں چھوڑتی تھی۔کارمیلا کا پردادا کیتھولک مشنری کی پُرکشش مراعات کا جان کر عیسائی بن گیا مگر دادا نے یہودیت کی طرف پھر واپسی کی۔کارمیلا کا باپ پڑھنے لکھنے کا شوقین،عربی گائیکی کا رسیا۔انتہا درجے کا غصیلا گانا شروع کرتا تو لگتا جیسے کوئی سرمدی نغمہ لحن داؤدی میں لپٹا دل کی دُنیا زیروزبر کرتا کہیں بلندیوں سے دھیرے دھیرے نشیب میں اُترتا آرہا ہو۔وہ شیبی گاگ میں عود بجاتے ہوئے حمدیہ نظمیں،نعتیں پڑھتا تو موسیقی میں تال کے درمیانی وقفوں میں لہراتے بل کھاتے سُر سُن کر لوگ گنگ سے ہو جاتے۔اِس باپ نے بیٹی کیلئے جوڑ کا پسند کیا وہ بھی ایسے ہی مزاج کا تھا۔غریب سا پر فنون لطیفہ کا شیدائی۔

کارمیلا سترہ سال کی عمر میں جس کے پلّے بندھی وہ قاہرہ میں ایک بک شاپ پر سیلزمین تھا۔کتابوں کا رسیا جس نے بیوی کو بھی اس چاٹ میں شامل کر لیا تھا۔کارمیلا تو پہلے ہی اِس ماحول کی عادی تھی۔شوہر اِس مزاج کا ملا تو زندگی کا لُطف بڑھ گیا۔تنگ و تاریک چھوٹا سا کرائے کا گھر۔اُوپر تلے تین بچے پیدا ہو گئے تھے۔کارمیلا کی صحت بھی کچھ اچھی نہ تھی پر دونوں میاں بیوی زندگی سے لُطف اُٹھانا جانتے تھے۔روکھی سوکھی کھاتے مگر کتابیں پڑھتے،گیت گاتے پلی پلی جوڑ کر کبھی تھیٹر اور کبھی اوپیرا ضرور دیکھتے۔

پھر یروشلم آگئے۔یہاں لنڈن جیوز ویلفیئر سوسائٹی نے انہیں لندن کے ایک مخیّر سر موزز مونٹی فوئیرے کے غریب یہودیوں کیلئے بنائے گئے خیراتی گھروں میں سے ایک

الاٹ کر دیا۔ کارمیلا نے سوچا بچے اب بڑے ہو گئے ہیں خود اُسے بھی کچھ ہاتھ پلّہ مارنا چاہیے۔ ابھی سوچ و بچار کی انہی چکروں میں تھی کہ ایک شام تینوں لڑکے اشکنز ئی کالونی کے عقب میں واقع گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلنے گئے۔ مخالف ٹیم عیسائی لڑکوں کی تھی۔ چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ سر پھٹول ہوئی۔ معاملہ سٹی بلدیہ کے قاضی کے سامنے پیش ہوا جس نے فیصلہ یہودی لڑکوں کے حق میں دیا۔ مگر عیسائیوں کے مشتعل ٹولوں نے رات کو یہودی کواٹروں میں آگ لگا دی۔

ایسی خوفناک آگ تھی کہ جس نے بیٹوں شوہر سبھوں کو نگل لیا۔ وہ بھی مہینوں اسپتال میں زیرِ علاج رہی۔ مسز گریٹا نے اپنے گھر رکھا وہ آسٹریا جانے لگی تو مما کو فون کیا۔ سویٹ مما فون پر ہی رونے لگیں۔

''بھیج دو اُسے۔ جافہ آنے والی گاڑی میں بٹھا دو۔ ڈیوڈ لے آئیں گے۔''

منصور میں تو اُن کا وسیع مطالعہ اور موسیقی پر ان کی دسترس جان کر حیران ہوتی ہوں۔ سارا دن کام میں لگی رہتی ہیں یا کتابیں پڑھتی ہیں۔ منصور اُن کی وجہ سے میں بھی عربی کے بہت سے نامور ادیبوں اور شاعروں سے متعارف ہو گئی ہوں۔ ڈھوڈا کے کمینے سے رویئے دیکھ کر اس پر ناک بھوں چڑھانے کی بجائے ردِّعمل کے طور پر خاموش سا بے رحم ہونے کا اظہار کرتی ہیں جو کم از کم مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ اور ایسے سمے کارمیلا مجھے سچ مچ بہت پیاری لگتی ہیں۔

ہاں منصور سب سے اہم باتیں تو میں تمہیں سُنانا ہی بھول گئی۔ میرے خیال میں جو بہت دلچسپ بھی ہوں گی اور مزے کی بھی۔ اپنے گھر سیٹ ہونے سے قبل میری پھوپھی کا یروشلم، ہیکل سلیمانی کے دیدار اور دیوارِ گریہ پر جانے کی شدید خواہش میرے خیال میں ہر اُس عام یہودی کی طرح ہی تھی جس کا ایمان اِن کی دید اور نظارے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا مگر

اُن کی یہ خواہش میرے لیے بڑی بابرکت ثابت ہوئی۔

''تم بھی چلو میرے ساتھ۔''

اُس دن وہ بڑے موڈ میں تھیں۔اُن کی اِس پیشکش پر میں نے سوچا۔اگر جاتی ہوں تو جدّی سے ملاقات ہو جائے گی۔کتنے سال ہو گئے ہیں انہیں دیکھے ہوئے۔مما سے تنہائی میں بات کی تو انہوں نے کہا۔

''دفع کرو یائل۔تم ملنے جاؤ گی تو فضول باتوں کے پلندے کھڑے کر دے گی اور ڈارلنگ تم جانتی ہو کہ اُس سے اُلجھنے سے میری جان جاتی ہے۔مگر میں کیا کرتی میرا تو اپنا دل بھی جانے کو مچلنے لگا تھا۔

''ارے مما آپ کیوں گھبراتی ہیں؟مجال ہے جو اس کے فرشتوں کو بھی خبر ہو۔ میں واپسی پر ان کے پاس جاؤں گی۔''

ٹرین حیفہ Jaffa سے یروشلم جاتی ہے۔پتہ نہیں ٹرین کا سفر اتنا مسحور کیوں کرتا ہے؟علی الصبح ہم حیفہ سے بس کے ذریعے جیفہ سٹریٹ پہنچے۔ٹرین اچھی تھی۔سفر کوئی تین گھنٹے کا تھا۔درمیانی فاصلہ تو کوئی 60 کلومیٹر کا ہے مگر چونکہ علاقہ پہاڑی ہونے کی وجہ سے گاڑی سست رفتاری سے چلی۔تاہم میں نے جی بھر کر سرسبز پہاڑوں اور زیتون و انجیر کے باغوں کی دید سے لطف اُٹھایا۔گھروں پر انگوروں کی بیلیں سوکھی پڑی تھیں اور انجیروں کے درختوں تلے پکی انجیروں کی چادریں سی بچھی ہوئی تھیں۔

سچی بات ہے یروشلم کا حُلیہ بگڑا پڑا تھا۔میلوں لمبی مورچہ بند اور خاردار تاروں میں تقسیم ہو گیا تھا۔مشرقی یروشلم اُردن کے پاس اور مغربی اسرائیلیوں کے پاس۔جگہ جگہ دونوں کی قائم کردہ فوجی چوکیاں جن کے اندر بندوقیں تانے بیٹھے فوجی۔سچی بات ہے تقسیم کے اِس بیہودہ اور غیر انسانی مظاہرے پر مجھے شدید دُکھ ہوا تھا۔منصور تمہیں یقیناً یاد ہو گا۔جیفہ

گیٹ کے سامنے بڑی سی کنکریٹ کی دیوار دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے تھے۔ مجھے آنٹی ایما یاد آئی تھیں۔ ہم اسی گیٹ سے نکل کر ان کے گھر جاتے تھے۔

''ہم کیا امن سے نہیں رہ سکتے تھے۔'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

دونوں حصّوں میں جانے کا واحد ذریعہ مینڈل بام گیٹ تھا۔ بار بار آپ کے کاغذات کی جانچ پڑتال آپ کو کوفت میں مبتلا کرتی ہے۔ ہمارے یروشلم والی گلی میں لیا نہ جو ہمارے ساتھ ہوپسکوچ Hopscotch کھیلا کرتی تھی اور میں تو اُس سے ہمیشہ ہی ہارتی۔ وہ مجھے کمرشل سینٹر میں ملی۔ سوکھی سڑی سی اس لیا نہ کو تو میں پہچان ہی نہ سکی۔ اُس نے پاس آکر جب مجھے متوجہ کیا تو میں بھی خوش ہوئی۔ بہت خوبصورت اور نکھری ہوئی تھی۔ کوئی تین ماہ پہلے بیاہ ہوا تھا۔ سسرالی گھر گیورات حنانیہ میں تھا جس کا عقبی حصّہ تقسیم میں اسرائیلی علاقے میں چلا گیا۔ کسی طرف سے کوئی ادائیگی کچھ بھی نہیں ملا۔ اس تقسیم نے خاندانوں کو کیسے متاثر کیا اس کی لمبی چوڑی تفصیلات اُس نے مجھے سنائیں۔

بن گوریاں بھی کم بخت ایک نمبر کا ضدی، ہٹ دھرم اور تعصب کی غلاظت سے اٹا پڑا انسان ہے۔ یروشلم کو تو سمو لچی نگل جانا چاہتا ہے۔ بھلا تمام دفاتر یروشلم منتقل کرنے کی ہدایات جاری کرنے کی کیا تک تھی۔ یواین ٹرسٹی شپ کونسل نے کہا کہ وہ ایسی زیادتیوں سے باز رہے۔ مگر ڈھٹائی کا وہ عالم کہ بھئی جو کرنا ہے کرلو وہ تو یروشلم سے اپنے دفاتر نہیں ہٹائے گا۔

ڈیڈی ایک دن باتیں کرتے تھے کہ غیر ملکی سفارت کار پریشان ہیں اور الجھن میں مبتلا ہیں کہ اگر وہ اپنی اسناد مغربی یروشلم جا کر پیش کرتے ہیں تو گویا یہ یروشلم کی متنازعہ حیثیت کو ختم کرنے کے برابر اقدام ہوگا۔ مگر وزیر خارجہ موشے شیریٹ Moshe Sharett نے اپنا دفتر یروشلم منتقل کیا اور اب ڈٹے بیٹھے ہیں۔

منصور مجھے تو دُکھ کے ساتھ ہنسی بھی آتی ہے۔تین مذاہب کے پیروکار جن کے دین انہیں پہلا سبق انسان سے محبت کا دیتے ہیں اور وہ ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور ایک دوسرے کا تخم مارنے میں جی جان سے مصروف ہیں۔

جدّی سے ملنا میرا بہت خوشگوار تجربہ تھا۔میں شارع الحم اُن کے دفتر چلی گئی۔وہ تو حیران ہی رہ گئے۔اس وقت اُن کے پاس عمائدین شہر کے چند لوگ بیٹھے تھے۔مجھے اپنی بانہوں کے کلاوے میں بھرتے ہوئے انہوں نے میرے بالوں پر متعدد بوسے دیئے۔

گفتگو مرحوم شاہ عبداللہ کے اُن خودغرض رویوں پر تھی کہ جنہوں نے فلسطینیوں کی ذاتی حیثیت کو ختم کر دیا تھا۔بے چارہ کتنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا تھا۔ڈیڈی ایک بار ذکر کرتے تھے کہ قبطی بشپ کے ہاتھوں یروشلم کے بادشاہ کی حیثیت سے اپنی تاجپوشی سے ابھی وہ بھرپور لطف بھی نہ اُٹھا سکا تھا کہ قتل ہو گیا اسی مقدس مسجد الاقصیٰ کے صحن میں اور قتل کرنے والا بھی ایک نوجوان لڑکا تھا شاید طالب علم تھا۔

مصر میں مفتی امین گفتگو میں مفتی امین الحسینی بھی زیر بحث آئے کہ جنہوں نے مصر میں فلسطین نیشنل کونسل کی صورت میں جلاوطن حکومت قائم کی تھی اس کے بارے میں سبھوں کا کہنا تھا کہ آخر کونسا اور طریقہ ہے کہ ہم دُنیا اور خاص طور پر اُردن کو بتائیں کہ ہم اُردن کی محکوم ریاست نہیں ہیں۔ہمارا اپنا تشخص ہے۔

لیکن اب مصر سے کیا اُمید کی جائے کہ وہ سویز کے معاملے میں اُلجھا ہوا ہے۔

میں نے سر کرسی کی پُشت سے ٹکاتے ہوئے لمبا سانس لیا تھا۔مجھے مصر اور سویز پر بہت کچھ یاد آیا تھا۔

ناصر کا اس بارے دوٹوک انداز اور رویّہ،اُس کی شعلہ بار تقریریں اور نہر سویز مصر کی ملکیت ہے جیسا موقف اختیار کرنے پر برطانیہ اور فرانس کے ساتھ اسرائیل بھی مصر کے

خلاف اِس فوج کشی میں شامل ہو گیا تھا۔حیفہ کے گلی کوچوں میں گونجتی آوازوں اور اسرائیلی اخباروں کی کرش مصر جیسی خبروں پر مجھے آج بھی یاد ہے ممی ڈیڈی نے اسرائیل کے لئے انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا کہ ایسی بڑھکوں کی ضرورت ہے بھلا۔جو ریاست بنی ہے اُسمیں امن اور سکون سے رہنا سیکھو۔جیو اور جینے دو کی پالسیاں اپناؤ۔جنگوں کے مارے اور امن کے ترسے ہوئے لوگوں کو مزید توپوں کے گولوں کے سامنے مت رکھو۔

اب بھلا سارے جزیرہ نما سینائی پر قبضہ کرنے ضرورت۔نہر سویز اور شرم الشیخ تک رسائی کیلئے کوششیں۔خدا کا شکر ہے کہ آئزن ہاور نے بن گوریاں کو ذاتی خط لکھ کر تنبیہ کی تو کہیں جوں تک نہیں رینگی۔گوریاں نے اپنے دل میں یقیناً کہا ہوگا۔

''کرتے رہو بکواس۔ہم نے وہی کرنا ہے جو اسرائیل کے مفاد میں ہے''۔

اب انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ ہربرٹ ہوور واشنگٹن میں اسرائیلی نمائندے کو تنبیہ کرتا ہے کہ بندے کے پتر بنو گر نہ اقوام متحدہ تمہارے خلاف پابندیاں لگائے گا۔

جنرل اسمبلی قرارداد منظور کر رہی ہے۔اور وہاں وہی ہٹ دھرمی۔حتیٰ کہ آئزن ہاور کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ٹی وی پر آئزن ہاور جارحانہ انداز میں سب دھمکیوں کو دہراتا ہے۔نہیں خالی کرو گے تو امریکہ نہ صرف اقوام متحدہ کی عائد کردہ پابندیوں کی حمایت کرے گا بلکہ سرکاری مدد کے علاوہ ذاتی چندوں کی ترسیل پر بھی پابندی عائد کرے گا۔

بن گوریاں چیخا چلایا۔تاہم امریکہ سویز بحران سے شاندار طریق سے سُرخرو ہو کر نکلا۔دنیا میں اُس کا وقار بڑھا۔امریکہ کا کردار ایسا ہی ہونا چاہیئے حق اور انصاف کیلئے۔میں اُس وقت عالمی سیاست کی اِن باریکیوں کو بہت اچھی طرح سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ڈیڈی نے تو دو ٹوک الفاظ میں کہا تھا۔

''سیدھی سی بات ہے یہ مصریوں کا حق ہے۔برطانیہ اور فرانس کی حرامزدگی ہے

اوراسرائیل کتنی کمینگی کر رہا ہے؟مصر اُس کا ہمسایہ ہے۔اُسے طاقت کے خمار سے باہر نکل کر حالات کو دیکھنا چاہیے۔میں یروشلم سے آرہا ہوں۔اس کے گلی کوچوں میں دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں اور فضا بہت مکدر رہے۔

منصور تم جانتے ہو میں ہوں تو جذباتی۔ چند دنوں بعد میں نے اپنی کلاس کی لڑکیوں سے یہ سب باتیں پورے جوش و خروش سے کیں ۔انہوں نے دھڑ سے مجھے مسلمانوں کی ایجنٹ بنادیا۔فلسطینیوں کی ایجنٹ۔

مائی فٹ My Foot کہتے ہوئے میں نے ذرا بھی کسی بات کی پرواہ نہیں کی۔ مجھے تپ تو چڑھی تھی۔گھر آ کر ممی ڈیڈی سے بھی اُلجھی۔کس نے کہا تھا آپ کو یہاں آنے اور رہنے کا۔یہاں بہت تعصب ہے۔

ڈیڈی نے ذرا دلداری کی۔

دراصل میری جان بڑی طاقتیں اپنے اپنے مفادات کے تابع ہوتی ہیں۔حق سچ اُن کیلئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

منصور میں نے چند چیزیں بہت شدت سے محسوس کی ہیں۔مسلمانوں کے علاقے میں ایک افراتفری اور بدنظمی کا احساس ملتا ہے۔دیواروں پر نعرے لکھے ہوئے ہیں۔اب چونکہ میں عربی پڑھ لیتی ہوں۔اس لیے انہیں پڑھنا اور سمجھنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ناصر یروشلم کے گلی کوچوں میں ہیرو بنا ہوا ہے۔اپنی قوم کیلئے وہ جو استقامت دکھا رہا ہے وہ بہت پسندیدہ ہے مگر اُسے یوں تل ابیب اڑانے کیلئے آوازیں دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟پرانے شہر کی دیواروں پر کہیں ناصر کو آنے اور تل ابیب کو اُڑانے کی ترغیب تھی کہیں۔صلاح الدین جیسے جیالے سالار کی ضرورت ہے۔حطین یا حطین جیسے معرکے ہونے چاہئیں۔ سچی بات ہے مجھے ان جذباتی نعروں نے ذرا متاثر نہیں کیا۔تدبّر اور فراست کا

مظاہرہ دونوں قوموں کیلئے بہت ضروری ہے۔ امن کیلئے اپنے حقوق کیلئے آواز اٹھانا اور دُنیا کو قائل کرنا ضروری ہے۔ جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں۔ دیواریں گندی کی ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر کاغذ اُڑتے پھرتے اور ریڑھیوں پر دھرے سامان کو بیچنے کیلئے اُونچی اُونچی آوازیں تھیں۔ گو یہ سب میرے بچپن کے منظر تھے مگر درمیان میں دُوری اور میری ذہنی بلوغت کے بہت سال تھے۔

شاید اسی لیے میں اُن کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی اور دیکھو منصور میں نے اپنے یہ سارے احساسات اور مشاہدات جدّی سے بھی کہے۔ انہوں نے میری باتوں سے اتفاق کیا اور کہا تعلیم کی کمی، نظم و ضبط کا فقدان اور فلسطین کیلئے عملی محبت اور خلوص کا مظاہرہ۔ ایسے کتنے عناصر ہیں جو ہم میں سے نہیں مگر وہ سب اسرائیلیوں میں ہیں اور وہ اسی لیے کامیاب ہیں۔ جدّی مجھے گھر لے آئے تھے۔ ہماری یادوں کا مشترکہ اثاثہ میرے سامنے تھا۔ نوکر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''کاش تم ہوتے! میں نے بے اختیار خواہش کی۔''

شام کو میں جدّی کے ساتھ امریکن سوسائٹی گئی۔ منصور ان لوگوں سے ملنا کیسا پُرلطف تجربہ تھا؟ یہاں مختلف قوموں اور مذاہب پر مشتمل یوروپی لوگوں کا ایک کلب club تھا جو عالمی بھائی چارے اور امن کیلئے ہمہ وقت سرگرم رہتا ہے۔ یہاں عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے سبھی تھے۔ جدّی کو انہوں نے چائے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ سچی بات ہے اِن متعفن ہواؤں میں مجھے تو وہ لوگ بہار کا جھونکا معلوم ہوئے۔ اُمید کی کرن۔ فلسطینیوں نے بے شمار اُمیدیں اُن سے وابستہ کرلی ہیں۔

شام کو میں جدّی کے ساتھ ریڈ کراس Red Cross کے دفتر گئی۔ جنین کے کیمپوں کیلئے باہر سے کچھ پیسہ جدّی کے پاس آیا ہوا تھا۔ وہ انہیں دینا تھا۔

وہاں سے سرکاری مدرسے میں حاضری دی کہ جدّی کو وہاں صدارت کرنی تھی ۔بچوں کے رویئے، اُن کی تقاریر، اُن کی نظمیں، اُن کے پیش کردہ خاکوں سبھوں نے مجھے مایوس کیا۔نفرت کی دیواریں بہت اونچی اٹھتی جارہی ہیں۔

صبح بہت خوبصورت تھی ۔موسم تھوڑا سا ٹھنڈا اور ابر آلود تھا۔ناشتہ جدّی نے میرے جاگنے کے بعد کیا ۔مدت بعد میں نے گرم تلوں والے حاجی کی دوکان کے کھائے ۔

مجھے ٹرین پر سوار کرنے خود جدّی آئے ۔میں نے منع بھی کیا۔منصور تم یقین کرو گے میں اِن رشتوں کی لذت سے نا آشنا۔ان کے اتنے محبت بھرے انداز پر میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر میرا ماتھا چوما۔میرے گالوں پر بوسے دیئے اور نئے چمکتے 500 فلسطینی پاؤنڈ کے پانچ نوٹ میری ہتھیلی میں پکڑائے ۔

''جدّی خدا آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے ۔آپ انسانیت کا فخر ہیں ۔میں نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور گاڑی نے رفتار پکڑ لی۔''

''ہاں ایڈمنڈ کیسا ہے ۔بہت ساری سہیلیاں بنالی ہوں گی اُس نے ۔پڑھنے سے زیادہ ان چکروں میں رہتا ہوگا۔اور تم نے تو اُس کے بارے میں کوئی ایسی بات لکھنے کی گویا قسم کھالی ہے ۔گاڈفادر God Father ہونا اُس کے ۔''

تمہاری پائل ۔

باب نمبر: ۸

اور یہی وہ دن تھے مکئی کے دانوں جیسے پُھولے پُھولے نکھرے نکھرے، روشن روشن جب اُسے خط ملا تھا۔ منصور نے لکھا تھا۔

''یائل تم بیروت آسکتی ہو؟ مصطفیٰ شیلابی کی گاڑی اور ڈرائیور تمہیں لے کر آئے گا۔''

اُس کی پیاسی نظریں گلابی شگوفوں جیسے رنگ کے کاغذ پر دوڑتی اور کہیں یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ کسی کونے کھدرے میں اندر باہر کچھ اور بھی لکھا ہوا ہے۔ پر دس پندرہ اور بیس بار کی نظر بازی کے باوجود صرف یہی اکلوتی لائن نظر آتی تھی۔ آنسو ٹپ ٹپ اُس کی آنکھوں سے کاغذ پر تیز برستی بارش کی طرح گرنے لگے تھے۔ سارا صفحہ اُس کے آنسوؤں سے گیلا ہو گیا تھا۔

کسی سے کچھ کہنے، کچھ شیئر کرنے کی بجائے بیت گالم BatGalim ساحل پر جانے کیلئے بس میں جا بیٹھی۔ اُسے محسوس ہوا تھا کہ شیشوں سے باہر کی دُنیا خود میں بہت مگن تھی۔ اپنی نظروں کا خالی پن اُسے خود محسوس ہوا تھا۔ جا بجا کِھلے پھولوں اور ان کے چمکتے رنگوں میں نہ کوئی کشش تھی اور نہ کسی منظر نے توجہ کھینچی تھی۔ آسمان کتنا شفاف اور نیلاہٹوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ تیز ہواؤں کے جھلاروں نے کھجوروں کے پیڑوں کے پتوں کو پاگل کر رکھا تھا۔ خود کو پٹختے پھرتے تھے جیسے وہ خود کو پیٹ رہی تھی۔ بس سبک خرامی سے پہاڑی چڑھائی چڑھتی چلی جاتی تھی۔

ساحل پر سمندر کی بے کراں لہروں میں تیرتی کشتیوں کو دیکھتی رہی۔ نیلگوں

فضاؤں میں ان کے پھولتے بادبانوں سے لپٹ کر کہیں دُور انجانے دیسوں میں چلے جانے کی خواہش کے فریب میں ڈوبتی اُبھرتی رہی۔ مغرب کی طرف چمکتی سونے کی تھالی سے پھوٹتی طلائی تاروں کے ساتھ پانیوں میں ڈوبنے کی تمنا کرتی رہی۔ پرندوں کے اُڑتے غولوں کے ساتھ فضائے بیکراں میں پرواز کی خواہش کی گھمن گھیریوں میں اُلجھتی رہی۔ کچھ خواہشوں کا پورا کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے؟

اُسے اپنی ماں سے بہت پیار تھا اور ریڈینا پریشان تھی۔ ابھی تین دن پہلے اُس نے اُن کے پاس بیٹھ کر کہا تھا۔

''حد ہوگئی ہے مما۔ کیوں اتنی پریشان ہیں؟ جدو آپ اور آنٹی ضالیہ نے جو سوچا ہے وہ ٹھیک ہے۔ میں آپ لوگوں کے خدشات اور آپ کی سوچوں سے متفق ہوں۔''

ریڈینا کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ اُسے لگا اُس کی شوخ و چنچل اور ہیلی سی بیٹی اتنی چھوٹی عمر میں مقدّر کے کڑے وار کے ایک ہی ہلّے میں سمجھداری کی بہت سی منزلیں طے کرگئی ہے۔ اُس کے دلاسہ دینے کے اِس اظہاریے پر اُسے دُکھ کے ساتھ ساتھ تعجب اور خوشی بھی ہوئی کہ وہ محض سترہ سال کی ہونے کے باوجود بہت میچور ہے۔ گو ان کا اندر دُکھی تھا۔ بیٹی ریڈینا کی کمزوری تھی۔ کبھی اُسے اسرائیل آنے پر غصہ آتا۔ کبھی اپنے اُوپر کہ آخر اُس نے کیوں اتنے اوندھے پن کا ثبوت دیا؟ اتنی قربت اور تعلق نے اسی صورت کو جنم دینا تھا۔

بہت دیر سے اُس کی واپسی ہوئی تھی۔ ریڈینا کا لہجہ گلے گلے تک تفکّر میں ڈوبا ہوا تھا۔

''نائل تم کہاں تھیں؟ جانتی ہو میں کتنی پریشان تھی؟''

''ارے مما آپ بھی ذرا ذرا سی باتوں پر پریشان ہوتی ہیں۔ کیتھی کے ساتھ

ریپرٹری تھیٹر Repertory Thetre چلی گئی تھی۔ویسے آپ یقین کریں حیفہ کے میئر ابا ہشی Abba Hushe کو تمغہ دینے کو جی چاہتا ہے ایسا شاندار تھیٹر بنایا ہے اُس نے کہ شہر جیسے سج گیا ہے۔

یرڈینا اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر مطمئن سی ہوگئی۔شاید یہ بھی خود کو بہلانے اور دھوکہ دینے کی لاشعوری کوشش تھی کہ اُس کی بیٹی ہمیشہ اُسے خوش رکھنے کی کوشش میں رہتی تھی۔

دو تین دن بعد اُس نے ماں کے پاس بیٹھ کر کہا۔''مما میں بیروت جانا چاہتی ہوں اگر آپ اجازت دیں تو۔''

یرڈینا نے تشویش بھرے انداز میں اُسے دیکھا۔اُس کے سامنے کھڑی پانچ فٹ آٹھ انچ کی قامت پر بے حد دل کش خدوخال والی یائل عام سے انداز میں بات کر رہی تھی۔اُس کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر سوال تھے لیکن ہونٹوں پر جامد سناٹا تھا۔

چند لمحوں کی بڑی بوجھل سی خاموشی کے بعد اُس نے استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

کس کے پاس ٹھہرو گی؟

''آنٹی لیلیٰ کے پاس ٹھہر سکتی ہوں۔کیتھی کے انکل بھی وہیں یونیورسٹی میں ہیں۔''

''یائل میری جان چیک پوسٹوں پر اتنی ذلالت ہوتی ہے اتنے سوال جواب،کاغذات کی جانچ پڑتال۔''

''مما کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' فیصلہ کن کا سا انداز تھا جس میں چُھپے اعتماد کی جھلک بھی تھی۔

''پر یائل لبنانی چیک پوسٹ سے بھی تو گزرنا پڑے گا اور یہ لبنانی بڑے فضول

ہیں ۔بال کی کھال اُتارتے ہیں ۔مسلمان تو رہے ایک طرف ان کے تو عیسائی بھی بڑے کٹڑ ہیں ۔یہودی شناخت کے ساتھ تو اور بھی مسئلہ ہے ۔''

''آپ کیوں پریشان ہیں ؟نمرود فورٹریس چیک پوسٹ پر آج کل کیتھی کے چچا ہیں ۔وہ سہولت سے گزار دیں گے اور لبنانی سائڈ پر آنٹی لیلیٰ کے ملنے والے ہیں ۔مجھے اب اپنے پروں کے نیچے سے نکال دیں ۔''

ریڈینا نے پھر کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا ۔

''میں نے کہا نا آپ فکر مت کریں ۔میں جانتی ہوں مجھے کیا کرنا ہے؟''

اس کے لہجے کی تیزی ،اُس میں چھلکتی تھوڑی سی تلخی نے ریڈینا کو خاموش کروا دیا مگر ساتھ ہی پائل کو احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادتی کر گئی ہے ۔وہ فوراً پلٹی ۔تفکر اور اندیشوں کے رنگ اس کے چہرے پر بکھرے دیکھ کر اُس نے باہیں ماں کے گلے میں ڈال دیں اور بولی ۔

''آپ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر گھبرانا چھوڑ دیں ۔''

ریڈینا کی آنکھیں گیلی ہو گئیں ۔وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر جانے کیسے اُس نے اپنی بیٹی کو ایک بڑے مدبرانہ سے رُوپ میں دیکھا ۔

''پائل پتہ نہیں میں تمہیں خود سے زیادہ عقلمند سمجھنے لگ گئی ہوں یا میں کمزور ہو گئی ہوں ۔''

وہ ہنسی ۔ماں نے اُس کے لبوں پر بکھری اِس افسردہ سی ہنسی کو محسوس کیا پر کچھ بولی نہیں ۔اس نے ماں کے رخساروں پر پیار کیا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے بولی ۔

''میں آپ کو پھر تاکید کرتی ہوں آپ نے پریشان نہیں ہونا ۔گھبرانا نہیں اور نہ ہی اُلٹے سیدھے وہموں کا شکار ہونا ہے ۔ڈیڈی کو میرے جانے کے بعد بتائیں ۔میں صرف

ایک یا دو دن کیلئے جا رہی ہوں۔"

ماں نے جانتے ہوئے بھی کہ وہ بیروت کیوں جا رہی ہے؟ نہیں پوچھا اور بیٹی نے بھی سمجھتے ہوئے بتانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید دونوں ہی ایک دوسرے کو تسلی دینے کے موڈ میں تھیں۔

فیکلٹی آف میڈیسن امریکن یونیورسٹی بیروت کی شاندار سی عمارت اس کے سامنے تھی۔ مانوسیت کی ایک لہر اس کے سارے سراپے میں دوڑنے لگی۔ اُس نے ہوش سنبھالتے ہی ڈیوڑھیوں، کھلے صحنوں اور رشن نشینوں والے برآمدے دیکھے تھے۔ بیروت کی عمارات پر فرانسیسی طرزِ تعمیر کی جھلک کا تاثر بھی نظر آتا تھا۔

امریکن یونیورسٹی اسی انداز کی نمائندہ تھی۔ وہ چند لمحے سرسبز کشادہ لان کے آگے کھڑی عمارت کو دیکھتی رہی۔ تین منزلہ عمارت کے ماتھے پر جھکے شیڈ اور اس کے سینے پر چپکی بیل۔ سرو کے قد آور بوٹے۔ باڑ Hedge کے ساتھ پڑی بینچ پر ایک اُداس چہرے والی بیٹھی لڑکی کو ہر گزرنے والے نے دیکھا اور اُس نے بھی سبھوں پر باری باری نظر ڈالی۔

بحیرہ روم کی ہوائیں پھولوں کی خوشبو سے لدی اُس کے اردگرد بگولے کی طرح رقصاں اس کے کھلے بلاؤز میں سے اندر گھس کر لطیف سی کپکپی کا سا احساس پیدا کرتی تھیں۔ دیر بعد وہ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پاس سے گزرنے والے ایک مرد سے منصور کا پوچھا تھا۔

"فلسطین کا منصور۔ یوسف ضیا کا عزیز۔" اُدھیڑ عمر کے مرد نے تصدیق اس کے چہرے کو چند لمحے بغور دیکھتے ہوئے چاہی۔ مرد نے نرم اور شائستہ سے لہجے میں کہا۔ "صبح سے تو میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ شاید لیکچر روم میں ہو۔ آپ یہیں رُکیے۔ میں اُسی طرف جا رہا ہوں۔ اگر ملا تو آپ کا بتاتا ہوں۔"

وہ دو قدم آگے بڑھا پھر رُکا۔ اُس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''اپنا نام بتانا پسند کریں گی۔''

''یائل۔''

وہ دوبارہ ذرا فاصلے پر اُسی خالی بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔

حیفہ میں اُس کے سکول کا ذریعہ تعلیم فرنچ تھا۔ اُس نے بہت تیزی سے یہ زبان سیکھی تھی۔ یہاں اُسے مختصر سے وقت میں عربی اور فرنچ کا زیادہ اثر محسوس ہوا۔

گزشتہ ڈیڑھ ہفتے کے واقعات اُس کے سامنے گردش کرنے لگے۔ فرانس اور برطانیہ سے ماہرین تعلیم کا ایک گروپ اسرائیلی سکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کے مطالعے اور جائزے کیلئے آیا تھا۔ اس ضمن میں حیفہ میں یائل کے سکول کا بھی دورہ کیا گیا۔ لیکچر روم Lecture Room میں سینئر سٹاف اور سینئر طلبہ کے ساتھ اُن کے سوال جواب کا بھی اہتمام تھا۔ یائل ایسے معاملات میں بہت تیز اور بے باک تھی۔

ڈیلیگیشن کی مرتب کردہ رپورٹ کے مطابق چار اہم اور بنیادی سوال تھے۔ عربوں کی جدوجہد کو جنگجویانہ، ظالمانہ، یہودیوں کیلئے انتقامی اور اسرائیلی ریاست کو ختم کرنے کے منصوبوں پر مشتمل مواد کے طور پر نصاب میں شامل کرنا اور چھوٹے بچوں کو پڑھانا کس حد تک ضرر رساں ہوسکتا تھا۔

عربوں کو جاہل، کاہل اور پس ماندہ ثابت کرتے ہوئے صحراؤں کو گل و گلزار کرنے اور اُسے جدید خطوط میں ڈھالنے کی کاوشوں کا سہرا اسرائیلوں کے سر باندھنے کے مضمرات۔ کیا فلسطین ایسی سرزمین تھی کہ جو زمانوں سے بانجھ پڑی تھی۔

عربوں کی تاریخ اور ان کے تہذیبی ارتقاء سے چشم پوشی۔

یائل کا سکول براہ راست مملکت فرانس کی وزارت تعلیم سے منسلک تھا۔ انہیں

صرف ایک مضمون جغرافیہ عبرانی زبان میں پڑھنا پڑتا تھا۔اس پر یائل اور چار بچوں نے اعتراضات کیے اور لکھوائے۔

سینئر سٹاف کے بعض ارکان نے جو زمانوں سے یہاں تھے ان نئے متعصب رویوں کی کھل کر مذمت کی اور واشگاف لفظوں میں کہا۔

''یہ رجحانات امن کے منافی اور آئندہ کیلئے علاقے میں مسلسل کشیدگی اور نفرت کا محرک ہوں گے۔''

مگر ہوا کیا؟ جونہی وہ لوگ باہر آئے کئی لڑکیوں نے یائل کو منصور اور اس کے خاندان کے حوالے سے رگیدا۔لزی سب سے زیادہ تیخ پا تھی۔لال بھبھوکے چہرے کے ساتھ اُچھل اُچھل کر فضول باتوں کے ڈھیر لگا رہی تھی۔یائل کونسا کم تھی؟ خم ٹھونک کر میدان میں اُتری اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔

ابھی تو اِس بات کو ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ جب ایک شام ضالیہ اُن کے ہاں آئی۔فضا میں لطیف سی خنکی تھی۔وہ سٹڈی روم Study Room میں بیٹھی پریکٹیکل کاپی پر دل کی ڈائیگرام بناتے ہوئے سوچتی تھی کہ اگر اس کے دل کو چیرا جائے تو شاید ہر طرف منصور کا ہی عکس نظر آئے۔جب کارمیلا سیوتا (دادی، نانی) نے آکر بتایا تھا کہ بڑے کمرے میں اُس کا انتظار ہو رہا ہے ضالیہ بی بی آئی ہیں۔

وہ مسکرائی تھی۔ضالیہ کے ساتھ اُس کی ماں کا رشتہ بڑی انوکھی نوعیت کا تھا۔دل کی تہوں سے جھلکتا، اُبھرتا، محبت اور پیار کے چشمے سے پُھوٹتا۔ریڈینا کی کوئی بہن نہیں تھی۔اس کی گہری دوست نازی بربریت کا شکار ہوئی تھی۔دونوں رشتے اُس نے ضالیہ میں ڈھونڈ لیے تھے اور ضالیہ بھی دل و جان سے اس کی گرویدہ تھی۔اُن کا کوئی کام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ایک دوسرے سے صلاح مشورے کے بغیر نہ ہوتا۔دونوں کے درمیان سیاسی حالات پر

باتیں ہوتی تھیں ۔دونوں کھری اور سچی بات کہنے کی عادی تھیں بغیر لگی لپٹی کے۔

وہ کمرے میں ہنستے ہوئے داخل ہوئی تھی اور ہنستے ہوئی بولی تھی ۔''اوہو میں بھی کہوں موسم اتنا حسین کیوں ہے؟تو یہ سب میری ضالیہ آنٹی کی وجہ سے تھا۔آپ کب آئیں؟مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا جیسے الفاظ کہتے ہوئے اُس سے چمٹ گئی۔اپنے ماتھے پر، رخساروں پر بوسوں کی بوچھاڑ سے شرابور ہوتے ہوئے اُسے احساس ہوا تھا جیسے دونوں افسردہ سی ہیں۔روئی روئی سی۔کافی کا مگ اُٹھا کر یائل نے اُسے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ابھی سوچا ہی تھا کہ وہ اُن سے پوچھے کہ واقعی کوئی بات ہے یا یہ محض اُس کا وہم ہے۔تبھی ضالیہ نے کہا۔

''یائل منصور کیلئے لڑکی بتاؤ۔تم نے تو ہمارے خاندان کی کم و بیش سبھی لڑکیوں کو دیکھ رکھا ہے۔امو اُس کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔اب اُس کا میڈیکل بھی مکمل ہونے کو ہے۔''

منصور کی شادی۔

جیسے دل کے ہاتھوں نے بجلی کی ننگی تاروں کو چھولیا ہو اور جھٹکے سے سارا وجود زیرو زبر ہو گیا ہو۔کافی کا مگ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔گرم کافی پھولدار ٹاپ اور پینٹ کو بھگوتی نیچے گر کر ایرانی قالین میں جذب ہو گئی تھی۔یرڈینا نے مضطرب ہو کر اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا۔

''یائل کیا ہوا۔ہاتھ تو نہیں جلا۔''

ضالیہ اِس ردِ عمل کو جانتی تھی اور یرڈینا بھی ۔دونوں میں دنوں پہلے اس پر بات ہوئی تھی ۔دونوں جی جان سے ایک دوسرے کے بچوں کو چاہتی تھیں مگر شادی کیلئے درمیان میں جو مسائل تھے اُن سے آنکھیں بند کرنا ممکن نہ تھا۔ڈاکٹر موسیٰ کا خاندان فلسطین کا سرکردہ

خاندان اور یائل کے والدین بھی حیفہ میں خاصے معزز تھے۔طوفان آجاتا تھا۔مذہب خطرے میں پڑ جاتا تھا۔دس گاؤں سے فلسطینوں کی بندوقوں کی نوکوں پر بے دخلی یقینی امر تھا تو وہیں فلسطینوں کے جذباتی نعرے بھی کہ انہوں نے یہودیوں کی نسلی برتری کا بیج ماردیا۔

دونوں نے بچوں کوایک پل کیلئے باہر بھیج دینے کا بھی سوچا مگر یہ اُن کی دائمی جُدائی کی صورت ہوتی جو بہر حال انہیں گوارا نہ تھی۔

اور شاید پہلی بار انہوں نے اس پر دُکھ کا اظہار کیا کہ اُن سے بہت حماقت سرزد ہوئی۔انہیں ایک دوسرے کے اتنا قریب اور بچوں کو یوں گُھلنے ملنے نہیں دینا چاہیے تھا۔ان کے بچے انسان تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہتے رہنے سے درمیان میں محبت کا ہو جانا فطری امر تھا۔

اپنے اس تجزیے پر آنسو بہاتی آنکھوں سے واقعی سنگین غلطی ہوئی جیسا اعتراف اور اُس پر مہر ثبت کرنا پڑی کہ انہوں نے تو دُور تک حالات کے دامن میں اُتر کر کبھی کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔اپنے آج اور خود میں گم تھیں۔یرڈینا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے پرنالے بہہ نکلے تھے۔

''ضالیہ مجھ جیسی ٹوٹی ہوئی عورت نے تم لوگوں کی محبت وشفقت میں جینا سیکھا۔سچ تو یہ ہے کہ میرا تو کوئی رشتہ ہی نہیں بچا تھا۔ماں تو جیسے مجھے تم لوگوں کی گود میں ڈالنے آئی تھی۔ڈالا اور چل دی۔تمہارے خاندان نے مجھے خونی رشتوں کا مان دیا۔اور کچھ ایسا ہی حال ضالیہ کا بھی تھا۔گو وہ رشتوں کے حوالوں سے خوش قسمت تھی مگر ان سب کے باوجود کچھ تعلق اور ناطے بہت اہم بن جاتے ہیں۔یرڈینا کے معاملے میں وہ بھی ایسا ہی محسوس کرتی تھی۔دل کی ہر بات اُس سے شیئر کرنا اُس کے لیئے کھانے کی طرح ہی ضروری تھا۔

ضالیہ نے اپنے بازوؤں میں پائل کو سمیٹا۔

تینوں کے آنسو بہتے تھے۔

بہت سارے دن گزر گئے تھے۔اس کی شوخی اُس کا چلبلا پن جیسے سب ختم ہو گئے تھے۔

اور جب وہ سرسبز لان پر نظریں جمائے گذشتہ دنوں کے حصار میں تھی اُس نے سُنا تھا کہیں سے ایک میٹھی آواز میں "پائل" اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔اُس نے چونک کر نظریں اُٹھائیں۔منصور اُس کے بالکل سامنے کھڑا والہانہ انداز میں اُسے دیکھتا تھا۔وہ ایک سال بعد اُسے دیکھ رہی تھی۔گو دونوں کے درمیان خط و کتابت تو باقاعدہ تھی۔

اُس چمکتے روشن دن میں وہ کس قدر خوبصورت اور دلکش نظر آیا تھا۔چھ فٹ سے بھی نکلتے قد پر اُس کے خوبصورت تیکھے نقوش۔پائل نے نظر بھر کر اُسے دیکھا اور پھر سر جُھکا لیا۔

"چلو تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔کسی چھوٹے بچے کی طرح اُس نے اُسے اپنے دائیں بازو کے حصار میں لے لیا اور Assaha village hotel آ گیا۔قدیم مشرق کا گہرا رنگ لیے پتھر کا یہ ہوٹل اپنی انفرادیت کیلئے بیروت بھر میں مشہور تھا۔غم کی گرداب میں الجھے ہوئے ہونے کے باوجود اُس نے دلچسپی سے اِسے دیکھا۔

شام بہت خوبصورت تھی۔بحیرہ روم کا ساحل طلائی کرنوں سے سجا،ہواؤں کے تیز جھلاروں میں جھومتا بھینی سی خوشبو میں مہکتا محسوس ہوتا تھا۔مگر پائل کو لگا تھا جیسے سامنے بے کراں پانیوں پر مچلتی لہروں کا اضطراب،بے چینی،سرکشی سب جیسے اُس کے اندر کی کیفیات کی عکاس ہوں۔

وہ دونوں پاس پاس بیٹھے تھے۔خاموش پانیوں کو دیکھتے اپنی آنکھوں میں اُترتے

ہر موتی کو تنبیہ کرتے، ہونٹوں کو کچھ کہنے کیلئے اُکساتے مگر جیسے پائل کی آنکھوں نے اندر کی ہر ڈانٹ ڈپٹ کو سُننے سے انکار کر دیا تھا۔ایک کے بعد ایک موتی ٹوٹنے لگے۔منصور نے اُسے اپنی بانہوں کے ہالے میں سمیٹ لیا تھا۔

''پائل سالوں پہلے کے اُس دن سے جب میں تمہارا اور ایڈمنڈ کا ہاتھ پکڑے تمہیں گھر چھوڑنے گیا تھا تب سے آج تک میں اگر اپنے گزرے شب و روز میں جھانکوں تو مجھے اپنی ہر سوچ ہر احساس ہر خیال کے پسِ منظر میں تم جھانکتی نظر آتی ہو۔اگر اپنے وجود کو دیکھوں تو میرے ہاتھوں پر تمہارے معصوم ہاتھوں کے لمس کی خوشبو مہکتی ہے۔میری کمر پر تمہارے وجود کا وہ بوجھ جو اُس وقت مجھ سے اُٹھایا نہیں جاتا تھا آج پھولوں کے ہار جیسا سبک محسوس ہوتا ہے۔میری گردن میں تمہارے سڈول بازوؤں کی زنجیروں کے حلقے تمہارے سنہری بالوں کے جھالروں کا میرے چہرے پر بکھراؤ،تمہاری ضدیں،تمہارا مچلنا سب وہ دلفریب عکس ہیں جنہیں جب اور جس وقت میرا جی چاہتا ہے میں دیکھ لیتا ہوں۔

میری تو ہر سوچ تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہوتی تھی۔کچھ اور سوچنے یا خود سے کچھ پوچھنے کا تو کوئی جواز ہی نہ تھا۔ایسے میں جدّو اور امّو کے خطوط نے مجھے پاگل کر دیا۔

بے اختیار ہی میں نے خود سے سوال کیا تھا کہ کوئی اور لڑکی میری زندگی کا حصّہ کیسے بن سکتی ہے؟پائل کو تو میں نے کبھی بتایا ہی نہیں وہ میرے لیئے کیا ہے؟میں نے تو بہت سی باتوں پر غور ہی نہیں کیا تھا۔تمہاری محبت میں ہی گم رہا۔بہت دن میں ایسے ہی تڑپا جیسے یہ لہریں تڑپ رہی ہیں۔تم سے کسی رابطے کے بغیر میں جان سکتا تھا کہ تم کس کرب سے گزر رہی ہو؟بہت دن میں یہاں تنہا آتا رہا۔

دونوں خط مجھے ایک دن کے وقفے سے ملے تھے ایک امّو کا دوسرا جدّو کا۔دونوں کا نفسِ مضمون ایک جیسا ہی تھا اور دونوں میں تمہارا ذکر بھی جس انداز میں تھا وہ دونوں کی تم

سے گہری محبت کا اظہار تھا۔ وہ تمام خدشات بھی علی الرتیب درج تھے جو کبھی کبھی میری سوچوں میں بھی گھس آتے تھے۔

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اس کے شانے پر آنسو بہاتی پائل نے اپنی پوروں سے انہیں صاف کرتے ہوئے ذرا سا سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ اس کی نگاہیں بہت دُور پانیوں پر جمی تھیں۔ دیر بعد اُس نے گفتگو کا سلسلہ پھر جوڑا تھا۔ پائل مجھے اپنی ماں سے جتنی محبت ہے وہ تم سے پوشیدہ نہیں مگر پہلے دن اُن کا خط پڑھ کر میں نے ازردہ کیفیت میں اُسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔ مجھے غصہ آیا تھا۔ ابھی اس راگ کو آلاپنے کی کوئی ضرورت تھی؟ میری پڑھائی جان تو ڑ مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ پر اگلے دن جدو کے خط نے میرے گھر کی روایات کے حوالے سے بات کی تھی کہ جہاں لڑکے بیس اکیس سال میں بیاہ دیئے جاتے ہیں۔ تعلیمی سلسلے تو زندگی بھر چلتے رہتے ہیں۔ میں نے کرسی میں خود کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے خود کو اِس اذیت سے ہلکا کرنے کیلئے آنکھیں بند کیں تو وہ ساری یادیں کرنوں کی طرح جھلملائی تھیں۔

دُور اُفق تک رواں دواں بہتے پانیوں کو دیکھتے ہوئے وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ اپنے دُکھ کی شدت میں اُسے تو یہ بھی نہیں معلوم ہوا تھا کہ پائل کا چہرہ اُس کے شانے پر ٹکا آنسوؤں میں بھیگ رہا ہے اور اُس کا سارا وجود گھائل ہوئے جاتا ہے۔

ایک بار میں نے سوچا میں امریکہ میں settle ہو جاتا ہوں۔

مگر پائل میرا اندر بوٹیوں میں کٹنے لگا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تمہاری میری شادی تو ایک دھماکہ ہوگی۔ سو پچاس، دو سو یا تین سو یا ممکن ہے اِس سے بھی زیادہ فلسطینی جانوں کے نذرانے پر؟ کیا ہم اِسے ہضم کر سکیں گے نہیں کبھی نہیں۔ اگر ہم باہر چلے جاتے ہیں تو میرا اور تمہارا فلسطین آنا بین ہو جائے گا۔ کیا میں اِسے برداشت کر سکوں

گا؟نہیں ۔محبت کی اتنی بڑی قیمت دے کر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔فلسطین لہو کی طرح میری رگوں میں گردش کرتا ہے۔

بہت دن سولی پر لٹکنے کے بعد یائل میرا فیصلہ تھا کہ مجھے شادی ہرگز نہیں کرنی ۔باہر جانا ہے۔سپیشلائزیشن Specialization کے بغیر سادہ میڈیکل کی کیا وقعت ہے؟

ہم فلسطینی تو بڑی بے خانماں سی قوم بن چکے ہیں۔ہم کسی کی ترجیح نہیں ۔اب یہ لڑائی تو خود ہمیں لڑنی ہے۔ہاتھوں میں امن کے جھنڈے پکڑ کر یا بندوقیں اُٹھا کر۔وقت کا انتظار کہ شاید اس کے دامن سے ہمارے لیے محبت اور امن کے پھول گر جائیں ۔تمہیں میں نے اسی لیے بُلایا ہے کہ تمہیں اس کرب سے نکالوں ۔

پھر اُس نے گھائل سی یائل کے چہرے پر اپنا دایاں گال رکھ دیا ۔یائل نے پانیوں میں ڈوبی آنکھوں کی جُھری سے دیکھا اُس کے رخساروں پر دو آنسو تھے۔

شام تو ایسے ہی گزری تھی کہیں نا اُمیدیوں کے سایوں اور کہیں اُمیدوں کی روشنیوں میں۔اپنی اپنی عمروں کے حساب سے اتنے جذباتی تو نہیں تھے پر اُس شام جب انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہرج کیا ہے زندگی ایسے ہی گزر جائے۔فلسطین کے زخموں پر پھاہے رکھتے ہوئے تو دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوئے تھے ایک نئے عزم اور لگن کے ساتھ۔

اگلے دن دوپہر کی دھوپ ماں کی گود جیسی نرمی اور گرمی لیے ہوئے تھی ۔جب وہ گاڑی میں بیٹھے۔منصور نے ڈرائیور سے بشاری Bsharri کیلئے کہا اور ساتھ ہی یائل کی طرف دیکھا۔یائل تم نے کسی خط میں لکھا تھا۔

''منصور تم جبران خلیل کے دیس میں ہو۔آج کل میں اُسے پڑھ رہی ہوں ۔کیا شاعر ہے؟''

پل بھر کیلئے اُس نے گاڑی کے شیشوں سے باہر دیکھا پھر پائل پر نظر ڈالی اُس کی پژمردگی بہت حد تک کم تھی۔وہ کل کی نسبت آج فریش fresh نظر آتی تھی۔منصور مسکرایا اور A Tear and a Smile پڑھنے لگا۔

I would that my love remain a tear and a smile

A tear to unite me with those of broken heart

A smile to be a sign of my joy in existence

I want the hunger for love and beauty to be in the

Depths of my spirit for I have seen those who are

Satisfied the most wretched of people.

پائل کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''تم نے پوری لکھی تھی اور جب میں اُسے پڑھتا تھا تو تمہارا ممنون بھی ہو رہا تھا کہ میں نے اپنی مصروفیات میں ایسی عظیم تخلیق کو دیکھا ہی نہیں۔''

اُس نے پل بھر کیلئے شیشوں سے باہر دیکھا اور بولا۔ہم بشاری Bsharre جا رہے ہیں جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جہاں اُس کا میوزیم ہے۔

راستے کی خوبصورتی اور حُسن سے دونوں محظوظ ہو رہے تھے کہ منظروں میں اپنایت تھی۔سڑک کشادہ اور بہت اچھی تھی۔چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبات کے گھروں اور اطراف میں اُگے اخروٹ اور سیبوں کے درختوں کی بہار تھی۔راستے میں یہودہ مارکیٹ Yehuda Market سے انہوں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں۔

سرخی مائل زرد پہاڑیوں پر اُگے سبزے سے بھرے نظاروں نے پائل کی آنکھوں میں مسرت کی قندیلیں سی جگمگا ئیں۔شاید یہ منصور کی قربت کا اثر تھا یا اتنے دنوں کے دلی

اضطراب کے بعد سکون مل جانے کی طمانیت تھی۔

زردی مائل اینٹوں سے بنا میوزیم پہاڑ کی کھوہ میں تھا جو نوکیلی صورت میں کسی پاسبان کی طرح اس پر تنا کھڑا تھا۔ بڑا خوفناک اور انوکھا سا منظر تھا۔ میوزیم بند تھا۔ انہیں افسوس ہوا۔

ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر کتنی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے۔ لبنان کے ادبی ہیرو کو خراج پیش کرتے رہے وہ انقلابی شاعر تھا۔ فلاسفر، پینٹر۔ کتنی خوبیوں کا مالک۔ پائل نے Freedom سُنائی۔ پھر A Lover's Call کو منصور نے خوبصورت لے (Tune) میں گائی۔

وقت رُخصت اُس نے پائل کے ماتھے پر ہونٹ رکھے اور مدھم سی آواز میں گنگنایا۔

تو آؤ خستہ حال جھونپڑیوں میں چلیں۔
مکینوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو میٹھے بولوں سے جوڑیں۔
اور دان کریں انہیں
جو کر سکنے پر قادر ہوں۔

باب نمبر: ۹

ام غسان نے چاندی کے اُس خوبصورت سیٹ میں سے دو پیالیاں بڑی طشتری میں رکھیں جو خاص مہمانوں کی آمد پر نکالی جاتی تھیں۔کھانے کے کمرے میں برتنوں کی الماری کے پٹ بند کیے اور باورچی خانے میں آ گئی۔قہوہ اُس نے اسی لگن اور پریت سے بنایا تھا جو عرب عورت کا شیوہ ہے۔منصور برآمدے میں بیٹھا تھا۔اُس نے ٹرے پاس پڑی تپائی پر رکھتے ہوئے ڈاکٹر موسیٰ کو آواز دی۔

''ابو منصور میں نے سپیشل قہوہ بنایا ہے ایک پیالی لے لو۔''

ڈاکٹر موسیٰ یروشلم سے آنے والا یوسف ضیا کا فون سُن رہے تھے۔قہوہ ٹھنڈا ہو گیا تھا جب آ کر انہوں نے پیالی اُٹھائی۔منصور نے پوچھا۔

''خیریت۔جدّی اتنی دیر فون پر بات نہیں کرتے ہیں۔کیا کوئی خاص بات تھی؟''

ڈاکٹر موسیٰ نے گھونٹ بھرا اور بولے۔

''ڈینیئل سیمون کا انتقال ہو گیا ہے۔''

منصور نے انا اللہ پڑھا۔وہ جانتا تھا ڈینیئل بڑا کھرا اور سچا انسان تھا۔اسرائیلی پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود کبھی مصلحت یا منافقت سے کام نہیں لیتا تھا۔ہمیشہ فلسطینیوں کے حق میں آواز اُٹھاتا۔اُس کے دادا کا گہرا دوست تھا۔

''کیا کچھ بیمار تھے۔''منصور نے باپ کی طرف دیکھا۔

''ارے بھئی کہاں۔یہ جو یروشلم دو دن پہلے سیکولر یہودیوں اور ہیریڈیوں (تنگ

نظر Haredi) میں فساد ہوا تھا۔ جمعے کی شب بار ایلین سٹریٹ پر ہیریڈی یہودیوں کے خاندان سبت کا گیت گاتے کھانے کی میز پر ابھی بیٹھے تھے جب باہر سڑکوں پر لڑکوں کے ٹولوں میں تیز گاڑیاں چلانے، گیت گانے اور ڈرنک کرنے کے مقابلے شروع ہو گئے۔ پوری لین کے مردوں کا غصہ اور اشتعال اپنے عروج پر تھا۔ وہ اکٹھے ہو کر ہاتھوں میں پتھروں کے ساتھ باہر آئے اور گاڑیوں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔

بدقسمتی ڈینئیل سیمون کو زبردستی اُس طرف لے آئی تھی۔ پتھراؤ کی اِس بارش میں انہوں نے تیزی سے گزر جانے کی اپنی سی کوشش کی پر کامیاب نہ ہو سکے۔ پتھر ونڈ سکرین Wind Screen پر لگے اور شیشے کی کرچیاں ان کی آنکھوں، دماغ اور دل میں پیوست ہو گئیں۔ دو دن اسپتال میں موت و زیست کی کشمکش میں رہنے کے بعد چل بسے۔ مغربی یروشلم میں ابھی تک کرفیو لگا ہوا ہے اور حالات بہت ابتر ہیں۔

''خدا اُن پر اپنی رحمتوں کا نزول کرے۔''

ڈاکٹر موسیٰ کے لہجے میں تعزیتی اور دُعائیہ الفاظ ملے جلے جذباتی انداز میں گھل مِل سے گئے تھے۔

''اُمِّ غسان''

انہوں نے گھر کی زمانوں پرانی خادمہ کو آواز دی اور بولے۔

''میں نے ٹھنڈا قہوہ پی لیا ہے۔ مزہ نہیں آیا۔ اب مجھے گرم پلاؤ۔''

الفاظ اُن کے ہونٹوں پر تھے اور وہ ''میں ابھی آتا ہوں'' کہتے کہتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلے تو ایک پیکٹ ہاتھوں میں تھا۔ بیٹے کو تھماتے ہوئے بولے۔

''تم قاہرہ جا رہے ہو۔ ائر وائس مارشل نجیب مگدی کو تھوڑا سا وقت نکال کر یہ

دیتے آنا۔"

منصور نے بڑے سے پیکٹ کو ایک نظر دیکھا اور نہیں پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ وہ جانتا تھا اِس میں نابلوس میں اُن کے باغات کا خالص ہاتھ سے نکالا ہوا زیتون کا تیل اور اسی تیل سے خصوصی تیار کردہ صابن ہوگا۔ یہ دونوں سوغاتیں زمانوں سے اُس کے والد کے دوستوں کو بھیجی جاتی ہیں اور مصری احمد مگدی اُس کے والد کے بہترین دوستوں میں سے ایک تھا۔

منصور چار سال بعد امریکہ سے کوئی تین ماہ پہلے لوٹا تھا۔ امریکہ میں فلسطین کے لیے کام کرتی انسانی حقوق کی مختلف تنظیموں سے اُس کے مسلسل رابطے تھے۔ ان دنوں وہ اقوام متحدہ کی زیرنگرانی کام کرنے والے کیمپوں میں قائم عارضی اسپتالوں میں بے حد مصروف تھا اور دو دن پہلے گھر آیا تھا۔ اِن کیمپوں کی حالت زار نے اُسے تڑپائے رکھا۔ تاہم لوگوں کی آنکھوں اور رخساروں پر گو آنسو بہتے تھے مگر ان آنسوؤں میں چھلکتا عزم بڑا آہنی تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے اُسے پُرامید کیا۔ ٹین کی چھتوں تلے بچوں کا نئے سبق پڑھنا، مدافعت کا سبق، مقابلے کا سبق اور ان سب کے ساتھ ساتھ آس اور اُمید کی جھلملاتی لو بھی اُنکے سینوں میں روشن تھی۔

ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر اُس نے پینٹنگ دیکھیں۔ انگلیوں اور رنگوں سے کیسے کیسے بچوں نے اپنے جذبات کو اظہار دیئے تھے؟ دھوپ میں اُنہیں بچوں والے کھیلوں کی بجائے ظلم و تشدد، گولیوں اور جنگ و جدل کے کھیلوں میں مشغول پایا۔ ان کی سوچیں کیسے متاثر ہوئی تھیں؟ اُن میں بچوں والی کوئی بات ہی نہ تھی۔

ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں، کچے پکے ایک کمرے، ایک کچن اور ایک باتھ والے گھروں کے مکینوں جن کی زندگیاں کچی پکی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں چلتے پھرتے ایک

خواب دیکھتے دیکھتے بوڑھی اور کچھ دُنیا سے رُخصت ہوگئی تھیں۔وہ اپنی زمین اپنے گھروں میں نہیں جا سکتے تھے۔بڑی طاقتیں،ان کے وعدے،ان کی قراردادیں سب جھوٹ کے پلندے تھیں اور وہ یہ بات جان گئے تھے۔اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔

کل صبح قاہرہ سے ڈاکٹر جبران کا فون تھا۔بیروت میں اس کے مصری کلاس فیلو جبران نے اُس کے حیفہ سکول میں پڑھنے والے اُس کے بچپن کے دوست احمد کا ذکر کیا تھا جو سینئر کیمرج کے بعد قاہرہ چلا گیا تھا اور جس نے قاہرہ آرمی کو جوائن کیا تھا اور اب آرمی انٹیلی جنس Army Intelligence میں کرنل تھا۔وہ بیمار تھا۔جبران کچھ واضح نہیں کہہ پا رہا تھا فون پر آواز کچھ عجیب سی گھبراہٹ لیے ہوئے تھی۔شاید سیٹ میں کوئی خرابی تھی۔

''عجیب سی بیماری میں مبتلا ہے وہ جس کی ڈاکٹروں کو بھی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔احمد تم سے ملنا چاہتا ہے۔اگر آسکو تو بہت اچھا ہوگا تم سے مجھے ملے ہوئے بھی کم و بیش پانچ سال تو ہوگئے ہوں گے۔عجیب ہو تم بھی۔امریکہ سے واپسی پر بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔''

ڈاکٹر موسیٰ گرم قہوے کے ہر چھوٹے سپ کے ساتھ ایک عدد خبر اپنے ہونٹوں سے باہر نکالتے تھے۔

''ناصر اور شاہ حسین آپس میں الجھے ہوئے ہیں۔

شام کی سرحدوں پر اسرائیلی فوجوں کا اجتماع بڑھتا جا رہا ہے۔''

منصور نے اِن خبروں پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنا بیگ اُٹھایا۔باپ کا دیا ہوا پیکٹ اس میں ڈالا۔دادی سے دُعائیں اور ماں باپ سے اجازت لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

جب وہ گھر سے نکلا روشن سی صبح کشادہ گلی کے آفتابی رخ پر بنے گھروں کے در و دیوار پر پھیلی پورے ماحول کو اجگر سا بنائے ہوئے تھی۔الحمرہ سکوائر جسے اب پیرس Paris sq کہا جانے لگا تھا۔اُسکے گھر سے چار قدم پر تو تھا منصور کو جیسے اچانک احساس

ہوا تھا کہ اسکی وہ پرانی گلی کہیں نہیں ہے۔ کونے پر وہ قدیمی کنواں اس پر اہراتی بل کھاتی چرخی ضرور موجود تھی مگر جو صورت نظر آتی تھی وہ جیسے کسی سجے سنورے ڈیکوریشن پیس کی سی تھی۔ مگر عورتوں، بوڑھوں اور لڑکیوں کا پانی کیلئے جمگھٹا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ چوک میں ما ک کئی گاڑیاں بھی ایک آدھ کے سوا نظر نہ آئیں۔ ذرا فاصلے پر مسجد محمد نے اپنا پرانا چولا اُتار پھینکا تھا۔ نئے رنگ اور نیا روپ اُسے منفرد سی صورت دے رہا تھا۔ الحمرہ سکوائر پیرس سکوائر میں تبدیل ہو کر زیادہ شاندار ہو گیا تھا۔ سامنے والی سڑک کریات رابن Kiryat Rabin خم کھا کر غیر معمولی وسعت پکڑتی تھی۔

اُس نے گاڑی سڑک کے کنارے پر کرتے ہوئے روک لی تھی۔ تعجب سے اپنے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے خود سے کہنے لگا۔

''میرا وہ پرانا حیفہ (Haifa) کہاں ہے؟''

دراصل وہ گذشتہ کئی سالوں سے حیفہ کو راتوں کو ہی دیکھتا تھا۔ بیروت سے جب بھی آتا گھر پہنچتے پہنچتے عموماً رات ہو جاتی تھی۔ دن میں بھی شائد بھاگ دوڑ او رافراتفری کی سی کیفیت میں اردگرد کو دیکھنے کا اس انداز میں تفصیلی موقع ہی نہیں ملا۔ یوں بڑے پیا نے پر حیفہ کو صنعتی زون بنانے اور پورے شہر کا انفراسٹرکچر کو جدید انداز میں تبدیل کرنے کے منصوبوں سے وہ تھوڑا بہت آگاہ تو تھا ہی۔

پھر اُس نے اپنے گردوپیش کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''چلو یار خیر صلا قاہرہ پہنچ ہی جاؤں گا۔ چند لمحے اپنے گذرے ہوئے شب و روز کو تو دوں۔

یائل ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی تھی۔ اسکی سانسوں کی تاروں سے جڑی، دھڑکنوں میں بسی شریانوں میں دوڑتے لہو میں گھلی۔ وہ خود کلامی کا عادی ہو گیا تھا۔ گاڑی چلاتے

ہوئے ساتھ کی سیٹ پر اُسے بٹھا کر دن بھر کی تفصیل اُسے سناتے لگتا۔سونے سے قبل اُس سے باتیں کرنا ضروری۔کیسی عجیب سی محبت پالے بیٹھے تھے۔آج بھی فوراً اندر سے نکل کر دھپ سے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تھی۔حجاز ریلوے اسٹیشن پاس ہی تھا۔بیٹوت کولانی Hativat Golani سٹریٹ پر جا کر وہ مڑا۔فیصل سکوائر میں ایک طرف گاڑی پارک کی۔انجنوں کی شنٹنگ گاڑیوں کی چھک چھک کی آوازیں کہیں دُور سے شور مچاتی یاداشتوں کے دروازے کھولتی آموجود ہوئی تھیں۔

یائل کو گاڑیاں بہت مسحور کرتی تھیں۔دو تین بار وہ ایڈمنڈ اور یائل کے ساتھ بھی یہاں آیا تھا۔فیصل سکوائر کی اُس چھوٹی سی دوکان سے فلافل کھانا بھی یاد تھا۔عثمانیہ سلطنت کے سلطان عبدالحمید ثانی کا تعمیر کردہ بے حد خوبصورت اور وسیع عریض ریلوے اسٹیشن جہاں سے "وپلی ٹرین" شام کے شہر دمشق سے ہوتی ہوئی مکہ مدینہ جاتی تھی۔یوسف ضیا کو جب بھی عرب ہائیر کمیٹی کے کسی اجلاس میں شرکت کے لئے جانا ہوتا وہ حیفہ آتے۔چند دن یہاں رہتے۔منصور اور قاسم نوکروں کے ساتھ انہیں سوار کرانے جاتے۔اُسکا دل بوجھل ہونے لگا۔

اُس وقت منصور کا دل چاہا کہ وہ گاڑی دوڑاتا حادر ہا کارمل Hadar Ha Carmel جائے۔ڈینو ویزمین کونسرویٹری میوزک سکول Dunie weizman conservatory Music School کا گیٹ کھولے اور بھاگتا ہوا اندر چلا جائے۔اُسی انداز میں جیسے وہ اپنے زمانہ طالب علمی میں جایا کرتا تھا۔اُن سب جگہوں پر رُکے جہاں اسکی معصوم محبت کے نشان بکھرے ہوئے ہیں۔یائل نے جب یہاں داخلہ لیا تو اُسے بھی مجبور کرنے لگی۔ماں اور دادی دونوں بڑی روشن خیال تھیں۔اُسے اور قاسم دونوں کو داخل کروا آئیں۔ Choir میں ہمیشہ اُس کی اور یائل کی آوازیں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے

آتیں ۔میڈم گیتا ڈینو میوزک سکول کی مالک دونوں کو ہمیشہ اپنی نظروں کی محبت اور شفقت میں سموئے رکھتی ۔منصور نے Lute بجانا بہت جلد سیکھ لیا تھا۔

گیتا ڈینو عرب موسیقی کی دلدادہ اُس کی اصناف کی وسعت اور ہمہ گیری کی قائل ۔موسیقی کے متعلق اُسکی فلاسفی رڈیوں ،اُسکے ایک وسیع علاقے پر پھیلے کلچر، جغرافیائی عوامل کا اس پر اثر ونفوذ اور اسکا تنوع سبھوں سے وہ نہ صرف واقف تھی بلکہ اسکی عظمت کی بھی قائل تھی ۔

یقیناً یہی وجہ تھی کہ اُسکے اندر ممتا اور محبت کا ایک دریا بہتا تھا۔جب وہ Lute بجاتا وہ ہنستے ہوئے کہتیں ۔

''ارے دیکھو تو کتنی جلدی اسنے اسمیں مہارت پیدا کر لی ہے ۔بھئی اس مغربی کلاسیکل موسیقی میں استعمال ہونے والے بیشتر آلات تو عرب آلات موسیقی سے ہی نکلے ہیں ۔یہ Lute یہ وائلن یہ گٹار وہ ایک لمبی چوڑی فہرست گنوانے لگتی ۔یہ لڑکا موسیقی میں بڑا نام پیدا کرے گا اگر اسے سیکھے تو۔

باہر پھیلی دھوپ میں اُس نے دُور تک نظریں دوڑائی تھیں اور خود کلامی کے سے انداز میں خود سے کہا تھا۔

پائل تمہیں یاد ہے جب ایک شام لان کے پاس وہ اپنی تین چار سٹاف ممبرز کے ساتھ کھڑی تھیں ۔ہواؤں میں بہت تیزی تھی ۔انکے گھنگریالے بال اڑتے تھے ۔جنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے بار بار سمیٹتی تھیں ۔میں اور تم کلاس لے کر باہر نکلے تھے انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''منصور تم موسیقی سیکھو اسمیں نام پیدا کرو۔میں اس وقت انز سائنس کا سٹوڈنٹ تھا۔'' باوجود اُنکے بہت احترام کے میں نے فوراً کہا تھا۔

''میڈم گیتا آپ سے کچھ پوشیدہ ہے بھلا۔ فلسطین کے لوگ بہت زخمی ہیں بہت نڈھال ہیں انہیں مسیحائی کی ضرورت ہے۔موسیقی تو امن کے دنوں کا تحفہ ہے۔میں اسے اپنا کیریئر کیسے بنالوں؟''

تم میرے ساتھ کھڑی تھیں۔شائد تمہیں یاد ہو۔میں نے دیکھا تھا انکے چہرے پر یاس سے بہت سے رنگ بکھر گئے تھے۔جب کہ وائس ٹریننگ voice training کی ٹیچر مسز پاؤلا نے کچھ کوفت اور بیزارگی سے مجھے دیکھا۔

اُن دنوں کنسرویٹری میوزک سکول سارے حیفہ میں واحد جگہ تھی جہاں پبلک کیلئے کنسرٹ بھی ہوتے۔مقابلوں کا اہتمام اور تہواروں کے خصوصی پروگراموں کیلئے بھی یہی جگہ تھی۔موسیقی کے اس شوق اور پرفارمنس میں بہترین کارکردگی نے دونوں کو بطور جوڑا مشہور کردیا تھا۔دونوں کی شہرت سکول سے نکل کر پورے حیفہ اور قرب وجوار میں تب پھیلی جب سکول میں تیرھویں صدی کی ایک لوسٹوری کو سٹیج کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔کہانی کا وقوع اُندلسی عہد تھا جب حال کا سپین اُندلس تھا اور مسلمان اُس پر قابض تھے۔کہانی چند کرداروں پر مشتمل بیاض یا بیاد Bayad شامی تاجر کا خوبصورت بیٹا ریا دیا ریاض Rayad ایک تعلیم یافتہ غلام لڑکی جو اُندلسی وزیر کی ملازم تھی۔وزیر کی بیٹی، ایک بوڑھی عورت جو بیبلون Babloyn سے تھی کہانی بیان کرتی ہے۔بیاد کیلئے منصور کو چنا گیا کہ وہ کردار کیلئے موزوں تھا۔مگر ریاد کیلئے پائل موزوں نہ تھی۔بڑے سر بڑی آنکھیں قدرے مڑی ناکیں بھرے ہوئے گال اور ٹھوڑیاں اور چھوٹے پیروں والی عورتیں درکار تھیں۔

منصور تو ابھی گیتا ڈینو سے پائل کیلئے بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔جب پائل سیدھی اُن کے پاس بھی پہنچ گئی۔وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''میری بچی تمہارے چہرے اور نقوش نے مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں میں اپنی ناک توڑ کر ذرا ٹیڑھی کرلوں گی۔آنکھیں اور سر بڑا کرنے کا نسخہ بھی مجھے معلوم ہے''۔

وہ بہت ہنسیں۔

پس منظر میں موسیقی کی تانوں میں اُبھرتی ڈوبتی اس کہانی کے کرداروں نے اُس دور کے مورش (سپین میں مسلمانوں کو مور کہا جاتا تھا) کلچر میں سانس لیتے عود و رباب کے ساتھ ایسی اداکاری اور صداکاری کی کہ ہال میں بیٹھے ناظرین کی ایک اکثریت یورپی ملکوں سے ہجرت کر کے آنے والے یہودیوں کی تھی جنہوں نے آرٹ اور کلچر کے نامانوس رنگوں میں گندھی اس پیشکش کو موسیقی کے تال میل کے ساتھ دیکھ کر لطف اٹھایا تھا۔ہاں تنگ نظر لوگوں کا اعتراض بھی تھا کہ آخر اِس کہانی کو کیوں چنا گیا؟

تاہم یہ معصوم سا جوڑا بہت مشہور ہوگیا۔سکول لڑکیوں اور لڑکوں میں جہاں پائل اور منصور کو اپنے کلاس فیلوز اور سکول فیلوز کی بھی جلی کٹی باتیں اور طنزیہ ہنکارے سُننے پڑتے۔پائل تو ہنستے ہوئے تڑتڑ انہیں جواب دیتی اور جُوتے سے فرش بجاتے ہوئے کہتی۔

''مائی فٹ''۔

''کیا دن تھے وہ بھی منصور کے اندر سے بہت لمبی سانس نکلی تھی۔اُس نے گاڑی سٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے اُسے چلاتا ہیم گنم Hame Ginim روڈ سے بن گوریاں روڈ پر آگیا جس سے دو قدم آگے ایلین بی روڈ پر جرمن کالونی تھی اور پائل کا گھر تقریباً مین پر ہی تھا۔گھر کے سامنے رُک کر اُس نے کلائی پر نظر ڈالی اور خود سے کہا۔

''ایک گھنٹے سے کم تو کسی صورت ممکن نہیں ہاں زیادہ کا ذہن میں رکھوں۔دو ماہ کی باتوں کا ذخیرہ ڈھوڈا (عبرانی میں خالہ چچی) نے سُنانا ہے۔کارمیلا سیوتا (دادی نانی) کے بھی دُکھڑے سُننا ہیں۔

''گھٹنوں میں بہت درد رہنے لگا ہے۔کان شائیں شائیں کرتے رہتے ہیں۔بھولنے کی بھی بیماری ہوگئی ہے''۔

ڈیوڈ آنکل آج آفس میں ہوں گے۔گھر ہوتے تو انہیں بھی چیک کر لیتا۔

اُسے ہارن بجانے سے ہمیشہ کی چڑ تھی۔خود ہی گیٹ کھولتا۔گاڑی اندر لاتا۔اس دوران ریڈینا یا کارمیلا دونوں میں کوئی ایک باہر آجاتا یا دونوں ہی۔اس پر نظر پڑتے ہی اُنکے چہرے پھول کی طرح کھل اٹھتے۔واری صدقے ہوتیں۔آج بھی ایسا ہی ہوا۔دو گھنٹوں میں بھی منصور کی جان چھٹنی مشکل ہوگئی۔

''کارمیلا سیونا آپ کو یہ گولیاں کھانی ہیں۔آپ نے میری بات سنی''

''ہاں سُنی'' کارمیلا نے سر ہلایا۔

منصور ریڈینا کی طرف متوجہ ہوا۔

''ڈھوڈا آپ ذرا فکر نہیں کرتی ہیں خود کا۔ہڈیوں کی ٹوٹ پھوٹ بہت تیزی سے ہو رہی ہے۔دودھ آپ پیتی نہیں ہیں۔دہی سے آپ کو الرجک ہے۔پلیز ڈائٹ ٹھیک کریں''۔

منصور جانے کیلئے اُٹھا۔

''تم کھانا کھائے بغیر کیسے جاسکتے ہو؟'' ریڈینا نے ہاتھ پکڑ لیا۔

ڈھوڈا مجھے قاہرہ جانا ہے۔''منصور ہنسا۔

''چلے جانا میں تمہیں کھانے کے بغیر کیسے بھیج سکتی ہوں۔یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟

عین اُسی وقت پائل کا فون آیا تھا۔ریڈینا نے سُنا اور ساتھ ہی خوشی سے چلاتے ہوئے کہا

''پائل منصور بھی یہیں میرے پاس ہے۔''

بڑا رکھ رکھاؤ والا ہونے کے باوجود منصور کا چہرہ اندرونی خوشی سے لو سا دینے لگا

تھا۔چند لمحوں بعد یرڈینا نے ریسور اُسکے کانوں سے لگا دیا۔

آج دو میل پیدل چلی تو تمہارے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کیں۔منصور کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔آنکھوں میں جگنو سے ٹمٹائے اُسنے کہا ابھی تمہارے ساتھ حجاز ریلوے سٹیشن پر تھا۔دیکھو تو پائل انہوں نے اسٹیشن کمپلیکس کو ریلوے میوزیم بنا دیا ہے۔میں اندر نہیں گیا بس باہر سے دیکھا۔میوزک سکول کی یادوں نے بھی گھیر لیا تھا کتنی دیر اُنکے ساتھ رہا۔

اُسے احساس تھا یرڈینا نے بیٹی سے بات کرنے کی اپنی خواہش کو پسِ پشت ڈال کر اُسے موقع دیا تھا ابھی تو کارمیلا سیونا بھی پر امید نظروں سے کھڑی دیکھتی تھی کہ اُس کی باری کب آتی ہے؟

پائل ڈھوڈا سے کہو اپنی صحت کی طرف سے لاپرواہی نہ کیا کریں۔اور ساتھ ہی یرڈینا سے کہا۔

''بات کریں ڈھوڈا۔''

یرڈینا سے اپنے رخساروں اور ماتھے پر بوسے لیتا وہ رُخصت ہوا۔یرڈینا گیٹ پر کھڑی اُسے اس وقت تک دیکھتی رہی تھی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اُس کے اندر سے ہوک سی اُٹھی تھی۔

''ہائے کیسا ہیرا سالڑکا ہے پر نصیب میں ہی نہیں۔''

ملٹری اسپتال میں منصور احمد کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔اس کی باتوں میں شکستگی اور دل گرفتگی تھی۔اپنے مُلک کے مستقبل سے خوف زدہ اور مایوس نظر آتا تھا۔عرب سنجیدہ نہیں۔خولوں میں بند ہیں۔اپنے اپنے مفادات سے اُوپر اُٹھ کر کچھ دیکھنے کیلئے تیار نہیں۔دشمن عیار ہے، منظم ہے، کیل کانٹے سے لیس اور پوری پلاننگ Planning سے

سرگرم اور پشت پر بڑی طاقتوں کی سپورٹ کے ساتھ غراتا ہے۔ ناصر نے عرب لیگ سے تنظیم آزادی فلسطین (PLO) کو سیاسی نمائندے کے طور پر تسلیم تو کروالیا ہے مگر اِس تنظیم کو جس طریقے سے منظم کرنے کی ضرورت ہے وہ نہیں ہے۔ گوریلا کاروائیوں میں یہاں وہاں حملے کرنے بے سود ہیں۔ اسرائیل کے لیے یہ خطہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

''میں تمہارے تجزیوں سے سو فی صد متفق ہوں تاہم تم جس کیفیت میں ہو وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

منصور رودرن خانہ آپ آثار و شواہد کی روشنی میں جانتے ہوں کہ ایک مکار اور طاقتور دشمن کے مقابلے پر آپ کے مُلک کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ اسرائیل آغاز سے ہی ایک خودمختار اور مضبوط مصر کے سخت خلاف تھا۔ اُس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ برطانیہ نہ مصر کو خالی کرے اور نہ اُسے آزاد کرے۔ فری آفیسرز کی انقلابی کمانڈ کونسل کے جنرل مجیب نے اسرائیلی عزائم کو جانتے سمجھتے ہوئے بھی دلیرانہ اقدامات کیئے۔ اُس نے سہمی ہوئی یہودی اقلیتوں کو باوجود فلسطینی مسئلے کے تحفظ فراہم کیا۔ انہیں یقین دلایا۔ یوم کپور پر قاہرہ کے شینی گوگ کا دورہ کیا۔ مگر ہوا کیا؟ ان بدبختوں نے آپریشن سوسانہ ترتیب دیا۔

نوجوان مصری یہودیوں کا پورا گروہ جو اسرائیل کیلئے جاسوسی اور تخریب کاری کیلئے کام کررہا تھا۔ جن کا ایک پروجیکٹ انقلاب کی سالگرہ پر بیک وقت قاہرہ کے بہترین سینما گھروں کو فلم دیکھنے کے دوران بموں سے اڑا دینے کا تھا۔ اب یہ ہماری اور ہمارے مُلک کی خوش قسمتی تھی کہ منصوبہ افشا ہو گیا۔

یہودی دہشت گردوں کی سزائے موت نے اسرائیل کو ہیجان میں مبتلا کردیا تھا۔ نہر سویز والے سلسلے میں مقدر نے ناصر کا ساتھ دیا مگر اب ناصر کو ذلیل اور مصر کو شکست دینے کیلئے ہر حربہ استعمال کیا جارہا ہے۔ میں معجزوں کا قائل نہیں۔ مصری فوج اِس وجہ

پروفیشنل Professional نہیں جتنی ضرورت ہے۔کردار کے لحاظ سے بھی کرپٹ ہے۔

دراصل آپ کے دشمن کا تو موٹو Moto ہی یہ ہے By way of deception۔میں تمہیں سچ بتاؤں میں اسرائیلی انٹیلی جنس کی ہٹ لسٹ Hit List پر ہوں۔ہماری زندگی تو مصر کے ساتھ ہے۔

منصور حیرت زدہ سا گم سم اُسے سُنتا تھا۔دیر بعد اُس کی دلجوئی کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے لگتا ہے تم ڈپریشن Depression میں ہو۔چلو چھوڑو۔آؤ ہم اپنے زمانہ طالب علمی کی باتیں کریں۔اُن دنوں کی جب تم اور میں ایک ایک نمبر پر لڑتے تھے۔جب تم اسرائیلی لڑکوں سے ریاضی کے مشکل سوالوں پر بحث کرتے ہوئے کہتے تھے۔''وہ ایڈورڈ تو تمہیں بہت اچھی طرح سے یاد ہوگا جو تم سے اکثر بحث مباحثے میں اُلجھا رہتا تھا۔

''یہ جو ریاضی میں صفر مصیبت ڈالتا ہے تو یہ صفر عربوں کی ایجاد ہے۔عرب مشکل قوم ہے۔اپنی آئی پر آئے تو وختہ ڈال دیتی ہے۔بے شک تاریخ کھول لو۔''

احمد کھلکھلا کر ہنس پڑا۔''منصور دعا کرو ہم اسرائیل کو وختہ ڈال دیں۔

مہینوں بعد اس کے ہونٹوں پر ہنسی بکھری تھی۔اُس کے پژمردہ سے چہرے پر جیسے پل بھر کیلئے بشاشت کے رنگ پھیل گئے۔چند لمحوں بعد اُس نے منصور سے پوچھا۔ہاں یار تمہاری ایک دوست تھی۔یہودی تھی شاید۔بڑی تیز طرّار سی تھی۔لڑکے تمہیں اس کے نام سے چھیڑا بھی کرتے تھے۔''

منصور مسکرایا۔تم یائل کی بات کرتے ہو۔وہ آج کل امریکہ

میں Pederiotic میں سپیشلائزیشن specialization کر رہی ہے۔

احمد ہنسا اور بولا۔ ''بچپن کی دوستی یادِ رفتہ بن گئی ہے یا ۔۔۔۔''

منصور نے ''یا'' کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''یار یہ تم ہنستے ہوئے کتنے اچھے لگے ہو۔ چلو اب اُس پریشانی کو میرے ساتھ شیئر کرو جس نے تمہیں بیڈ پر ڈال دیا ہے۔''

ایک شکستہ سی آہ جیسے اُن لبوں پر تھرتھرائی تھی۔ سامنے کھلی کھڑکی سے باہر کے منظروں میں چاند کی پوری جوانی دہک رہی تھی۔ دیر تک وہ اُسے دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔

''قاہرہ کا آسمان شام سے ابر آلود تھا۔ شارع عزیز کی ایک بک شاپ Book Shop پر کھڑا کچھ کتابیں دیکھ رہا تھا جب ایک رسیلی سی آواز پر مجھے اپنے دائیں بائیں دیکھنا پڑا۔ ایک بے حد دل کش چہرہ سیاہ پھولوں والے سکارف میں لپٹا ٹخنوں کو چھوتے ثوب میں میری طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھا۔

''معذرت چاہتی ہوں کیا آپ مجھے اپنا قلم تھوڑی دیر کیلئے دے سکتے ہیں۔''

''کمال ہے آپ کتابوں اور سٹیشنری کی شاپ پر کھڑی ہیں اور پین Pen مجھ سے مانگ رہی ہیں۔''

خجالت بھری شرمندگی سے سوری "sorry" کہتے ہوئے اُس نے ابھی سر جھکایا ہی تھا جب میں نے پین کی کیپ اُتار کر اُس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔

''لیجیے۔ بس آپ کے چہرے پر جو دیکھنا چاہتا تھا وہ دیکھ لیا۔''

اُس نے ادائے ناز سے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہتی ہو بڑے شیطان ہیں۔

تعارف بھی جلد ہی ہو گیا۔ وہ فلسطینی تھی رائیدہ۔ السموع گاؤں کی۔ 1948ء

میں جب اُس کا گاؤں اسرائیلیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا وہ کمسن تھی صرف تین سال کی۔ گولہ باری اتنی شدید تھی کہ سارا گھر، ماں باپ، بہن بھائی سب ختم ہوگئے۔ ایک پھوپھی بچی تھی جو اُسے گود میں اُٹھائے ننگے پاؤں بھاگی تھی۔ مہاجر کیمپ میں پلی بڑھی۔ پھوپھی کی وفات کے بعد کسی فیملی کے ساتھ قاہرہ آگئی۔ یہاں چھوٹے موٹے کام کرتی کرتی اب ایک انٹرنیشنل ایڈورٹائزنگ ایجنسی International Advertising Agency میں جاب job بھی کررہی تھی اور ساتھ ساتھ میں پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

میں نے کافی Coffee کی ایک پیالی پینے کی اُسے قریبی کافی بار Coffee Bar پر پیشکش کی۔ دو گھنٹے کی اِس نشست کے بعد جب ہم اُٹھے تو ایک دوسرے سے آئندہ ملنے کا وعدہ لے چکے تھے۔

سچ تو یہ تھا کہ اُس نے مجھے موہ لیا تھا۔ پرستار تھی میری۔ میری دراز قامتی کی مداح۔ میرے نقوش میں اُسے یونانی دیوتا نظر آتے تھے۔ میرے حُسن واخلاق نے اُسے باندھ لیا تھا۔ تحائف سے بھی لاد دیا تھا مجھے۔ مہنگے پرفیوم، قیمتی جرمنی کی شرٹس، نائیاں، جرابیں۔ میں جز بز ہوتا تو اپنائیت اور ملائمت میں بھیگا کوڑا مجھ پر برساتی۔

''بہت بے مروت ہو۔ مجھے اتنی سی خوشی دینے میں اتنے بخیل ہو؟ میں اتنا کماتی ہوں۔ کہاں لے کر جانا ہے اتنا پیسہ؟ کونسا میرے سگے بیٹھے ہیں؟''

''تم فلسطینی بچوں کیلئے ڈونیٹ Donate کیا کرو۔'' میں نے ایک دن کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو۔ فلسطین سے بڑھ کر میرے لئیے کون ہے۔ میرا سب کچھ فلسطین کیلئے ہی تو ہے۔''

مجھے محسوس ہوتا کہ اُس کے اندر اسرائیل کیلئے ایک آگ تھی۔ تم یقین کرو میرا جی چاہتا ہے میں اپنے وجود سے بم باندھ کر بیس اسرائیلیوں کو اُڑادوں اور خود بھی اُڑ جاؤں۔

اکثر وہ مجھ سے پوچھتی مجھے بتاؤ تم فوجی کیا کر رہے ہو؟ کس طرح اپنے اس موزی دشمن کا مقابلہ کرو گے؟

اُن دنوں حالات میں بہت تناؤ تھا۔ پی ایل او (PLO) گوریلا سرگرمیوں میں خاصی تیز ہو چکی تھی۔ یہ حملے اسرائیل میں خوف اور دہشت کی فضا پیدا کر رہے تھے۔ میں اُسے اکثر و بیشتر لبنان اور غزہ پٹی کی جانب سے ہونے والے پیشگی حملوں کے بارے میں بھی بتاتا۔

ایسی ہی ملاقاتوں میں میں نے اُسے بتایا کہ اسرائیل نے اپنی بہت خوبصورت لڑکیاں مصر بھیجی ہیں۔ مصری فوجی افسروں کو پھانسنے اور اُن سے معلومات حاصل کرنے کیلئے۔

اُس نے جواباً فوراً کہا۔ خدا غارت کرے اُسے، یہ احمد باتیں اور افواہیں زیادہ پھیلتی ہیں۔ حقائق کم ہوتے ہیں۔ اسرائیل کے چار بندے مرتے ہیں تو عرب اخبارات چالیس بتاتے ہیں۔

"نہیں"۔ میں نے رائیدہ کی بات کاٹی۔ عورت کو استعمال کرنا اُن کے مشن کا ایک اہم حصّہ ہے۔ بھئی یہ ان کی سٹریٹیجی strategy کا ایک اہم حصّہ ہے۔ اس پس منظر بھی سُن لو۔

لگ بھگ 1887ء میں روسی یہودیوں نے Lovers of Zion کے نام سے ایک پارٹی بنائی۔ اس کا بنیادی مقصد ہی ارضِ موعود کو اپنے قبضے میں لینے کا تھا۔ فری میسنز Free Masons نامی اور ایسی ہی دیگر کئی خفیہ تحریکیں بھی اسی کی مختلف کڑیاں ہیں۔ 1918ء میں یہودیوں کی ایک بہت بڑی سازش پکڑی گئی۔ یہ خفیہ دستاویزات کی صورت میں تھیں جس کا نام Protocols of the Learned Elders of

Zion تھا۔اِن میں یہودیوں کے وہ تمام منصوبے اور پروگرام درج تھے جوانہوں نے دُنیا پر حکومت کرنے کے سلسلے میں تیار کیے تھے۔اِن دستاویزات میں پروٹوکول نمبر 3 میں علامتی سانپ کا ذکر ہے۔یہودی قوم نے سانپ کی سی مکاری سے دُنیا کو فتح کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔اِس مقصد کیلئے خوبصورت عورتوں کا استعمال بھی ضروری سمجھا گیا۔انہیں استعمال کر کے دوسری قوموں کے رہنماؤں میں اخلاقی بے راہ روی پیدا کرنے اور اہم معلومات کے حصول پر زور دیا گیا اور یہی پالیسی اب یہاں استعمال کی جارہی ہے۔

رائیدہ خوبصورت آنکھوں میں حیرت لیے مجھے دیکھ اور سُن رہی تھی۔

''میرے پاس اِس کتاب کا ایک انگریزی میں ترجمہ شدہ نسخہ موجود ہے۔دوں گا تمہیں پڑھ لینا۔''

ایسے ہی دنوں میں سے ایک رات جب وہ میرے ساتھ ریستوران Restaurant میں بیٹھی کھانا کھاتی تھی اور مجھ سے شاہ حسین اور ناصر کے درمیان اختلاف کی حقیقی وجوہات جاننے اور اسرائیل کے ساتھ جنگ کی صورت میں دونوں کے درمیان اکٹھے ہونے کے کتنے امکانات ہیں کے بارے میں جانکاری کرتی تھی۔

عین اُس وقت میں نے وڈیچ حداد کو دیکھا تھا۔وہ تیزی سے میری پشت کی جانب سے نکل کر سامنے آیا تھا۔اس پر نظر پڑتے ہی میں کھڑا ہوا کہ اُسے آواز دوں یا وہ رُخ پھیر کر مجھے دیکھے۔مگر وہ بجلی کی سی تیز رفتاری سے ایک ایسی جگہ جا کر کھڑا ہوا جہاں وہ لوگوں کی نظروں کی زد سے باہر تھا تاہم میں اُسے دیکھ رہا تھا اُس نے صرف ایک لمحے کیلئے مجھے کلینڈ سٹائن کا ایک مخصوص سگنل دیا اور غائب ہو گیا۔وڈیچ ڈبل ایجنٹ تھا۔ہم نے کھانا ختم کیا اور رُخصت ہوئے۔

سہ پہر کے وقت میں نے Dead drop سے وڈیچ کا خط اُٹھایا۔اپنے کمرے

میں آ کر تین لائنوں پر مشتمل ایک پرزہ ہمارے کوڈ الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔

''جس لڑکی کے ساتھ تم رات کھانا کھا رہے تھے وہ اسرائیلی جاسوس ہے۔''

میں سناٹے میں تھا۔ ودلیح کی بات غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بڑا سمارٹ ایجنٹ تھا۔ اگر یہ بات درست تھی تو میری زندگی پر ہزار بار لعنت تھی میں تو بھاڑ جھونکتا رہا تھا۔ بائیس (22) تئیس (23) سالہ لڑکی مجھے بیوقوف بنا گئی تھی۔

شاید کے لفظ نے میرے اندر سر اُٹھایا تھا۔ اس لفظ میں اُس کا موہ لینے والا حُسن، اس کی ادائیں اور محبت و پیار کے وہ سب اظہار تھے جنہوں نے میری عقل پر پٹی باندھ دی تھی۔ مجھے اپنی نالائقی پر افسوس ہو رہا تھا۔ ہمارے لیئے تو لازم ہوتا ہے کہ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھیں۔ کئی ماہ سے یہ خبر گردش میں تھی کہ اسرائیلی حسین جاسوس لڑکیاں مصر میں داخل ہوئی ہیں۔

''ودلیح سے ملاقات ضروری ہے۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

اِس ملاقات نے مجھے پچھتاوے کے جہنم میں پھینک دیا۔ اپنی شرمندگی مٹانے کیلئے یا کہہ لو اپنی مدافعت میں کچھ کہنے کیلئے میں نے اپنی زبان کھولی ہی تھی جب ودلیح میرے اوپر برس پڑا۔

''الو کے پٹھے وہ موساد کی ڈون Kidon برانچ (خطرناک) سے ہے اِسے کوئی ایک بار تھوڑی میں نے کئی بار کنگ سلیمان بولیوارڈ Bulevard پر واقع ہارڈ فنا Haderdefina کے مین فلور Main Floor پر آتے جاتے دیکھا ہے۔ یہ موساد کا ہیڈ کواٹر ہے۔''

اُس نے جنرل قمر مری کے بھی چیتھڑے اڑا دیئے تھے کہ اُس کے آشیانے پر ہر چند دنوں بعد ایک نیا حسین چہرہ نظر آتا ہے اور یہ چہرے کن کے ہیں؟ تم اور میں دونوں

جانتے ہیں۔

مصر کی شہرہ آفاق اداکارہ اور گلوکارہ لیلیٰ مراد زیر بحث آ گئی تھی۔ اسرائیلی کنیسٹ knesset (پارلیمنٹ) میں مناجاتیں پڑھنے والے ربّی کی بیٹی تھی۔

اس کیس کی ساری تفصیلات مجھے یاد آ گئی تھیں۔ ظالم کی آواز اُس کا گلا۔ The Day of departure جیسے اُس کے پہلے گانے نے ہی اُسے شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا تھا۔

مصریوں نے یہودی ہے، یہودی خاندان سے ہے جیسے ہر مذہبی تعصب سے بالا ہو کر اُسے سراہا تھا۔ قطع نظر اِس سے کہ امّ کلثوم نے بھی در پردہ اُسے اپنی تنقید کا نشانہ نہ بنایا تھا۔ وہ اسرائیلی تنظیموں کو بہت پیسہ بھیجتی ہے۔ ایسی رپوٹوں پر بھی کچھ خاص نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔ اُس نے مصری ڈائریکٹر اور پروڈیوسر انور وجدی سے شادی کر لی تھی۔ مسلمان ہونے کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ مصری تو اُس کے معاملے میں حد درجہ نرم گوشہ رکھتے تھے جبکہ شامیوں نے اُسے بین کر دیا تھا۔ ناصر کے دل میں اس کے لیے بڑا نرم گوشہ تھا۔ اس نے شامیوں سے اُس پر پابندیاں اٹھانے کے لیے کہا مگر وہ نہیں مانے۔ اُن کا اصرار تھا کہ وہ اسرائیلی ایجنٹ ہے۔ مصریوں کی آنکھوں پر ہمیشہ پٹیاں بندھی ہوتی ہیں۔

اگلے دن اُس کا فون تھا۔ کوئی مصروفیت؟ کہیں جانا تو نہیں؟ شام میں گھر آ جاؤں۔ مجھے اپنے تعلق کے ٹوٹنے کا رنج نہ تھا سچی بات ہے میرا اندر میری نالائقی پر سُلگتا تھا۔

''مصروفیت بھی اگر ہے تو وہ تمہاری کمپنی سے زیادہ تو اہم نہیں۔ تم ہمیشہ تکلف کرتی ہو۔''

ان دنوں میں قاہرہ جدید کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ عمارہ اور دونوں بچے

لکسر (مصر کا ایک شہر) میں ہوتے ہیں ۔میرے پاس وہ اسی فلیٹ میں آتی تھی ۔اُس شام میں ایک اسرائیلی ایجنٹ ایلی کوہن کی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔

ایلی کوہن شامی گورنمنٹ کے وزیر دفاع کا چیف ایڈوائزر Chief Advisor اور شام کے ملٹری، سیاسی اور سماجی حلقوں کی بے حد اہم شخصیت کے طور پر جانا جاتا تھا۔شامی حکومت پر اُس کا بہت اثر و نفوذ تھا۔راز فاش ہو گا تو 1965ء میں اُسے شامی حکومت نے پھانسی دے دی تھی ۔اسرائیل نے تب بھی بہت شور شرابا کیا۔مختلف حکومتوں سے پریشر ڈلوایا مگر شامی حکومت نے ایک نہ سُنی ۔پھانسی کے پھندے پر ہی چڑھا کر دم لیا۔

تبھی مجھے نوکر نے بتایا تھا کہ رائیدہ آئی ہے۔اُسے کیا کہنا ہے کیا بتاؤں کہ آپ گھر پر ہیں۔"

"میں نے کہا بلانا ہے اور ساتھ میں بتانا ہے کہ اُسے بیٹھنا ہے کہ میں ٹائلٹ میں ہوں۔"

جب وہ چلا گیا میں عقبی کمرے میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہوا جہاں اُس کا مشاہدہ ہو سکتا تھا۔اس وقت کمرے میں میری میز پر اُس جاسوسی کی وہ سب رپورٹیں پڑی تھیں جو جو اُس نے تیار کی تھیں جن میں ایک درختوں کو ٹارگٹ مارکرز بنانے کیلئے اُس نے شامی سپاہیوں سے ان کی پلانٹیشن Plantation کروائی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے متجسس نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔پھر وہ میری رائٹنگ ٹیبل Writing Table پر آئی ۔کاغذات اُٹھائے۔چور آنکھوں سے پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔جس غایت تجسس سے اُس نے اُن کاغذات کو پڑھا انہوں نے شک و شبے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

جب میں کمرے میں آیا میں نے معذرت کی۔

اُس نے ہنستے ہوئے کہا ''کوئی بات نہیں میں نے وقت کٹی کیلئے تمہاری میز کو دیکھا۔یہ کاغذات نظر آئے اور ساتھ ہی سوال جواب کا سلسلہ شروع کردیا۔

''ناصر کا ایک بڑا مقصد اسرائیل کو ہراساں کرنا بھی ہے۔تمہارا کیا خیال ہے؟''

میں نے معمول کے مطابق سب جواب دیئے۔

اگلے چند دنوں میں اُس کے بیگ کی خفیہ تہوں سے چھوٹے سے وائرلیس سیٹ کا بھی انکشاف ہوگیا۔

ہم ویک اینڈ Weak End پر اسکندریہ جارہے تھے۔دو دن پہلے میں نے اُسے بتایا تھا کہ مجھے اپنے جنرل سے کام ہے۔اطلاعی انداز میں یہ بات کہنے کے بعد میں خاموش ہوگیا تھا۔میری یہ خاموشی قصداً تھی۔

یقیناً میں اُس کے تاثرات کا جائزہ لینا چاہتا تھا اور میرا اندازہ سو فی صد درست تھا وہ فوراً ہی بول اٹھی تھی۔

''میں بھی تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔اسکندریہ جیسی خوبصورت جگہ پر تمہاری قربت وقت اور لمحوں کو یادگار بنادے گی۔''

''ضرور چلو۔تمہاری رفاقت میں سفر بہت خوشگوار ہوگا۔میں تمہیں اپنے جنرل سے بھی ملاؤں گا۔بہت مجلسی آدمی ہے۔یقیناً ایسی باغ و بہار شخصیت سے ملنا اُس کی خوشی دیدنی تھی۔فرطِ مسرت سے اُس نے کلکاری سی ماری اور کہا۔

''واقعی تم مجھے اپنے جنرل سے ملاؤ گے۔''

''کیوں نہیں۔''

میری ذاتی گاڑی میں قاہرہ سے اسکندریہ تک کا سفر ڈھائی گھنٹے میں ہوا۔شام

ڈھل رہی تھی جب ہم سٹینلے برج پر آئے۔سٹینلے برج تعمیراتی شاہکار کا نادر نمونہ ہے۔اس کا تعمیری پیٹرن patternتر کی فلورنٹین Florentine(اٹلی کا شہر فلورنس) کے ساتھ اسلامی طرز تعمیر کا بھی حامل ہے۔

ماحول کس قدر رومانوی تھا۔پر کہیں میرے اندر جیسے آگ سلگ رہی تھی۔پھر سورج کی دم واپسی کرنوں کو بحیرہ روم کے پانیوں پر بکھرتے دیکھتے ہم پیدل چلتے سٹینلے بیچ پر آ گئے۔San Giovanni سے فریسکو پیک کروایا۔کشتی کرایے پر لی اور سمندر میں اُتر گئے۔

فریسکو کھاتے اور کوک پیتے ہم نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔اِس دوران میں چیک کر چکا تھا کہ کوئی آلہ اُس نے بگ Bugتو نہیں کیا ہوا ہے۔پہلے مرحلے میں مَیں نے کمال عیاری سے اُس کا بیگ پانی میں پھینکا وہ مضطرب سی ہکلانے لگی تھی۔

''اُف یہ کیا ہوا۔میری بہت ضروری چیزیں تھیں اُس میں۔''

اُس کا اضطراب اُس کی بے چینی اُس کا کہنا ''واپس چلیں'' جیسے الفاظ کی تکرار تاہم ایک بات کا مجھے اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ کس مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی۔ہم اب ساحل کی روشنیوں سے کافی دُور آ گئے تھے۔

دفعتاً میں نے ذرا کھردری مگر دھیمی آواز میں کہا۔

''تم اسرائیلی جاسوس ہو۔''پرس کو سمندر میں پھینکنے سے وہ جان گئی تھی کہ اُس کا راز فاش ہو گیا ہے۔میں نے نارمل سے لہجے میں صرف اتنا کہا۔

''سچ کہنا۔شاید سچ تمہیں بچا لے۔''

''ہاں'' بہت مختصر سا جواب آیا تھا۔

اس کے بعد کی صورت تمہارے لیے یقیناً سمجھی سمجھائی ہو گی اور تم سوچتے ہوں

گے کہ ایک دو چیخیں تھوڑی سی مزاحمت اور بس یہی نا۔ مگر یہ اتنا آسان نہ تھا۔ اُس نے اس طرح ہاتھ پاؤں چلائے اور یوں بے جگری سے مقابلہ کیا۔ دو مرد اور تیسرا بھی شامل۔ کوئی بیس منٹ کے زبردست مقابلے کے بعد اُسے پانی میں پھینکا گیا اور تم جانتے ہو اُس کے آخری الفاظ کیا تھے۔

''دُنیا کی کوئی طاقت اسرائیل کو فاتح بننے سے نہیں روک سکتی۔''

میں نفسیاتی مریض بن گیا ہوں۔ کیوں۔ کیا میری مردانگی کے منہ پر طمانچہ پڑا ہے۔ یقیناً یہ بھی ایک وجہ ہے۔ ایک وجہ میری پروفیشنل نالائقی بھی ہے۔ بڑے بیانے پر یہ میرا پہلا ٹیسٹ کیس Test Case تھا اور میں اس میں چاروں شانے چت پڑا تھا۔

اور اب وہ کہاں کہاں گھسے بیٹھے ہیں کچھ معلوم نہیں۔

''دیکھو ذرا ہواؤں میں کسی خوفناک طوفان کی سرگوشیاں ہیں۔''

باب نمبر: ۱۰

گھر کے دونوں قدیمی ملازم سٹور میں فالتو سامان کے ساتھ رکھے نرد کے تختے نکالنے میں کوئی دو گھنٹوں سے ہلکان ہو رہے تھے۔آج یوسف ضیا کے چند بہت پرانے دوست دو پہر کے کھانے پر آ رہے تھے۔انہیں نرد کھیلنا تھا۔حقہ پینا تھا۔گپ شپ کرنی اور حالات حاضرہ پر جی بھر کر باتیں کرنا اور کڑھنا تھا۔

''مالک کو نرد (پچیسی) کھیلنا کتنا پسند تھا مگر اب تو سال ہا سال گزر گئے ہیں اُنہیں اپنا محبوب کھیل شاید بھول ہی گیا ہے۔''

بوڑھے عبدالرحمن کے لہجے میں دُکھ اور ملال گھلا ہوا تھا۔

''اُنہیں بانسری بجانے کا بھی بڑا شوق تھا اور وہ بجاتے بھی بہت عمدہ تھے۔بڑی خوبصورت بانسریاں تھیں اُن کے پاس۔اُس کے سوراخوں پر انگلیاں رکھتے،اُسے ہونٹوں سے لگاتے تو مانو جیسے فضاؤں میں سریلے سُر بکھر جاتے۔''

دوسرے عمر رسیدہ ملازم سالم رجائی نے دُکھ اور یاس میں لپٹی لمبی آہ نکالی تھی۔

خاصی جدوجہد کے بعد انہوں نے بالآخر مطلوبہ نرد کا تختہ ڈھونڈ نکالا۔ہاتھوں میں پکڑے پکڑے روشنی میں آئے۔جھاڑن سے صفائی کی اور پھر اُسے تنقیدی نگاہوں کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے ایک دوسرے سے بولے۔

''دیکھو تو یہ کتنا پُرانا اور سادہ سا ہے۔تین سال پہلے خالص زیتون کی لکڑی والا ایک نرد جس کی اطراف میں خوبصورت پھولوں پتوں والی بیل کے نقش و نگار تھے اور مجھے اُمید ہے کہ باوجود کہیں کاٹھ کباڑ کے ہجوم میں پھنسے اور گرد و غبار میں اٹے ہونے کے اُس کا

رنگ ابھی بھی چمکتا ہوگا، اُن کے کسی لبنانی دوست نے تحفے میں بھیجا تھا وہ انہیں پسند ہی نہیں۔ کچھ جانتے ہو کہاں پڑا ہے وہ؟

''ہوگا یہیں کہیں۔ کسی دن سٹور کی صفائی کریں گے تو مل جائے گا۔''

''منی ایپل تمبا کو ختم ہوگیا ہے۔ وہ بھی منگوانا ہے۔''

ایک نے دوسرے کو مطلع کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں دیکھو یوسف سے کہنا حاجی یحیٰی کی دوکان سے لائے اُسی کے پاس اچھا ہوتا ہے۔''

سالم رجائی نے ابھی چند ماہ پہلے کے رکھے گئے نوجوان ملازم کو لمبی چوڑی ہدایات دیتے ہوئے جلدی آنے کی تاکید کی اور ساتھ ہی تاسف سے یہ بھی کہا۔

''ارے میں بھی اب سٹھیاتا جارہا ہوں۔ لسٹ میں لکھوانا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ کافی بھی ختم ہوگئی ہے۔ ہاں بھئی آتے ہوئے صلاح الدین سٹریٹ سے تازہ بھنی ہوئی کافی Coffee بھی لے آنا۔'' ہاں میں نے ابو ذریح سے پتھر کی کونڈی نکالنے اور اُسے دھونے کا کہا ہے۔ کافی گھر میں پِسَنی ہے۔

گھر میں بہت رونق تھی۔ ڈاکٹر موسیٰ بھی چند دنوں سے یروشلم آئے ہوئے تھے۔ کل ڈاکٹر منصور کی آمد نے گھر کے سارے نوکروں کو نہال کر دیا تھا۔

پورے گھر کا نظم و نسق اُن تین ملازموں کے ہاتھ میں تھا جو یوسف ضیا سے عمر میں کچھ ہی چھوٹے ہوں گے۔ نہایت پھرتیلے اور مستعد بوڑھے ان کے جدی پشتی ملازم۔ مالک سے محبت کرنے والے اور ان کے مزاج آشنا۔ کتنے مہمان آرہے ہیں؟ کس مزاج کے ہیں؟ کیا پسند کریں گے؟ مینیو menu کیسا ہونا چاہیئے؟ یہ سب سوچنا اور کرنا اُن کا کام تھا۔ یوسف ضیا دھیمے سے لہجے میں ہمیشہ اتنا سا کہتے۔

''ہاں تو بھئی کچھ لوگوں نے کھانے پر آنا ہے اور رات دیر تک ٹھہریں گے۔''

بقیہ کی ساری دردسری اُن کی تھی۔

اب یہ بھی اُن کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ مجادرہ Mojadara ضرور بنانا ہے۔ بھیڑ کا گوشت عرب مارکیٹ سے المعظم کی دوکان سے ہی آئے گا کہ آنکھیں بند کر کے اُس کی کوالٹی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ دہی اور مکھن گھر پر بنانے ہیں اور طبون روٹی مغربی یروشلم کے اُسی تنور سے لاتی ہے جو اُس ایک ٹانگ سے معذور آرمینائی بوڑھے ایگا کا ہے۔

یہ آنے والے مہمان عیسائی، مسلمان اور یہودی تھے۔ مختلف وقتوں میں جن کے آباؤ اجداد ملحقہ عرب ریاستوں سے فلسطین آ بسے تھے۔ ابا ایبان شیلابی عراق کا یہودی جس کا خاندان اُنیسویں صدی کے آغاز میں فلسطین آیا تھا۔ قو بین ولیم اور انور براکی دونوں عیسائی تھے جو اُنیسویں صدی کے وسط میں قاہرہ سے فلسطین شفٹ ہوئے تھے۔ یہ سب جو اپنی عربی شناخت پر نازاں فلسطین کے سرکردہ کاروباری، سیاسی اور علم ادب دوست گھرانے جن کا شمار فلسطین کی اپر سوسائٹی Upper Society میں ہوتا تھا۔ مغربی یروشلم میں جنہیں ان کے خوبصورت گھروں سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ اُن کی صدیوں کی شناخت ختم ہوگئی تھی اور وہ اب مہاجر تھے۔ مختلف مُلکوں میں بکھرے ہوئے، اپنے دلوں پر فلسطین کا داغ لیے ہوئے۔

یوسف ضیا نے بڑی تگ و دو سے چند اور دوستوں کو بھی اکٹھا کیا تھا۔ حنیہ عبداللہ ویسٹ بینک سے آئے تھے فہمی عید بیروت اور عبدالنور دمشق سے۔

قو بین ولیم اور انور براکی دونوں بہت ڈپریشن کی کیفیت میں تھے۔ مغربی یروشلم سے ملحق علاقے اپر بقاع میں انور براکی اپنے گھر کو ڈھونڈتا رہا اور قو بین تلبیہ میں اپنے گھر کو۔ یہ جو کبھی فلسطینیوں کا گوشۂ عافیت تھی آج انہیں یہاں دس جگہوں پر روکا گیا۔ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز نوجوان چھوکرے چھوکریوں نے اُن کے کاغذات چیک کرتے

ہوئے اُن کے دماغ گھما ڈالے تھے۔

قوبین نے اپنے گھر کو پہچان لیا تھا۔ گیٹ اندر سے لاک Lock تھا۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ خادمہ نے دروازہ بھی کھولا مگر انہیں اندر ہی نہ جانے دیا۔ قوبین نے التجا کی کہ یہ گھر اُس کے پُرکھوں کی نشانی ہے وہ اِسے دیکھنے کیلئے کوسوں دُور سے آیا ہے۔ گھر کی مالکن کے چہرے پر زمانے بھر کی درشتی پھیلی۔ زبان سے کچھ کہنے کی بجائے اُس نے اِس زور سے دروازہ بند کیا کہ قوبین کا جی چاہا وہ یہیں گر ے اور پھڑک کر مر جائے۔

یوسف ضیا نے اپنے گھر پر اُن کا استقبال اُسی محبت اور گرم جوشی سے کیا جو اُن کی شخصیت کا ایک حصّہ تھی۔ قوبین اور انور مدتوں بعد اِس کمرے میں آکر بیٹھے تھے۔ یہ پرانے دنوں کی طرح سجا سنورا ضرور تھا مگر بہت ساری تبدیلیاں بھی نظر آتی تھیں۔ چاروں دیواروں میں شیشے کی الماریوں میں جتنی کتابیں تھیں اب پہلے جیسی نفاست سے سجی نظر نہیں آتی تھیں۔ ٹھونسا ٹھونسی زیادہ تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ اُن کا خاندانی کُتب خانہ خالدیہ نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ اس کے لائبریرین نے بہت سی قیمتی کتابیں بچا کر گھر بھجوا دی تھیں جو یونہی الماریوں میں اُوپر نیچے آگے پیچھے ٹھونس ٹھانس کر رکھ دی گئی تھیں۔

ایمان شیلابی کتابوں سے محبت کرنے والا کتابوں کا رسیا، کھڑا ایک ایک شیلف کو دیکھتا تھا۔ فرانسس مارلیش کی ''غابتہ الحق'' اور اُس کا انگریزی ترجمہ The forest of truth دونوں پہلو بہ پہلو سجے تھے۔ اسکی رہلت بارس Rihlat Baris دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ حلب جیسے علمی اور ثقافتی شہر کا باسی جب اپنے شہر سے نکل کر شہروں شہروں گھومتا حلب سے تریپولی، جیفہ، بیبرون، قاہرہ، سکندریہ کو دیکھتا فرانس پہنچتا ہے۔ شہروں کو، عمارتوں کو، لوگوں اور ان کے رویوں کو اُس نے کیسے دیکھا اور محسوس کیا۔ اُس کے دلکش اندازِ تحریر نے اُس کے سفری تاثرات کو اِس قدر دلکش بنا دیا تھا کہ

پڑھتے ہوئے آنکھیں نہیں جھپکی جاتی تھیں۔کوئی دس بار تو اُس نے اِسے پڑھا ہوگا۔کتاب بھی اُس کے پاس تھی پر ان ہجرتوں کے چکروں میں جانے کہاں رہ گئی۔

احمد فارس السدیاق shidyak ماڈرن عرب لٹریچر کا باپ کی ''ایک ہزار ایک راتیں'' دیکھ کر شیلابی کو بہت کچھ یاد آیا تھا۔اپنا گھر ،اپنا کمرہ،رات اور فارس کی کہانیاں۔بائبل کو تفصیلی اُس نے احمد فارس کے ترجمے سے ہی پڑھا تھا۔

ایک پورا خانہ ابن روانڈی پر تنقیدی کتب سے بھرا ہوا تھا۔

سلم ال بسطانی کی A Loss in the Levantine gardens نے بھی بہت سی یادوں کے دریچے وا کیے تھے۔

السدیاق shidyak ماڈرن عرب لٹریچر کا باپ بائبل کو اُس نے تفصیلی اُس کے ترجمے سے ہی پڑھا تھا۔

گھوم گھوم کر وہ کتب دیکھتا رہا۔یہ کمرہ اس کے لئیے نیا نہ تھا۔پر مدّت بعد دیکھنے سے ماضی کی یادوں نے جس طرح گھیراؤ کیا اس میں سانس لینا اُسے اچھا لگ رہا تھا۔

عصر حاضر کے شاعر کیا عراقی، کیا شامی، کیا مصری، کیا فلسطینی سبھی یہاں موجود تھے۔شیلابی نے لمبی سانس بھری تھی اور صوفے پر بیٹھ کر حقے کا کش لگایا تھا۔دیواری موٹے گدوں کی جگہ صوفوں نے لے لی تھی۔کمرے کے قالین البتہ بدلے ہوئے تھے۔ٹینی ایپل تمباکو کی خوشبو تھی جس نے سارے کمرے کو معطّر سا کر رکھا تھا جس میں سانس لینا گویا عہد رفتہ میں جانے کے برابر تھا۔حقے کی لمبی نال سارے میں گردش کرتی تھی اور قہوے کی سروس دیتے پرانے ملازمین کے چہروں پر محبت بھری مسکراہٹیں تھیں اور وہاں بیٹھے ہوئے احساس ہوتا تھا کہ وہ پرانے وقتوں کے پُرلطف دنوں میں کہیں موجود ہیں اور فلسطین ان کے اپنے فلسطین کے شب وروز میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

اس کی آنکھیں گیلی ہوگئی تھیں۔

پر ان کیفیات کی مدت کتنی تھی بس چند لمحے۔قہوے کا گھونٹ بھرتے ہوئے براگلی بات کرتا تھا۔

اِن ظالموں نے تو نام ونشان مٹا دیئے ہیں۔وہ جگہیں جہاں ہم نے اپنا بچپن گزارا۔جس کے چپے چپے پر ہماری دوستیوں،دشمنیوں،لڑائی جھگڑوں اور محبتوں کے جذبات بکھرے ہوئے تھے اُن جگہوں پر جرمنی، پولینڈ اور روس کے لوگ آئے بیٹھے ہیں۔ہمارے وقتوں کا سکون،گھروں کی ترتیب اور حُسن،درختوں کی بہتات، خاموشی،ٹھنڈک،عرب قہوہ خانوں کی گہما گہمی اور چہل پہل سب خواب و خیال ہو گئے ہیں۔

یوسف ضیا نے آنکھیں اُٹھائیں اور انہیں دیکھا اِن آنکھوں میں انہیں محسوس ہوا تھا جیسے جہان لُٹا پڑا ہے۔

جب وہ نرد کھیلتے تھے اور امرالقیس کی شاعری سُنتے تھے۔تو بین ولیم ہنسا اور بولا۔

''میرے بڑے بیٹے کے بچوں نے مدّتوں ہمیں پریشان رکھا۔وہ یروشلم میں جو دیکھتے اور سُنتے تھے اُسے بہت سنجیدگی سے لیتے تھے۔ایک دن جب وہ سب بیٹھے کھیلتے تھے میری چھوٹی پوتی اچانک رونے لگی۔شاید کوئی خوفناک سامنظر اُس کی یادداشتوں میں اُبھرا تھا۔''بڑی بہن کے سامنے جب اُس نے اپنے احساسات کا اظہار کیا تو وہ شفقت سے بولی۔

''فکر نہیں کرو۔آنسو پُونچھ لو۔کاووکجی Kawaukji(سالویشن آرمی کا عرب سپہ سالار)آئے گا۔اُس کے ساتھ بہت سارے بہادر اور جیالے سپاہی ہوں گے۔وہ لبنان کی سرحد پار کر کے فلسطین آئیں گے اور ان سب یہودیوں کا بُھرتہ بنائیں گے۔''

پھر اکثر ہی کا دو کجی کی کہانی دہرائی جانے لگی۔

ایک دن میری بیوی نے بڑی پوتی ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم کیا مسلمانوں اور کیتھولک عیسائیوں کی طرح جرنیلوں اور سپہ سالاروں کو آوازیں دیتی رہتی ہو۔نہیں ضرورت ہمیں ان کی۔ان کے گھوڑوں کے سُم جس دھرتی پر پڑتے ہیں وہاں کی زمین اپنی پرتوں سے اُکھڑ جاتی ہے۔عام آدمی کے خواب اور خواہشیں سب مر جاتے ہیں اور وہ زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔تم یہ کیوں نہیں کہتی ہو کہ آؤ سفید جھنڈا لہرائیں۔صُلح اور امن کی بات کریں۔''

اُس دن مَیں بھی گھر میں تھا۔یہ سب سُن کر زور سے ہنسا۔

''تم بھی نِری احمق ہو بچوں جیسی خیالی باتیں کرتی ہو۔امن اور صُلح کی باتیں اگر طاقتور کرے تب یہ اہمیت رکھتی ہیں۔کمزور کے منہ سے اس کا اظہار اُس کی کمزوری کی دلیل ہے۔طاقت کو زِچ کرنے اور رگیدنے میں مزہ اور تسکین ملتی ہے۔یہ انسانی جبلت ہے۔تم کیسے اس کی نفی کر سکتی ہو؟

میری بیوی نے شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورا۔

''احمق سچائی کی حقیقت جاننا سیکھو خواہ وہ کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو۔''اب چھوٹی سی مثال سے ہی واضح کردوں کہ پی ایل او(PLO) تنظیم آزادئ فلسطین اپنے حقوق کیلئے کھڑی ہوئی۔ان کے دھماکے کرنے اور بم بلاسٹ پر وہ دہشت گرد قرار دے دی گئی۔مگر یہی کام جب ارگن Urgun ہگانا Hagana اور راسٹرن جیسی تنظیمیں کرتی تھیں۔قتل و غارت کے بازار گرم ہوتے تھے۔تب وہ یہودیوں کے نزدیک فدائی مجاہد،ان کے نجات دہندہ اور رہائی باپ تھے تو بس اپنوں اور دوسروں کیلئے ترجیحات کے پیمانے جب مختلف ہوں تو پھر زمین پر وہی کچھ ہوتا ہے جو یہاں ہو رہا ہے۔

''ڈیوڈ بن گوریاں اور میناحم بیگن سے بھی بڑے کوئی غنڈے ہوں گے جو اِس نظریاتی مملکت کے وزیرِاعظم بنے۔''

ایمان شیلابی نے دُھواں فضا میں چھوڑتے اور اس کے نیلگوں غبار میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے کہا تھا۔

بہت مدّت بعد یروشلم کے ہی ایپل تمباکو کے کشوں نے جیسے اُن میں سرشاری سی دوڑا دی تھی۔ٹیپ ریکارڈر Tape Recorder پر شہزادہ امراءالقیس کی شاعری کو سُننا بھی بہت پُر لطف تھا۔

دسترخوان پر بیٹھے تو سبھی مُجادرہ کی ڈش پگھلے مکھن اور دہی کے ساتھ سجی دیکھ کر مسرور ہوئے۔قوبین نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہم فلسطینیوں کی کمزوری۔وہ کیا کہتے ہیں۔

A hungry man would be willing to sell his soul for a dish of mojadara:

''تو بھئی آج ہم بھوکے اِس ڈش کو تر سے ہوئے اِس سے انصاف کرتے ہیں۔''

کھانا بہت لذیذ تھا اور بہت روایتی بھی۔کریم اور تلے ہوئے ادرک سے سجی حمس کی ڈش کھاتے ہوئے تاسف سے انہوں نے ایک دوسرے سے کہا۔

''ان کی ڈھٹائی دیکھو۔زمین پر تو قابض ہوئے ہی ہیں کلچر کو بھی ہائی جیک کر رہے ہیں۔صدیوں پرانی یہ خاص فلسطینی ڈش اب اُن کی بن گئی ہے کوئی پوچھے یہ رُوسیوں کی ہے، پولش والوں کی ہے یا جرمنوں کی، آخر کن کی ہے؟ جو تم اِسے اپنے ساتھ جوڑ رہے ہو۔

قوبین ولیم نے پُشت صوفے کی بیک back سے ٹکاتے اور خود کو ڈھیلا

چھوڑتے اور لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔ہمارا گھرانہ عربی موسیقی کا کس قدر دلدادہ تھا۔سلامہ حجازی محمد العاشق کی شاعری کا پرستار۔کس شاعر کی کونسی نئی نظم،غزل کہیں چھپی ہے۔کس نثر نگار نے کیا نئی چیز لکھی ہے؟ایک دوسرے کو ملاقات پر فوراً بتائی اور سُنائی جاتی۔میرے والد شام کے ڈھلنے کا انتظار کس بے چینی سے کرتے؟جونہی دھوپ کی تپش کم ہوتی۔وہ باب دمشق کے کیفے میں پہنچ جاتے۔سرکنڈوں کے بنے موڑھوں پر بیٹھے حُقّے کے کش لگاتے اور نوجوان شوقین گائیکوں کو فرید الاطرش کی دُھن گنگنانے کو کہتے۔اِس باب دمشق کے کافی ہاؤس Coffee House اِن لوگوں کے ثقافتی اور تفریحی مرکز تھے جہاں اُن کی شامیں گزرتیں۔جہاں ان کے قہقہوں کے طوفان اُمنڈتے۔یہیں عرب شاعری پر مبنی مختلف دُھنیں مذہبی ترانے بن جاتے جو سبت کے دن گھروں اور شینی گاگوں میں گائے جاتے۔افسردگی میں ڈوبی بڑی لمبی سی آہ تھی جو توبین کے سینے سے نکل کر ساری فضا میں پھیلی تھی۔

''کیا دن تھے وہ۔''مائی گاڈ سمی شیلوم Sami shalom کی Prisoner of Zion بھی کیا چیز ہے۔کبھی کبھی یورپی پس منظر کا حامل کوئی اسرائیلی یہودی بھی بڑی سچی بات کہہ دیتا تھا اس پر بھی بحث ہوئی۔

کتنی کھری اور سچی بات کی ہے لووا ایلیاف Lova Eliav نے۔

''ہم نے اُن سے عربی زبان چھین لی ہے۔اسے زبان اور اس کی ثقافت کو قابل نفرت اور کمتر شے بنا دیا ہے۔''

پھر لتھوانیا کا پیدائشی عبرانی زبان کو زندہ کرنے والے ایلیزر بن یہودا (Eliezer Ben Yehuda) پر بات ہوئی جس نے مری ہوئی زبان کو زندہ کر دیا۔جس نے عبرانی زبان کے احیاء کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔

''میں نے کہا نا وہاں جذبوں میں لگن ہے ایک نظریاتی کومٹمنٹ Commitment ہے۔ جوش وولولہ ہے۔'' یوسف ضیا نے کہا تھا۔ پھر انہوں نے دُکھ سے کہا تھا۔

''ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں۔''

انہوں نے گھنٹوں نرد کھیلا۔

امرا القیس کی لافانی نظم Let us stop and weep سُنی۔ شاعرانہ حُسن سے بھری ہوئی۔ دیر تک اُس پر سر دُھنتے رہے۔

ڈاکٹر منصور جب اندر آیا وہ سب لوگ بہت اُونچے اُونچے ہنس رہے تھے۔ اُن کے قہقہوں میں اُس کا نیا تعارف ڈاکٹر منصور کے طور پر ہوا۔

حنیہ عبداللہ اور فہمی عید نے منصور کی طرف دیکھا اور کہا۔

''ہم اپنے آج کے دن کو بہت خوبصورتی سے گزارنا چاہتے ہیں اور نہیں جانتے ہیں کہ کل ہم میں سے کون ہوگا اور کون نہیں؟''

''آپ ایسی بات کیوں کرتے ہیں؟'' منصور نے اُن سبھوں کو احترام اور محبت کی نظروں کے حصار میں گرفتار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''خدا آپ سب لوگوں کو سلامت رکھے۔''

اندیشوں میں ڈوبے ہوئے حالات کا ایک اور ہنستا مسکراتا روشن دن ڈوب گیا تھا۔ اُن سب کے رُخصت ہونے کے بعد رات کو اُسی کمرے میں تین نسلیں باپ، بیٹا اور پوتا بیٹھے تھے جب منصور نے کہا۔

''جدّی آپ کو اب یروشلم میں اکیلے نہیں رہنا چاہیئے۔ حالات میں دن بدن بڑھتی سنگینی آپ کے سامنے ہے۔''

انہوں نے کوئی جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

''تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟تمہاری دادی کب سے تمہاری شادی کے خواب دیکھ رہی ہے اور تم ٹرخاتے چلے جارہے ہو۔یائل سے اگر تہیہ کیے بیٹھے ہو تو پھر ڈٹ جاؤ۔اللہ مالک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔لڑکی تو وہ میری بھی کمزوری ہے۔''

مگر ڈاکٹر موسیٰ نے باپ کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے حتمی لہجے میں ''نہیں'' کہتے ہوئے بات جاری رکھی۔

یہ شادی آگ پر تیل ڈالنے کے مترادف ہوگی۔بے گناہوں کے خون پر کوئی ذاتی خوشی قبول نہیں۔

''جدّی فلسطین جن حالات سے گزر رہا ہے مجھے تو کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔''

''ان حالات نے تو ابھی اور شدید ہونا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جینا چھوڑ دیں۔آپ کو زندگی کی ہر اُونچ نیچ اور ہر دُکھ سُکھ کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔''

اور منصور لمبی سانس بھرتے ہوئے اپنے دادا کی باتوں پر تھوڑا جزبز ہوا۔

''یہ اپنی جسمانی کمزوری کے باعث اب سفر نہیں کرتے ہیں اور مسائل کی شدت کو اُس طرح نہیں سمجھتے ہیں جیسے ہم محسوس کرتے ہیں۔''

رات کے کھانے کے بعد یوسف ضیا نے قاہرہ ریڈیو سے ناصر کی تقریر سُن کر منصور سے پوچھا تھا۔

ناصر straits of Tiran کو بند کر دینا چاہتا ہے اُس کا کہنا ہے اسرائیلی بارڈر کے قواعد کی خلاف ورزیاں کر رہے ہیں۔اب بس اسرائیل کے ساتھ جنگ ہوگی اور اس کی تباہی ہی ہمارا مقصد ہے۔تم دو ماہ پہلے قاہرہ گئے تھے کیا حالات ہیں وہاں کے؟

اُس وقت منصور بحث وتبصرے کے کسی موڈ میں نہیں تھا۔شاید اسی لیئے اُس نے

نہ تو احمد کے بارے میں کچھ بات کی اور نہ ہی مصری فوج پر کوئی رائی زنی کی ۔ بس گول مول سا جواب دے دیا۔

اس نے سوچا اُس کا دادا ایک ڈوبتے انسان کی طرح ہیں جنہیں تنکے بھی سہارا لگتے ہیں مگر وہ اسرائیلی اسپتالوں میں جانے اور فورسز کے لوگوں سے رابطے اور بقیہ چیزوں کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتا تھا کہ وہ جس نظم وضبط ،تربیت اور اپنی اس خودساختہ مادرِوطن کے تحفظ کیلئے چاق وچوبند ہیں وہ چیزیں اُسے مصری، شامی اور اُردنی فوجوں میں نظر نہیں آئیں ۔

اُسی شب انہوں نے منصور کو اپنے ایک مارکسی دوست کے بارے میں بتایا کہ اُن کا سارا خاندان نازیوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہوا تھا مگر پھر بھی اُن کی سوچیں بہت مثبت تھیں ۔ اپنی ملاقات کو یاد کرتے ہوئے وہ ان کی باتیں دہراتے تھے ۔ اسرائیل جو کچھ کررہا ہے آنے والے وقتوں میں اس کے لیے یہ بہت خوفناک ہوگا ۔ خود کو محفوظ کرنے کیلئے جن ہتھکنڈوں پر اُترا ہوا ہے یہ اُسے مستقبل میں اور غیر محفوظ بنادیں گے۔

اور دو دن بعد کی اُس صبح جب دادا پوتا ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے ۔ یوسف ضیا نے ڈاکٹر منصور کے پُرکشش سراپے کو اپنی ہی ستائشی نظروں سے بچاتے ہوئے نگاہوں کو اِدھر اُدھر بے مقصد گھمایا ۔ دل ہی دل میں نظر بد سے محفوظ رکھنے کی دُعا پڑھتے اور خدا سے اُس کی صحت و درازی عمر کا طالب ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''منصور موسیٰ کی بات چھوڑو ۔ تم اگر چاہتے ہو تو یائل کے سلسلہ میں مَیں تمہارے ساتھ ہوں ۔''

اپنے دادا کے رخساروں پر بوسے دیتے ہوئے منصور نے کہا۔

''نہیں جدّی ۔ صرف مسئلہ پیدا نہیں ہوگا بلکہ طوفان اُٹھے گا ۔ کسی کے سہاگ پر کسی کی یتیمی پر اپنی خوشیوں کی بنیاد کیسے رکھوں؟''

ابو سالم پیتل کا بڑا سا ٹفن باکس لیے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ منصور نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

’’کچھ نہیں آپ کے دوستوں کیلئے تھوڑے سے کبی بالز Kibbee Balls ہیں اور فرائی مچھلی کے ساتھ تھوڑا سا کنف ہے۔‘‘

اپنے ملازموں اور اپنے دادا سے ایک بار پھر ملتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ان صورتوں کو چند ماہ بعد کبھی دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا۔

باب نمبر: ۱۱

ڈاکٹر موزز منڈل نے آہستگی سے منصور کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اُٹھا کر دھمیشا ریفیوجی کیمپ سے باہر لے آیا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ سکون اور صبر سے چلو۔ کوئی ایک دن کا رونا ہے یہ۔ دو ماہ سے تم گھر نہیں گئے۔ دن رات مریض، اسپتال اور تم۔ مرنا ہے تمہیں۔''

منصور ہنس پڑا۔ اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں جو ہنسی تھی اُس میں جیسے گہری اُداسی کے رنگ گھلے ہوئے تھے۔

''مَیں بہت سخت جان ہوں منڈل۔''

ابھی دو دن پہلے نابلس سے پانچ خاندان آئے تھے۔ بڑی خوفناک تصویریں اُن آنکھوں کی پتلیوں میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ جبری بے دخلی اور خون خرابے کی کہانیاں اُن کی زبانوں پر تھیں۔ یہاں یہودیوں کی سمارٹین برادری ڈھائی تین سو کی تعداد میں زمانوں سے بیٹھی تھی۔ پر اب یہ تعداد سینکڑوں کیا ہزاروں کو پیچھے چھوڑتی لاکھوں کی منصوبہ بندی میں شامل ہو رہی تھی۔ دیہاتوں کو رڑے میدان بنا کر اُن پر تعمیراتی کام کا آغاز ہو گیا تھا۔

موزز نے سناٹے میں ڈوبی فضا پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''چلو آؤ ذرا واک walk کرتے ہیں۔''

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باہر کھلی جگہ پر آ گئے تھے۔ اسی دوران ڈاکٹر موشے تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کی طرف آیا اور اُس نے مینڈل سے اس کی بیروت سے آنے والی کال call کا کہا اور خود وہ منصور کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔

بڑے سے کھلے میدان کے عقب میں اُونچے ٹیلوں پر اسرائیلی ٹینکوں میں بیٹھے چوکس فوجی نگرانی کر رہے تھے اِن بے خانماں لوگوں کی جو اپنی جڑوں سے اُکھڑ گئے ہیں۔جن کے صدیوں کے نام ونشان کو ملیامیٹ کیا جا رہا ہے۔دونوں زیتون کے اُن دو درختوں کے پاس رُک گئے جو ایک دوسرے کے ساتھ شاخوں کے پھیلاؤ میں اُلجھے ہوئے تھے۔ڈاکٹر موشے نے درخت کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے خالی خالی نگاہوں سے اپنے سامنے دُور تک پھیلے اِس کیمپ کی ٹین کی چھتوں،موٹے کینوس سے بنی جھونپڑیوں کے سلسلوں کے پھیلاؤ پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''کوئی بھی انسان اپنے ماضی سے کبھی نہیں کٹ سکتا ہے۔یہ سائے کی طرح تعاقب میں رہتا ہے اور ہر قدم پر روکتا اور اُسے متوجہ کرتا ہے۔مجھے بتاؤ یہ جو دو ہجرتوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں کیا یہ اپنی زندگی سے اِس حصّے کو نکال سکیں گے۔''

ڈاکٹر موشے خاموش ہو گیا تھا۔کتنی دیر وہ خالی خالی نظروں سے اپنے گرد وپیش کو دیکھتا رہا۔پھر جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بولنے لگا۔

اب ہم سیفارڈی(عرب ممالک سے آنے والے یہودی)ان اشکینازیوں(یورپ سے آنے والے)سے کمتر درجے کے ہیں کہ ہم عرب اور یہودی تہذیبوں کے ملاپ کا نتیجہ ہیں۔ہم کیسے اپنا ماضی کاٹ کر رکھ دیں اور اس کی نفی کریں جو شعور کی آنکھ کھلنے کے ساتھ ہم نے دیکھا اور جو ہمارے ساتھ ساتھ چلا۔

میرا خاندان عراق سے ہے۔میرے آباء کی جڑیں قدیم میسوپوٹیمیا کی بابلی الاصل تہذیب میں گڑی ہوئی تھیں۔بصرہ کے قریب ہی الخصیب گاؤں میں ان کے کھجوروں کے باغ اور مچھلی کا کاروبار تھا۔بصرہ اور بغداد کے درمیانی راستے اُن کے پاؤں کے گہرے یار بیلی تھے۔وہ اپنے عراقی ہونے پر نازاں،عراق کی سیاسی زندگی کے انتہائی سرگرم اور

جوشیلے کردار تھے۔میرے باپ اور چچاؤں نے اُن سب تجاویز کوگاجر مولی کی طرح کاٹ دیا تھا جواندر خانے صیہونیوں اور برطانیہ کی جانب سے اُن تک پہنچ رہی تھیں کہ عراقی یہودیوں کا فلسطینیوں کے ساتھ تبادلہ ہوا۔

میناحم صالح دانیال جوعراقی پارلیمنٹ کا سینیٹر بھی تھا اور میرا چچا بھی۔جس نے بہت شائستہ مگر بے حد سخت الفاظ میں انہیں کہا تھا کہ وہ عراقی یہودیوں کو معاف ہی رکھیں۔انہیں اپنی سرزمین سے بہت محبت ہے اور وہ اُسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتے۔وہ یہاں باعزت اور باوقار ہیں۔انہیں بدلتے حالات میں عراقی قوم کی بیداری میں اپنا حصہ ڈالنا ہے۔عراقی ادیب،عراقی فنکار اور عراقی موسیقار سب مُلک کیلئے سرگرم تھے۔مگر ان صیہونیوں کی سازشیں اور برطانیہ کے عراق بارے اپنے عزائم،دونوں کے گٹھ جوڑ نے یہود دشمنی جذبات کو بھڑکایا۔

ڈاکٹر موشے باتیں کرتے کرتے جیسے پھر پٹڑی سے اُتر گیا باتیں کرتے دونوں لب بند۔آنکھیں جیسے ان کہی کہانیوں میں گم سامنے دیکھتی اور ذہن جانے وقت کی کن کٹھن گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا۔بہت دیر بعد جیسے فضا میں ڈولتی پھرتی پتنگ کی ڈور کا سرا اُس نے پکڑا۔

منصور تم جانتے ہو۔ہم عراقی اور شامی یہودیوں کو یروشلم میں کہاں رکھا گیا؟ جنگ بندی لائن کے ساتھ جہاں کہیں ہم لوگ اُردنی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بنتے اور کہیں فلسطینیوں کے عتاب کا مزہ چکھتے اور اُنہیں چکھاتے۔تمہیں میں سچ بتاؤں ہم لوگ اِن یورپی صیہونیوں کیلئے قابل قبول ہی نہیں تھے۔اس پر ستم ہم ماضی کا ذکر بھی نہ کریں۔اُس ماحول،اُن خوبصورتیوں،اُن پھولوں،پرندوں،پھلوں،پہاڑوں،پانیوں سبھوں سے ناطہ توڑلیں کہ اُن کا تعلق عرب تہذیب سے ہے جو بہت کم مایہ ہے۔میرے

اندر الاؤ دہکنے لگتے ہیں جب میں سوچتا ہوں اِن کیمپوں میں جوان ہونے والی نسل کو ہم کیا دے رہے ہیں؟

دفعتاً ڈاکٹر موشے نے اپنے داہنے ہاتھ کو واچ ٹاور پر بیٹھے فوجیوں کی طرف اشارہ بازی کے سے انداز میں لہراتے ہوئے بند کیا تو منصور کو احساس ہوا کہ موشے کے بازو کتنے لمبے ہیں؟ واچ ٹاور پر بیٹھے ہاتھوں میں بندوقیں تھامے یہ نوجوان چھوکرے گولی چلانا کھیل سمجھتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں کوئی قاعدہ کوئی اصول نہیں۔ جسے چاہیں روک لیں جسے چاہیں مار مار کر لہولہان کر دیں جس کی چاہیں جان لے لیں۔ جس گھر میں چاہیں گھس جائیں۔ ماؤں کے سامنے اُن کے جگر گوشوں کو گولیوں سے بھون دیں۔ پناہ گزینی اُن کا مقدر بنا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر منصور نے دھیرے سے کہا۔ ''موشے چھوڑ دو اِن سب باتوں کو۔ آؤ ذرا دیکھو۔ ہوائیں زیتون کے درختوں اور سیبوں کے پیڑوں سے تیرتی ہمارے چہروں کو چُھو رہی ہیں۔ سورج کی تپش کو ہواؤں کی تیزی کاٹ رہی ہے اور وہاں دیکھو بچے کھیل رہے ہیں۔ اُس نے دُور زیتون کے پیڑوں تلے ہموار زمین کے بچے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو اُن کے پاس باتیں کرتے ہیں۔''

وہ دونوں پھر اُٹھے۔ پتھریلی زمین پر چھوٹی موٹی جھاڑیوں کے پاس سے گزرتے وہ ان کے پاس پہنچ گئے۔ بچوں نے شور مچایا۔

ڈاکٹر منصور ڈاکٹر موشے۔

منصور اور موشے جنین کے کیمپوں میں دو ماہ بعد پندرہ دنوں کیلئے جاتے تھے لیکن اب وہ گذشتہ تین ماہ سے یہیں تھے کہ ایک تو یہاں بمباری کے متاثرین اور دوسرے نیپام بموں کا نشانہ بننے زیادہ تعداد میں لائے گئے۔ چیچک پوٹیں بھی کھمبیوں کی طرح جگہ جگہ

آگ آئی تھیں۔ موت نے جس طرح اِن ٹیڑھی میڑھی گلیوں، ٹوٹے پھوٹے گھروں اور خستہ حال لوگوں کے درمیان رقص کیا تھا وہ بڑا ابھیانک تھا۔

کچھ بچے ان کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ کچھ اپنا کھیل جاری رکھے ہوئے تھے۔ اِن کے کھیل کیسے تھے؟ اُن میں اُن کا بچپن تو کہیں نہیں تھا۔ بموں اور بندوقوں کی باتیں تھیں۔ پتھروں سے مارنے کا ذکر تھا۔

موشے نے دُکھ سے کہا تھا۔

''ہم نے ان کا بچپن ان کی معصومیت ان سے چھین لی ہے کتنے ظالم ہیں ہم۔''

بڑے لڑکے دونوں کو جانتے تھے۔ ایک نے بڑے بھولپن سے کہا۔

ڈاکٹر صاحب ہمارے گھر ملقوبہ پکا ہے۔ آپ کھائیں گے۔ لاؤں۔

منصور ہنسا اور بولا ''پوچھتے کیوں ہو؟ لاؤ لیکن تھوڑا سا لانا۔''

دونوں لڑکے خوشی سے بھاگتے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک ڈش سفید رومال جس پر رنگین دھاگوں کی کشیدہ کاری تھی سے ڈھنپی لائی گئی۔ پانی سے بھرا جگ ساتھ تھا۔ ڈش پر سے رومال ہٹانے سے قبل انہوں نے پانی سے ہاتھ دھوئے اور جب رومال ہٹایا تو بڑا خوش نما سا منظر تھا۔ پھول گوبھی، آلو اور بینگن کے قتلوں سے سجی چاولوں کی ڈش میں مرغی کی دو بوٹیاں بھی جھانکتی تھیں۔ دہی کے رائتے کا پیالہ الگ سے تھا۔

''واہ بھئی واہ۔ ہماری تو تم نے موجیں کروا دیں۔''

دونوں کھانے میں جت گئے۔ بہت مزیدار کھانا تھا۔ ادرک اور بینگوں نے مزہ دیا۔ جب منصور ہاتھ دھوتا تھا موشے لڑکے کو پانچ سو اسرائیلی لیرا پکڑا تا تھا۔

تبھی منصور نے دیکھا تھا۔ سڑک کے پار چیک پوسٹ پر فوجیوں نے گرین لائن کی پرلی طرف ایک گاڑی کو روکا ہوا تھا۔ تین عورتیں اور ایک مرد کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

منصور نے سوچا۔ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی طرف کے کچھ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔دُور سے بڑے بڑے ڈبے بھی نظر آتے تھے جو یقیناً دوائیوں کے ہوں گے۔

ایک دوسرا لڑکا قہوہ لے آیا۔

''حسان بھئی تم نے اپنی امّو کو آج بہت تکلیف دی پر سچی بات ہمیں بڑا مزہ آیا۔اس قہوے نے دعوت کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔اپنی امّو کا خصوصی شکریہ ادا کرنا کہ انہوں نے ہمیں ایسی شاندار ٹریٹ Treat دی۔'' پیالی اُٹھا کر لبوں سے لگاتے ہوئے موشے ہنس رہا تھا۔حسان جھینپ سا گیا۔کچھ بولا نہیں۔محبت اور جذبات کی شدت اُس کی آنکھوں کو نم سا کر گئی مگر ساتھی لڑکا بڑے اعتماد سے کہتا تھا۔

''آپ ہمارے لیے یہاں بیٹھے ہیں۔ہمیں تو چاہیے روز آپ کو اچھے اچھے کھانے کھلا دیں۔مگر ہم اتنے تو غریب ہیں۔''

''میرے پیارے سے بچے ایسی بات دوبارہ کبھی نہیں کہنی۔امیر وہ ہوتا ہے جس کا دل بڑا ہو اور تم لوگوں کے دل اتنے بڑے ہیں۔''

منصور نے دونوں بازو پھیلا دیئے اور ساتھ ہی پانچ سولیرے اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔

''یائیل کا کیا پروگرام ہے؟ کیا اُسے واپس آنا ہے۔'' موشے نے پوچھا۔

منصور نے ابھی جواب نہیں دیا تھا۔جب موشے نے گفتگو کو جاری رکھا۔

''یار منصور شادی کرو۔شور شرابا ہوگا۔خود ہی کچھ وقت بعد دب دبا جائے گا۔''

منصور اِس بار بھی خاموش تھا۔پھر وہ کھڑا ہو گیا۔دُور اُونچے ٹیلوں پر چڑھے اسرائیلی ٹینکوں کے اندر ہیلمٹوں میں پھنسے نوجوان فوجیوں کو جو گذشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے ایک ٹک اُن پر نظریں جمائے بیٹھے تھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں بولا۔

''یار اُٹھ جاؤ اب۔ بیچاروں کی ہم پر بھی آنکھیں پتھرا گئی ہوں گی۔ سکھ کا سانس لینے دو انہیں۔ سولی پر چڑھے بیٹھے ہیں کہ ہم جانے کیا سازشیں کر رہے ہیں؟''

منصور چند سیریس serious مریضوں کو دیکھنے آئی سی یو (I.C.U) وارڈ کی طرف جا رہا تھا جب وہ رُک گیا۔ اُس نے پائل کو دیکھا تھا۔ چند لمحوں کیلئے تو اُسے یقین ہی نہیں آیا۔ ایک مضطرب اور ہیجانی سی کیفیت میں وہ خود سے بولا تھا۔

''میری آنکھوں نے دھوکہ کھایا ہے شاید۔ میں Hullicinated ہوا ہوں۔ سچی بات ہے قصور تو اِن بیچاری آنکھوں کا بھی نہیں کہ وہ بھی ایسے تصوراتی سراب سوتے جاگتے دیکھنے کی عادی ہوگئی ہیں۔

مگر آج سچ مچ وہاں پائل ہی تھی۔ بہت ساری کیفیات اُس پر وارد ہوئی تھیں۔ پل بھر کیلئے لگا جیسے وہ کسی گھپ تاریک رات میں اندھیرا اوڑھے کھڑا تھا اور یکدم آسمان کے سینے پر جگمگ جگمگ کرتی کہکشاں کی بارات نیچے اُتر آئی ہے اور سارا ماحول ایک حسین روشنی سے بھر گیا ہے۔ دوسرے لمحے اُسے محسوس ہوا جیسے وہ جانے کب سے صحرا میں بھٹک رہا تھا آبلہ پا اور خستہ حال سا اور یکدم اُسے نخلستان نظر آ گیا ہے جہاں درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور چشمے کا میٹھا پانی اُس کی پیاس بجھانے اور تھکن مٹانے کو موجود ہیں۔ بارش کے بعد آسمان پر لہراتی قوس وقزح کے رنگوں جیسی پائل کا نظر آنا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

وہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے پتھر سے بنے کھڑے تھے۔ کم وبیش چار سال بعد وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ گو اُن کے درمیان خطوں اور کبھی کبھار فون کا سلسلہ بہت باقاعدگی سے تھا مگر پائل نے اپنے آنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ ایکا ایکی ملنے والی اس خوشی اور سرشاری کی کیفیت کو کوئی منصور کے دل سے پوچھتا۔ اُس کی آنکھوں میں چھلکتے دیکھتا۔ اُس کے چہرے پر رقصاں مسرت کے رنگوں سے

محسوس کرتا۔

اُس کی آنکھوں میں بھی دیئے جلتے تھے۔یائل خفیف سامسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔

''سوری منصور تمہیں لکھ نہیں سکی۔فون بھی نہیں کر سکی۔بس میں نے سوچا اس وقت فلسطین کے لوگوں کو ہماری ضرورت ہے۔''

منصور نے اُسے اپنی بانہوں کے دائروں میں سمیٹا۔اُس کے بالوں پر بوسہ دیا اور ذراسی بھیگی پرچمکتی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔کب آئیں؟

''ایک ماہ ہوگیا ہے۔ہم لوگ اُردن کے کیمپوں میں تھے۔چند دن دمشق کے اسپتالوں میں بھی گزرے۔اریناروتھ نیویارک ٹائمز کی نمائندہ بھی میرے ساتھ ہے۔اُسے اخبار کیلئے رپورٹیں تیار کرنی تھیں۔''

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے اُس بڑے سے کمرے میں آگئے جو عارضی طور پر بنایا گیا اُن سب لوگوں کو لیونگ روم تھا۔کرسیوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھتے ہوئے یائل نے اُسے دیکھا اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''منصور میرے پاس جدّی کے لیے کچھ کہنے کو لفظ نہیں۔تمہارے خط نے مجھے بہت رُلایا۔میں دنوں پریشان رہی۔میری آنکھیں بھیگتی رہیں۔اُن کی شخصیت کے وہ سب دلفریب پہلو ایک کے بعد ایک میرے سامنے آتے اور میری آنکھوں کو بھگوتے چلے جاتے۔ان کی محبتوں اور شفقتوں کے واقعات کی لام ڈوریوں نے دنوں مجھے جکڑے رکھا۔انہوں نے بہت سے رشتوں کا ہمیں مان دیا تھا۔وہ بہت عظیم انسان تھے۔میرا بس نہیں چلتا تھا کہ کیسے میں تم تک پہنچ جاؤں؟پر یہاں آئے تو کیمپوں کی حالت زار دیکھ کر تو کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ایسی بربریت اور ظلم۔''

چند لمحوں تک وہ ایک دوسرے کو نمناک نظروں سے دیکھتے رہے، پھر منصور نے کہا۔

یہاں میرے ساتھ ڈاکٹر موشے اور ڈاکٹر موزز منڈل بھی ہیں۔ میں ذرا راؤنڈ لے آؤں اور انہیں بھی اطلاع کر دوں پھر اکٹھے ہوتے ہیں۔

رات کے کھانے پر وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ انہوں نے دمشق کے اسپتالوں کے متعلق بتایا جہاں نیپام بموں سے جھلسے ہوئے لوگ تھے۔ معصوم بچے تھے۔ قنطیرہ کے کسانوں کی کہانیاں تھیں۔ شام اور اسرائیلی سرحد کے شامی گاؤں اسرائیلی فوجیوں کی اشتعال انگیزیوں کے گواہ تھے۔۔ فیکسے گاؤں پر جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی اسرائیلی وزیر خارجہ موشے دایان نے جس طرح اس کی تباہی و بربادی کروائی ارینا روتھ کو اس پر شدید غصہ تھا۔ ارینا روتھ موشے دایان کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتی تھی۔

ڈاکٹر منڈل نے گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ موشے دایان دراصل ایسی حرکتوں سے شام کو جنگ میں گھسیٹنا چاہتا تھا۔ گولان کی پہاڑیوں میں اس کی جان اٹکی ہوئی تھی۔

''چلو کامیاب ہو گیا۔'' منصور نے لمبی سانس بھری تھی۔

ڈاکٹروں کے اُس گروپ کے بارے میں تفصیلی باتیں ہوئیں اور گہرے افسوس کا اظہار ہوا جو خیموں میں طبی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ جنہیں گولیوں سے بھون دیا گیا تھا اور اسرائیلی سپاہی تو جیسے درندے بن گئے تھے۔ انسان ہونا اُن پر تہمت لگنے کے برابر تھے۔ انسانیت کی رمق بھی باقی نہ رہی تھی۔ ڈاکٹروں کو گالیاں نکالتے تھے۔ انہی زخمیوں کے علاج سے منع کرتے تھے۔ وہ چلاتے تھے۔ مرنے دو انہیں۔ تندرست ہو کر پھر ہمارے مقابلے پر آجائیں گے۔

کوئی ایک کہانی تھی ایک سے بڑھ کر ایک تڑپا دینے والی کہانیوں کا لمبا سلسلہ تھا۔روتھ کے لہجے میں تاسف اور دکھ کی گہری آمیزش تھی جب اُس نے کہا۔

Just because of our haste and frivolity

more then one lack new tents

You lost touch with new generation

Enemy played holi with our blood

We are hopeless, we are worthless

O Arab children

kill the opium in our heads

kill the illusions

فلسطینی بہت دل شکستہ، مایوس اور بکھرے ہوئے ہیں۔ان کیلئے اُمید تو کہیں باقی نہیں رہی۔

ملازم کے ہاتھ سے قہوے کی پیالی پکڑتے اور چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے منصور نے کہا۔وہ بیچارے بھی کیا کریں؟ پہلے بیچ کھایا۔اب غلام بنا دیا۔نئی نسل کچھ زیادہ ہی بپھری ہوئی ہے کٹنے مرنے کیلئے بیتاب۔

پھر وہاں شام کے انقلابی شاعر نزار قبانی کی نظم کے حوالے سے بات ہوئی۔منصور نے اِسے سُنا تھا۔پر کچھ ٹوٹے۔یائل کو تو زبانی یاد تھی اور وہ بتاتی تھی کہ یہ تو آجکل قہوے کی طرح معمولات کا حصّہ بن گئی ہے کہ تھوڑی سی گفتگو کے بعد اچانک محفل میں سوال اُٹھتا ہے۔تم نے نزار قبانی کی نئی نظم پڑھی سُنی۔

میرے اُداس وطن لمحہ بھر میں

تُو نے محبت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ میں خنجر تھما دیا ہے
وہ مشرقی عبارت آرائی
وہ شیخی کہ جس سے کبھی کوئی مکھی بھی نہیں مری
وہ ڈھول تماشا یہ تھے ہمارے جنگی ہتھیار اور جنگ ہم ہار گئے

پانچ تو وہ لوگ پہلے ہی تھے اور بقیہ تین بھی ویک اینڈ Weak end پر آ گئے تھے اور اب بیٹھے فیصلہ کرتے تھے کہ پائل کی شادی ہونی چاہئے اور منصور کی بھی۔دو تو ابھی بھی بضد تھے کہ دونوں کو سول میرج کرنی چاہئے اور یہ اس بنیاد پرست اور رجعت پسند معاشرے کے منہ پر ایک زنانٹے کا تھپڑ ہوگا۔آخر کسی کو تو بارش کا پہلا قطرہ بننا ہے۔وہ منصور اور پائل کیوں نہ بنیں۔شاید یہ قدم اِس متعصب اور گھٹن زدہ معاشرے میں تازہ ہوا کا جھونکا ہو۔مگر بقیہ لوگوں کا خیال تھا کہ نہیں یہ چیز ان کے اِس کاز Cause کیلئے نقصان دہ ہوگی جس کیلئے وہ کام کر رہے ہیں خصوصاً اِن حالات میں۔مذہبی جنونیت کوئی بھی گُل کھلا سکتی ہے۔ان کی زندگیاں سب سے زیادہ قیمتی ہیں۔''منصور کا چہرہ کھل گیا ہے۔چلو ہمارے لیئے تو یہی بات طمانیت لیئے ہوئے ہے پر یار یہ کیسی محبت ہے اساطیری کہانیوں جیسی۔میری کھوپڑی میں تو اس کی فلاسفی سمجھ نہیں آتی۔تمہاری کھوپڑی میں چربی چڑھی عقل ہے جسے ذرا سی مشکل بات بھی سمجھ نہیں آتی۔تم اِس مسئلے پر فضول میں ہلکان مت ہو۔ابراہیم ایلان اِس انداز میں زیر بحث آیا کہ بہت دنوں سے غائب ہے۔معلوم نہیں کہاں ہے؟

اور ایک شام جب وہ جھٹ پٹے کے سمے رائڈ کیمپ سے واپس لوٹتے تھے اور وہ دونوں ذرا پیچھے تھے اور پائل ذرا خفگی سے کہتی تھی۔

''منصور! ممی ڈیڈی تم سے میری شادی کے بارے میں جو باتیں کرتے تھے وہ تم نے کبھی نہیں لکھیں۔کیوں؟''

منصور اُس کے اِس احمقانہ سے سوال پر خفیف سا مسکرایا اور متانت سے بولا۔

''یائل تمہیں کیا لگتا؟ اُن کے ساتھ میرا اپنا بھی تو ایک تعلق ہے۔ان کے دل کی باتیں سُننا، انہیں تسلی دینا، اُن کی دلداری کرنا ان کے کھیتارسس کیلئے کتنا ضروری ہے؟ یائل انہیں تو کسی ڈاکٹر پر بھروسہ ہی نہیں رہا۔ کسی چھوٹی موٹی تکلیف کیلئے اگر قریبی کلینک پر چلے بھی جائیں اور ڈاکٹر نسخہ لکھ دے پر انہوں نے دوائی نہیں خریدنی جب تک کہ فون پر مجھ سے آدھ گھنٹہ بات چیت کے بعد اُن کی تسلی نہ ہو جائے۔کبھی ایسا بھی ہوا کہ مجھ سے فوری رابطہ نہ ہو سکا۔مگر تکلیف برداشت کرنا انہیں قبول مگر دوائی نہ گھر لانی ہے اور نہ کھانی ہے۔

منصور چند لمحوں کیلئے رُک گیا۔پھر دھیرے سے بولا۔یائل میرے لیے بھی حیفہ جا کر انہیں اور انکل کو دیکھے بغیر چلے آنا کہیں ممکن ہے اور تم نے یہ باہر والا پنگہ بھی فضول لیا۔میڈیکل تو بیروت میں بھی ہو سکتا تھا۔ڈھوڈا (آنٹی) نے تمہاری عدم موجودگی کا بہت دُکھ اُٹھایا ہے۔تم دیکھو گی وہ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ذرا سی بات پر اُن کے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔جدّی کی موت پر وہ جیسے تڑپیں۔سچ تو یہ تھا کہ ہم سب اپنا غم بھول کر انہیں سنبھالنے لگے۔

یائل چُپ چاپ اُس کی باتیں سُنتی تھی واقعی وہ ٹھیک کہتا تھا۔ہر بار جب وہ بات کرتیں یا خط لکھتیں ایک التجا بھری درخواست اُن کے خط یا فون پر اُن کے لہجے میں ہوتی۔باپ بھی مصر تھا مگر وہ خود جیسے پتھر بنی ہوئی تھی اور اپنی کسی کمزوری کو کسی پر ظاہر کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔

''دراصل ایڈمنڈ بڑا گدھا ہے۔اس نے ممی اور ڈیڈی دونوں کی خاصی کلاس لی۔انہیں بیک ورڈ backward کہا۔''اُس کا کہنا تھا کہ وہ فضول چکروں میں پڑے

ہوئے ہیں۔گولی ماریں اسرائیل کو۔باہر آجائیں ایک آزاد ماحول سے وہ رجعت پسند معاشرے میں رہنے کیلئے چلے گئے جس نے انہیں بزدل اور خوف زدہ بنا دیا ہے۔

لندن میں اکثر مجھ سے ملنے آتا تھا۔ایک بار آیا تو ساتھ اس کی ایک دوست جیٹ تھی۔اُسے بتاتے ہوئے کہنے لگا میری بہن بڑی تصوراتی محبت کرتی ہے اور جس سے کرتی ہے وہ بھی اسی جیسا احمق ہے۔

منصور ''احمق'' جیسے لفظ پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

یائل نے اپنی بات اُس کی ہنسی میں بھی جاری رکھی۔جیٹ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی تو بولا۔

''ارے بھئی میں سچ کہہ رہا ہوں۔رتی برابر مبالغہ نہیں ہے اس میں۔ہم تو محبت میں ڈوئیل لڑنے کو پسند کرتے ہیں کہ آجا یار معاملہ آر پار ہو جائے یا تو نہیں یا میں نہیں پر جسے یہ پیار کرتی ہے وہ نہایت پیارا اور محبت کرنے والا انسان ہے۔مجھے سو فی صد یقین ہے کہ وہ اس سے شادی نہ ہونے کی صورت میں بھی اسی کا دیوانہ رہے گا۔

وہ باتیں کرتے تھے اور ساتھ میں قہقہے لگاتے اور میرا مذاق اُڑاتے تھے۔مجھے تو بہت غصہ آیا تھا۔جیٹ نے بعد میں تنہائی میں مجھ سے پوچھا تھا کہ چکر کیا ہے؟ ایڈمنڈ ٹھیک کہتا ہے۔

میں نے بھی تلخی سے کہا تھا۔''ارے اوّل نمبر کا جھوٹا ہے یہ تو۔بکواس کرتا ہے۔''

منصور رُک گیا۔''یائل یہاں تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔'' اس وقت چاند اپنے جوبن پر تھا۔چاندنی نسوں خیزی کے پورے لوازمات سے سجی دن میں نظر آنے والی اس جگہ کی ساری کجیوں کو ڈھانپے اِس وقت اِسے حسین ترین بنا رہی تھی۔کسی ندی کے مست خرام پانیوں کی طرح پوربی ہوائیں جا بجا اُگی جھاڑیوں میں گھستی اُن کی خوشبوئیں چُراتی اور

انہیں میدانوں میں بکھیرتی پچھم کی طرف چلتی تھیں۔ جنگلی کافور کی خوشبو میں زور زور سے سانس لیتے ہوئے پائل وہاں بڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔ دونوں پاس پاس بیٹھے اُن لمحوں کی مسرت کشید کررہے تھے جو انہیں سالوں بعد ملے تھے۔

''دراصل ممی بہت حساس ہوگئی ہیں۔رشتہ داروں سے بہت ڈرنے لگی ہیں۔بدقسمتی سے ڈیڈی کے تو سبھی عزیز یہاں آگئے ہیں۔''

''پائل میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تمہیں بتاتا ہوں۔ڈوڈا ٹھیک نہیں ہیں۔ایڈمنڈ کی کمی بھی انہیں بہت محسوس ہوتی ہے۔اُنہیں خوشی اور سکون کی ضرورت ہے''۔

کیا تم لوگوں کے درمیان میرے بارے میں کچھ فیصلہ ہوا؟

''تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ ظاہر ہے تمہاری مرضی کے بغیر تو نہیں ہوسکتا۔تاہم مجھ سے تو ڈوڈا کی ایک طرح درخواست ہی تھی کہ میں تمہارے معاملے میں جذبات سے اُوپر اُٹھ کر حقائق کی روشنی میں فیصلہ کروں۔ابراہم اُن سے ملا ہے اور انہیں بھی وہ بہت پسند آیا ہے اور وہ اُسے تمہارے لیے موزوں سمجھتی ہیں۔''پائل کے عام سے لہجے میں دفعتاً تلخی سی در آئی تھی۔

''میں تو ڈاکٹر منڈل اور ڈاکٹر موشے کی باتوں پر حیران ہوں۔ابراہم ایلان تم سے کتنا فرینک frank ہوگیا ہے۔تم سے کیا خاص باتیں تھیں اس کی؟''

منصور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔کتنی دیر ہنستا رہا۔اُس کی ہنسی پائل کے غصے کو ہوا دے رہی تھی۔''اتنے سال باہر رہیں۔اتنا پڑھا اور رعادتیں ابھی بھی ویسی ہی ہیں۔''

بہت پیار اور بہت محبت سے جیسے کسی نازک اور قیمتی چیز کو احتیاط سے پکڑا جائے منصور نے اس کا سنہری بالوں والا سر اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں لیا اور بولا۔''بچپن تو ابھی بھی تم میں موجود ہے۔وہی شک وشبہ، فلاں نے کیا بات کی؟ اُس نے یہ کیوں کہا؟ کہا

تو کیوں کہا؟ بس پہلے مار کٹائی اور طعنوں والی باتیں تھیں۔ اب ذرا سنجیدگی آ گئی ہے۔''

''منصور گھر والوں کی طرح تم بھی چاہتے ہو میں ابراہم سے شادی کر لوں؟''

بہت دیر تک منصور خاموش اُسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر جذبات کا مدّ و جزر رہا۔

پھر اس کی بھاری سی آواز جیسے کہیں پاتال سے کسی بوجھ تلے دبی نکلی ہوئی سے سنائی دی۔

ابراہم بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ تقریباً مہینے سے کچھ زیادہ ہی رہا۔ پسندیدہ عادات کا مالک ہے۔

پائل نے تلخی سے کہا۔

''منصور میں نے تم سے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا ہے۔''

دونوں خاموش بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ چاند کو آسمان کی وسعتوں میں، چاندنی کو زمین پر بکھرے دیکھتے ہوئے اور رات دھیرے دھیرے بھیگتی گزر رہی تھی۔

باب نمبر: ۱۲

پائل۔

تمہیں میرا پیار و دُعائیں۔

میں کیا لکھوں اور تمہیں کیا بتاؤں کہ میرے سارے سر یر میں کس طرح کا دُکھ اور یاس گُھلا ہوا ہے۔شب و روز میں گُھلنے والا وہ اضطراب اور بے چینی جو اِس سرزمین کا مقدر بنی ہوئی ہے اور شاید نہیں پائل میرے خیال میں لفظ ''شاید'' خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔مجھے ''یقیناً'' کہنا چاہیے کہ اِس میں ابھی اور رنگوں کا اضافہ متوقع ہے۔اندیشے اندر باہر سرسراتے ہیں۔آس، اُمید، مایوسی، نا اُمیدی سبھی جذبوں کی فراوانی ہے۔

گھروں، گلیوں، بازاروں، قہوہ خانوں، شیشہ کیفوں، مسجدوں، گرجاؤں، دفتروں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں غرض کون سی جگہ ایسی ہے جہاں حالات پر تبصرے اور حاشیہ آرائیاں نہیں جاری۔لوگوں کے پاس کوئی اور موضوع ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ زندگی اور عافیت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

پی ایل او کی گوریلا سرگرمیاں جاری ہیں اور لوگ اُن سے کتنی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔اسرائیلی فوج نے کہاں ناکہ بندی کی اور کون سا گاؤں خالی کروایا؟ کتنے گھر مسمار ہوئے؟ کتنے لوگوں کو گولیاں لگیں؟ کتنے مرے؟ کتنے زخمی ہوئے؟ کیمپوں میں کون سی بیماری پُھوٹ پڑی؟ پینے کے پانی کی کمیابی کا خوفناک مسئلہ کتنی خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔دواؤں کی قلت مریضوں کو تیزی سے اپاہج کرنے اور انہیں قبروں میں اتارنے میں اپنا کردار کامیابی سے ادا کر رہی ہے۔

سیاست کے اپنے جھمیلے اور رونے ہیں ۔ناصر اور شاہ حسین کے اختلافات پر بحث ہوتی ہے۔

کل شام میں کیفے محفوظ میں کافی پینے چلا گیا ۔نوجوان جوشیلے لڑکوں کے جتھے شاہ حسین پر پیچ و تاب کھاتے تھے کہ ابھی اُس کا دل نہیں بھرا۔اسرائیلیوں کا دلا ل ۔پی ایل او کو برداشت نہیں کر رہا ہے ۔ بے غیرت ،ضمیر فروش ۔ہم پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے ۔اُسے اس سے کیا غرض اُس کی بادشاہی سلامت رہنی چاہیے ۔ہم سب تو گماشتے ہیں ۔اسرائیل نے تو ہمیں ٹارگٹ کرنا ہی ہے یا اُس سے پہلے ہمیں نشانہ بنا رہا ہے ۔سارا مشرقی حصہ ہڑپ کر گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے ہماری تو پہچان بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے ۔سنجیدہ حلقے پریشان ہیں ۔ایک یہ اسرائیل اس کے داؤ پیچ ہی انسان کو پاگل کیسے دیتے ہیں ۔پوری دُنیا میں شور شرابا مچائے ہوئے ہے ۔ساری بڑی طاقتوں کو اپنی مظلومیت کی جھوٹی داستانوں سے ان کی ہمدردیاں سمیٹتے ہوئے خود کو طاقتور ترین کیے جا رہا ہے ۔اُس کی بے پناہ تیاریوں پر بھی ساتھ ساتھ تبصرے ہوتے ہیں ۔کہیں بم شیلٹرز بن رہے ہیں ۔خندقیں کھودی جا رہی ہیں اور یہ کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت یہی دیہاڑی دار فلسطینی لڑکے اور مرد ہیں۔

یا ئل یہ کیسا المیہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو حفاظتی اقدامات کے طور پر یورپ کے مختلف مُلکوں میں بھیج رہے ہیں اور اسرائیلی بچوں کیلئے ان ہی کے ہاتھوں قبریں کھدوا رہے ہیں ۔جیٹ فائٹرز ایمرجنسی مشن آپریٹ کرتے ہیں ۔فضائیں ان کے جہازوں کی گھن گرج سے گونج اُٹھتی ہیں ۔شام کے سرحدی بارڈر گولان کی پہاڑیوں سے اسرائیل کی مسلسل چھیڑ چھاڑ جاری ہے ۔کیا اخبار اور کیا ٹی وی سب پر خون کو جلانے والی خبریں ہیں۔

میں نے اخبار کو پرے پھینکا ہے ۔ٹی وی کو بند کر دیا ہے اور باہر نکل آیا ہوں ۔آخر

بندہ کہاں تک جلتا جائے۔وارڈ میں مریض کے سرہانے بشریٰ عیسیٰ قبطی کی شاعری پڑی دیکھی تھی تو مانگ لایا تھا۔رات کو اُسے پڑھتا رہا۔قدیم عربی شعراء کو بھی میں پہلی دفعہ پڑھ رہا ہوں۔انہیں پڑھنا مجھے اچھا لگا ہے۔امراء القیس کو کبھی کبھی ٹی وی پر ہی سنتا تھا اور جانتا ہی نہیں تھا کہ کیسا لافانی شاعر ہے؟ آپ خود سے پوچھتے ہیں کہ جو دُکھ اور کرب آپ کے اندر ہے اور جس سے آپ گزر رہے ہیں شاعر اُن سے کیسے آگاہ ہے۔یائل تم کتنا یاد آتی ہو؟ میں نے چاہا تمہیں بتاؤں۔کاغذ پر چند جملے بکھرے تو مجھے احساس ہوا یہ میں نے کیا لکھا ہے؟ جذبات کا اتنا عامیانہ سا اظہار۔میں نے فوراً اُن پر لکیر پھیر دی۔پھر کچھ اور لکھا۔وہ بھی بس یونہی سا لگا۔اُسے بھی سیاہی کی نذر کیا۔میں نے قلم رکھ دیا اور باہر نکل گیا۔آج کوئی ہفتے بعد خط پوسٹ کر رہا ہوں۔

دیکھو ذرا محمود درویش کیا کہتا ہے؟

Sail your Smile into the air

It will reach and enliven me

Breathe your Fragrance into the air

It will sustain me.

اور پورے ساڑھے تین ماہ بعد منصور پھر اُسے لکھتا تھا۔

یائل۔

تمہیں میرا پیار۔

کیا تم اُس صبح کا حال سُننا چاہو گی جب یروشلم خون میں نہا رہا تھا۔ذاتی دُکھ اور غم کا تو کہیں احساس ہی نہ تھا۔لکھنے کو کیا چیز باقی رہ گئی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

ان عرب حکمرانوں کی بڑھکوں کے غبارے اسرائیلی ہوا بازوں کے پہلے ہلّے میں

ہی پھٹ گئے تھے۔مصری فضائیہ پوری عرب دُنیا میں بہترین ہونے کے باوجود صرف دو گھنٹوں میں ہی اپنے تین سو طیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھی۔پائلٹ اسکندریہ بیس پر رات بھر بیلے ڈانس دیکھنے اور ڈرنک Drink کرنے کے بعد آٹھ بجے ناشتہ کر رہے تھے اور دشمن مصری فضائیہ کی کمر توڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا تو اب گریہ زاری اور رونا دھونا سب بیکار ہے۔

تو اُس صبح بھی یروشلم کی دھرتی پارے کی طرح کانپتی تھی۔اُردن اور عراق کی فوجیں دیوارِ گریہ کے اُس پار یہودی علاقے پر گولے برسا رہی تھیں اور مَیں خون میں ڈوبی لاشوں پر پھاہے رکھ رہا تھا۔توپوں کی گولہ باری اور جہازوں کی بمباری سے درو دیوار دہلے جاتے تھے۔میرا سر پھٹ رہا تھا اور آنکھیں لال بوٹی ہو رہی تھیں۔مجھے اِس کیفیت میں کام کرتے آج پانچواں دن تھا۔سسٹر مارتھا مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آئی تھی۔اُس نے چائے کا مگ میرے ہاتھوں میں تھما کر کہا تھا۔

''سر آپ کی حالت بہت خراب ہے۔پلیز تھوڑی دیر آرام کریں۔''

''یائل جن مُلکوں میں جنگیں ہوتی ہیں جہاں زندگی ارزاں اور امن نایاب ہو وہاں صبح کی لالی خون میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔یائل The Rock of Dome اور القدس تو مجھے لگا تھا جیسے خون میں نہایا ہوا ہے۔

مجھے محسوس ہوا تھا جیسے کوئی میرے کانوں کے قریب سسکیوں میں کہتا ہے اُردنی فوجوں کی مزاحمت دم توڑ گئی ہے۔یہاں وہاں وجود بکھرے پڑے ہیں۔عام سپاہیوں نے اپنی محبتیں اِس سرزمین پر نچھاور کر دی ہیں۔ان کے نئے لباس سُرخ ہیں۔

یائل یہ یروشلم کیسا شہر ہے؟ اِسے مسکرانے اور ہنسنے کیلئے ہمیشہ خون چاہئیے۔میں تھوڑی دیر کیلئے سو گیا ہوں۔ڈاکٹر عباس بزاز نے مجھے سونے دیا ہے۔پھر جیسے کسی بھیانک

خواب نے جگا دیا ہے۔خواب اتنا بھیانک تو نہیں تھا جتنا باہر کے زندہ منظر۔کاش وہ سب جو سڑکوں پر، گلی کوچوں میں، چھتوں پر بکھرا ہوا ہے خواب ہی ہوتا۔مگر نہیں گلیوں میں ماتم تھا آہ و بکا کی صدائیں تھیں۔سنگینوں کے زور پر گھروں کے دروازے توڑے جا رہے تھے اور لاشیں آنگنوں میں، کمروں میں گر رہی تھیں۔

اور گلابی پتھروں والی گلی میں وہ بڑے بڑے محرابی دروازوں والا گھر جو امن و آتشی کا گہوارہ تھا اُس کا آنگن اور کمرے خون میں لت پت ہو گئے۔انہوں نے گھر کے دروازے توڑے اور اندر گھسے۔گھر میں نوکروں کے ساتھ جدّی بھی موجود تھے۔جیالے نوجوان ابو ذریح نے چلّا تے ہوئے کہا تھا۔

''اندھے ہو کیا''معلوم نہیں کہ تم کس کے گھر میں داخل ہوئے ہو؟اس گھر میں یروشلم کی بہت بڑی عالم ہستی رہتی ہے۔اس نے جدّی کے بارے میں بتایا۔

''کون یوسف ضیاء؟ کون ڈاکٹر موسیٰ؟ کون ڈاکٹر منصور؟ وہ تو کسی کو نہیں جانتے تھے۔رعونت اگر ان کے چہروں پر بکھری ہوئی تھی تو لہجے بھی پور م پور اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔بیچارہ ابو ذریح فاتح کی آنکھوں میں یروشلم کی معتبر و بے حد معزز اور علمی شخصیت کیلئے شناسائی اور احترامی رنگ تلاش کر رہا تھا اور نہیں جانتا کہ جب طاقت اور غلبے کی چربی پتلیوں میں پھیل جائے تب آنکھیں آندھی ہو جاتی ہیں اور کھلی ہونے کے باوجود اُنہیں کچھ نظر نہیں آتا۔تو وہ سب بھی اندھے اور وحشی تھے۔پھر یوسف ضیا کو گولیوں سے بھون دیا۔وہ نہیں کتنی گولیاں ان کے سینے میں اُتار دیں۔اُن کے خون میں اُس کتاب کے اوراق بھیگ رہے تھے جو اُس وقت اُن کے ہاتھوں میں تھی۔دجلے کا سیاہ پانی کمرے میں مار کرتا ہوا آ گیا تھا اور شیلفوں سے کتابیں نکل کر اُس میں گرتی جا رہی تھیں اور تاریخ پرانا سبق دہرا رہی تھی۔چنگیز خانی ٹولوں کے بوٹ لفظوں کے امین ورقوں کو روندتے ان لفظوں کو اپنے اندر

سنبھالے سینے کو ٹھنڈے لگاتے کمروں میں جھانکتے دیکھتے پھرتے تھے کہ ابھی کوئی باقی ہے۔گھر کے پرانے نوکر جانوں کا نذرانہ دے چکے تھے۔صحن میں لاشیں کمروں میں لاشیں۔ایک ابوذر لیج بچا تھا۔جانے کیسے؟شاید ہمیں یہ سب سُنانے کیلئے۔

نیرنگیٔ زمانہ دیکھو۔جدی کے شہید جسم کو اُٹھانے کیلئے جانتی ہو کون آیا تھا؟نویل قراسو آفندی کی بیٹی جو اپنی ماں اور رباپ کے ساتھ اِس گھر میں چند دن رہی تھی اور وقت رُخصت جس نے اپنی بانہیں اُن کے گلے میں ڈال کر کہا تھا۔

''آپ تو مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔''

وہ ریڈ کراس Red Cross کے لوگوں کے ساتھ اُس آنگن میں کھڑی تھی اور بچپن کسی خواب کی سی صورت میں اُسے کچھ یاد دلاتا تھا۔اُس نے جھک کر آنسو بہاتی آنکھوں سے جدی کے ماتھے کو چوما۔انہیں غسل دلوایا اور سردخانے میں محفوظ کیا۔

جدی کے بہت گہرے دوست خالد الاحد کے پوتے کا شاندار گھر شارع اللحم پر ہے۔وہ گھر اس کے مکین اُس کے پھول سے بچے بھی تہ تیغ ہوئے کہ بچے تو سنپولیے تھے اور انہیں زندہ چھوڑنا یہود دشمنی تھی۔

تمہیں گریفن یاد ہو گا نا۔وہ سنجیدہ سا نوعمر امریکی جرنلسٹ جسے کبھی کبھی ہم حیفہ اپنے سکول کے گیٹ پر دیکھا کرتے تھے۔عکہ سے ریل میں بیٹھ کر آنے والی ایک فرانسیسی لڑکی بھی اکثر و بیشتر اُس کے ساتھ ہوتی تھی۔تمہیں دُکھ ہو گا یہ سُن کر کہ جب اس کی لاش لینے کیلئے اُس کے ساتھی اسپتال آئے۔مارتھا مجھے بتاتی ہے۔ڈاکٹر منصور میں نے لاشوں سے بھرے کمروں میں انہیں دھکیلتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ ایک لاش لینے آئے ہیں۔یہاں تو انبار لگے ہوئے ہیں۔لے جایئے جتنی لے جاتی ہیں۔''

پتہ نہیں ہم اپنا ماضی اتنی جلدی کیوں بھول جاتے ہیں؟ مراکشی محلّہ جو تقریباً دو سو گھروں پر مشتمل ہوگا جس میں عیسائی، مسلمان، یونانی آرتھوڈوکس اور آرمینیائی سبھی ملے جلے لوگ تھے۔ اُن کی جائیدادیں ضبط اور دو گھنٹے سے بھی کم مدت کے نوٹس پر یروشلم بدر۔ اب کیا ہو رہا ہے؟ صرف ایک اعلان فوری قانون اور مسلم علاقہ بلڈوزروں کی نذر۔ حرم شریف کی املاک، البراق، سارا مغربی محلّہ اور باب سلسلہ کے سامنے کا علاقہ اسی زورزبردستی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

انکا اہم ترین ٹارگٹ یروشلم کے چہرے سے عرب خدوخال کو نوچ ڈالنا اور اسے نئی صورت دینا ہے۔ انسان کتنا وحشی ہے۔ اس کے ہاتھ میں طاقت آجائے تو یہ آپے میں ہی نہیں رہتا۔

کیا یہ اُس ردِّعمل کا نتیجہ ہے کہ زمانوں کی تپسیا اور ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے بعد کہیں غالب آنے اور اسی تاریخ کو دہرانے کا موقع تو ملا ہے۔ تو بس اب تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔

کبھی جریکو، کبھی لائن Lion اور کبھی سٹیفن گیٹ کہلانے والے شہر پناہ کے اس دروازے سے ایک منہ زور فوجیوں کا ایک اور دوسری جانب باب دمشق سے دوسرا ریلا بندوقیں لہراتا اندر داخل ہوا ہے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ ہے۔ آخر کیوں نہ ہو۔ 2000 سال بعد یہ وقت انہیں نصیب ہوا۔

مغربی یروشلم کا مئیر ٹیڈی کولیک ڈیوڈ بن گوریاں کی لیبر پارٹی کا ایک سرگرم رُکن جو دن رات مغربی یروشلم کو نئے نئے ترقیاتی منصوبوں سے سنوارتا اس کے خدوخال کو نئے رنگوں میں ڈھالتا دن گنتا تھا کہ یہودا کب وہ وقت لائے گا کہ یروشلم کو تقسیم کرتی یہ خاردار تاریں جن کے پار کا مشرقی یروشلم مسلمانوں کے پاس ہے ان کے قبضۂ اقتدار میں آئے

گا۔اور یہ جو شہری زندگی کی ساری بنیادی سہولتیں پانی بجلی،ذرائع مواصلات اور ذرائع آمدورفت سب دو حصّوں میں بٹی ہوئی بہت تکلیف دہ ہیں ۔ان پر قابض ہو کر ان کا کنٹرول خود سنبھالنا ہے۔کوہ سکوپس پر حادثا ہسپتال اور عبرانی یونیورسٹی بھی مسلمانوں کے مشرقی حصّے میں ہونے کی وجہ سے ان کے قبضے میں ہے تو اسے بھی اُن سے چھیننا ہے، تاروں کو توڑنا ہے اور مشرقی حصّے میں قائم کردہ اُردنی فوجیوں کی چیک پوسٹوں کی لمبی قطاروں کو ختم کر کے اُس حصّے کو اسرائیلی تسلط میں لینا ہے۔

یقیناً دُعائیں اور کوششیں رنگ لے آئی ہیں اور وہ وقت آ گیا تھا کہ مینڈل بام گیٹ پر مغربی یروشلم کے ہزاروں یہودی وہاں جمع تھے اُن خاردار تاروں کو توڑنے اور لوگوں کو لُوٹنے۔

قبۃ الصخرہ کے صحن میں سینکڑوں فوجی بندوقیں لہراتے جمع تھے۔اسرائیلی فوج کے چیف ربی کے شوفر (مینڈھے کا سینگ) بجانے کی آواز بہت دُور تک پھیلی اور زبور کی تلاوت کا آغاز ہوا۔اور مجمع نے ساکت ہو کر اسے سنا اور یقیناً خود سے کہا ہوگا۔یہودا کا احساس ہے کہ وہ اپنے گھر واپس آ گئے ہیں۔یقیناً اُن میں سے کسی نے بھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ یہاں سے بے دخل ہونے والوں کا بھی یہ گھر تھا۔

دل اتنا بوجھل ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آتا ہے کہ کیا کہوں، کیا لکھوں اور کیا کروں؟یائل ایسے دُکھی لمحات میں تمہارے علاوہ اور کون ہے جس سے میں اپنا آپ شئیر کروں۔تمہیں لکھتا رہا۔پھر ویسے ہی چھوڑ کر آپریشن تھیٹر چلا گیا۔بہت دن ہو گئے ہیں۔اسرائیلی قوم ابھی تک جشن کی سی کیفیت میں ہے۔

بیت اللحم،کس قدر قابلِ رحم نظر آ رہا ہے۔جلا ہوا۔سڑا ہوا۔موت کی آوازوں سے گونجتا ہوا۔ابھی بھی فضا میں بُو ہے۔سڑکوں پر خوف و ہراس ہے۔چھتوں پر سفید

جھنڈے ہیں ۔سفید جھنڈے امن کے نہیں ہماری ذلتوں کے نشان ہیں ۔

یائل یہ یروشلم کیا چیز ہے؟ اُجڑتا ہے خون کی قربانیاں لیتا ہے اور پھر شان سے جگمگانے لگتا ہے۔فوجی گاڑیاں دائیں بائیں موڑ کاٹتی گلیوں بازاروں میں گھستی پھر رہی ہیں۔

ابھی میں نے ٹی وی کھولا ہے۔کاہن اعظم ،ربیوں اور یروشلم کے خاص الخاص لوگوں کا گروہ دیوار گریہ کے پاس کھڑا ہیکل سلیمانی کا نقش اُٹھائے کو دعائیں پڑھنے میں مصروف ہے۔عبرانی میں یہ دعائیں میری سمجھ میں آرہی ہیں۔اُس معجزے کیلئے جو خدا نے انہیں دکھایا۔وہ شکر گزار ہیں ۔یہ فتح اُس فتح سے عظیم تر ہے جو انہیں یونانیوں پر 164 قبل مسیح عنایت ہوئی تھی ۔

یہودی معمر عورتوں کا ایک ٹولہ یروشلم کی گلیوں میں گیت گاتا نظر آرہا ہے۔ان کے لباس ان کے چہروں سے چھلکتی خوشی ۔کیا انہوں نے عورتیں ہونے کے ناطے ایک پل کیلئے رُک کر اُن ہزاروں بچوں،عورتوں ، جوانوں اور بوڑھوں کا سوچا ہے جو یہودی بربریت کی بھینٹ چڑھے ہیں اور کیا انہوں نے ایک لمحے کیلئے خود کو ان کی جگہ ہونے کا کوئی تصور کیا ہے۔نہیں یقیناً نہیں ۔

دراصل انسانی فطرت کا یہ المیہ ہے کہ لمحہ موجود میں جو کامیابی اس کے حصے آئی ہے اس کے خیال میں وہ صرف اُسی کا مقدر ہے۔یائل مجھے تو اس کی بھی سمجھ نہیں آرہی ہے کہ چلو غلبے کی جبلّت انسانی فطرت میں ہے لیکن کیا غالب آنے والوں کیلئے بربریت اور وحشی پن کے مظاہرے ضروری ہیں۔

ہاں ایک بات اور بھی ہے کہ بہر حال اِس کامیابی کیلئے محنت کی گئی ۔بہترین تربیت ،بہترین منصوبہ بندی،سخت جفاکشی اور دعائیں ۔قدرت کے فیصلے میرٹ پر ہوتے

ہیں ۔انفرادی معاملات میں اُس کی عنایات مل سکتی ہیں مگر اجتماعی معاملات میں نہیں۔

اب ناصر سڑکوں پر روتا پھرے۔شام اپنے زخم چاٹے اور اُردن اپنے ۔کوئی پوچھے کیا انہوں نے خود کو تیار کیا تھا۔اسرائیل نے جھرلو پھیر دیا تھا۔مصر سے جزیرہ نما سینائی،غزہ کی پٹی،شام سے گولان کی پہاڑیاں،اُردن سے ویسٹ بینک اور مشرقی یروشلم سب اپنے قبضے میں لے کر تقریباً ساڑھے تین لاکھ لوگوں کو پناہ گزین بنا دیا ہے ۔نابلس،قباطیہ،ناصرہ،رملہ،ہیبرون اور غزہ ہی کے کوئی تین لاکھ لوگ ہوں گے جو گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں۔

میرے بچپن کی وہ کہانیاں میرے کانوں میں گونجی ہیں جو جدّی مجھے رات کو اپنے ساتھ لٹا کر سُنایا کرتے تھے ۔وہ چند کہانیاں اس وقت بے طرح یاد آئی ہیں۔

حضرت عمرؓ کی کہانی ۔فاتح بیت المقدس کی حیثیت سے پادری صفرونیئس Sophronious سے مذاکرات،شہریوں کو عافیت کی یقین دہانی اور اُن کی حفاظت کا ذمہ ۔احتیاط کا یہ عالم کہ ظہر کی نماز کا وقت کلیسائے قمامہ میں آیا ۔پادری نے گرجے میں نماز پڑھنے کا کہا تو فرمایا۔

’’اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمان میری تقلید کریں گے اور عیسائیوں کو گرجوں سے نکال دیں گے ۔باہر نکلے تو گرجا کی دہلیز پر چادر بچھا دی گئی ۔آپ نے نماز پڑھی مگر غلطی کا احساس ہوا تو اسی وقت فرمان لکھ کر پادری کے حوالے کیا کہ مسلمان کبھی گرجاؤں کی دہلیز پر نماز نہ پڑھیں گے۔‘‘

تاریخ کے اوراق گواہی دیتے ہیں کہ شہر نے نہ خون ریزی دیکھی نہ ظلم وستم کا کوئی جبر سہا نہ کسی مفتوح کی دلیس بدری عمل میں آئی نہ ہی کسی مقدس مقام کو جلایا گیا اور نہ کسی پر زبردستی اسلام ٹھونسا گیا ۔اِس شہر کی صدیوں پرانی ظلم و بربریت اور خونی تاریخ میں ایسی

روایت حضرت داؤدؑ (کنگ ڈیوڈ) کے سوا کہیں نہیں تھی۔

دوسری کہانی اس کردسالار صلاح الدین ایوبی کی ہے اس کے ہاتھوں حطین کا معرکہ ہوا تو یہ ہونا ناگزیر تھا کہ گیارہویں صدی کے اختتام پر عباسیوں کی سلطنت زوال پذیری کی طرف تیزی سے گامزن تھی۔ ترک جنگجو سلجوقیوں کی سلطنت ملک شاہ کے بعد ختم ہوگئی تھی۔ ایسے میں سلجوقیوں کے ظلم وستم کی جھوٹی کہانیوں خاص طور پر پادری پیٹر ہرمٹ کے یورپ کے گاؤں گاؤں، شہر شہر فلسطین کیلئے بین اور رنج والم کے نعروں نے پورے یوروپ کو ایشیا پر چڑھا دیا۔ نہ فاطمیوں کی مصری فوج اور نہ عباسیوں کے سپاہی اس چالیس ہزار صلیبی منہ زور لشکر کا مقابلہ کر سکے اور پھر مسجد اقصیٰ میں پناہ لینے والے مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی اُس کا ذکر رونگٹے کھڑا کرتا ہے۔

اب جنگوں کا بازار رچ گیا۔ پہلے مرحلے پر عماد الدین زنگی والی موصل اور بعد میں اُس کے بیٹوں نے اُن یلغاروں کا مقابلہ کیا جنہیں یورپ کے مسیحی اُن پر نازل کر رہے تھے۔ دوسری صلیبی جنگ میں انسانی جانوں کا ضیاع جتنا زیادہ ہوا اس نے کسی سامان عبرت کی بجائے مزید تباہیوں کو للکارا۔ اُن معاہدوں کی خلاف ورزیوں کو معمول ٹھہرایا جو دوسری صلیبی جنگ کے بعد فریقین میں طے پائی تھیں۔ مصر کے حاکم صلاح الدین ایوبی کے ساتھ اب حطین کے میدانوں میں طبل جنگ بجا اور وہ فتح یاب ہوا۔ فتح کے بعد جو سلوک کیا گیا اُس کا اعتراف خود عیسائی دُنیا نے کیا۔ عیسائیوں کو امن دیا اور اُن ستر ہزار مسلمانوں کا انتقام نہ لیا جو ایک صدی قبل بیت المقدس میں ذبح کر دیئے گئے تھے۔ رواق سلیمان اور گرجا میں اُن کے گھوڑے مسلمانوں کے ناپاک خون میں گھٹنوں گھٹنوں تک چلتے تھے۔ یہ سب وہ جانتا تھا مگر عفو اور درگذری کو شیوہ بنایا گیا۔

یہودیوں کو بھی واپس یروشلم آنے کی دعوت دی گئی۔ عیسائیوں نے انہیں صلیبی

جنگوں کے دوران یروشلم سے نکال دیا تھا۔اب یہ میری نہیں شہرہ آفاق پروفیسر شیلوموڈی گوٹائن Shelomo D.Gaitein کی رائے ہے جو صلاح الدین کے متعلق لکھتا ہے کہ اُس دور کے یہودیوں نے اُسے اپنا نجات دہندہ یعنی نیا سائرس کہہ کر اُس کا خیر مقدم کیا تھا۔اور تیسری کہانی عثمانی سلاطین کی تھی۔

ہاں یائل تمہیں یہ خط کتنے دنوں میں اور کتنی قسطوں میں لکھا گیا مجھے تو اس کا حساب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ہاں بھئی اب ذرا ان یاس بھرے دنوں میں جو دلچسپ اور پُرلطف واقعہ پیش آیا اُسے سنو۔یہ یقیناً تمہیں محظوظ کرے گا۔

میں آج کل دھمیشا ریفیوجی کیمپ میں ہوں۔جبلیا، آئدہ اور دھمیشا میں بڑے کیمپ بنائے گئے ہیں۔یہاں یورپی مُلکوں اور باقی دُنیا سے اقوام متحدہ اور مختلف فلاحی تنظیموں کے تحت ڈاکٹرز اور رضا کاروں نے ڈیرے لگا دیئے ہیں۔یہ لوگ عیسائی، مسلمان اور یہودی سبھی ملے جلے انسانیت کیلئے کمربستہ لوگ ہیں۔اسرائیلی مملکت سے بھی چند لوگ ہیں جو اسرائیل کی زیادتیوں کے ناقد اور اسکی پالیسیوں پر پُرزور طریقے سے احتجاج کرتے ہیں۔ڈاکٹر موزز منڈل بیروت سے،ڈاکٹر شمران الوان Shamran Olwan حیفہ،اور ڈاکٹر موشے یروشلم سے ہیں اور ایسے کڑے لمحوں میں ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔

اُس دوپہر ہواؤں میں دل کو چیرتی ویرانی اور اعصاب کو شل کرتی اُداسی تیرتی تھی۔ہم سب کھانے کی میز پر ابھی بیٹھے ہی تھے جب ایک درمیانی قامت کا نوجوان بیگ کندھے سے لٹکائے ڈائننگ روم Dining Room میں داخل ہوا۔زوردار آواز میں پہلے سلام پھر شلوم کہا گیا اور ساتھ ہی تعارف کے چند جملے بھی بے نیازی سے اُچھالے گئے۔

واشنگٹن پوسٹ کا نمائندہ، نام ابراھم ایلان، اخبار کی طرف سے اسرائیل کیلئے نامزد ہوا تھا۔ گذشتہ ماہ سے وہ ان علاقوں میں پھر رہا تھا۔ یوں یہودی تھا پر بڑا سچا، کھرا اور بے باک تھا۔ معذرت کرتے ہوئے کھانے کی میز پر بیٹھ گیا کہ اُسے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ ڈاکٹر ثمران الوان نے اس کے تاثرات جاننے چاہے۔ ابراھم نے منہ میں ڈالا بڑا سا نوالہ ذرا جلدی جلدی نگلتے ہوئے کہا۔

''کٹر سیکولر یہودی ہوں یا بنیاد پرست، دہریئے یا ملحد، حکومتی نمائندے یا عام لوگ سب اس خلاف توقع یروشلم ملنے کے اِس نئے اور خوشگوار تجربے سے دوچار ہوئے ہیں جس کی بہر حال انہیں توقع نہیں تھی۔ سرشاری میں بھیگے ہوئے ان کے جذبات اس ہاتھ میں آنے والی نعمت کو کسی قیمت پر کھونے کے لیے تیار نہیں۔

''کبھی نہیں اس کی واپسی ہوگی اور ہم اب کبھی نہیں اِسے چھوڑیں گے'' جیسے الفاظ ان کے ہونٹوں سے چپک گئے ہیں اور آنکھوں پر پٹی بندھ گئی ہے۔ تاریخ بھول گئی ہے۔ یہ یاد نہیں یا وہ اِسے یاد رکھنا نہیں چاہتے کہ تم لوگوں نے اِسے بزور بازو چھینا ہے۔ پھر وہ یہ جو تمہارے اردگرد کے ہمسائے ہیں۔ یہ عیاش پوستی کب تک یونہی عیش و طرب میں ڈوبے رہیں گے؟ ایک دن تو انہیں بھی جاگنا ہے، اُٹھنا ہے۔ تب کیا ہوگا؟

جنرل موشے دایان دیوار گریہ کے پاس کھڑے ہو کر کہتا تھا۔

''ہم اپنے مقدس مقامات پر واپس آ گئے ہیں۔''

میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے اُونچی آواز میں کہا تھا۔

''حضور یہ اور قوموں کے بھی مقدس مقامات ہیں۔ وہ بھی اس کیلئے جان لڑائیں گے۔ پچاس سال، سو سال، صدی، دو صدی بعد کبھی کسی وقت بھی پھر طبل جنگ بجیں گے۔ تاریخ کے پہیے پیچھے کی جانب گھومنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ اِسے یاد رکھیئے۔''

ابراھم ایلان ہمارے ساتھ بہت گھل مل گیا تھا۔وہ سارا دن پھرتا اور رات کو ہمارے پاس ہوتا۔ثمران کو دوسروں کے ذاتی معاملات میں جھانکنے کا بہت شوق رہتا ہے۔ایک دن کھانے کی میز پر ہنستے ہوئے بولا۔

''تمہارا کیا سلسلہ ہے؟شادی وادی کر رکھی ہے یا یونہی اِدھر اُدھر منہ مارتے پھرتے ہو۔

اُس نے جواباً سارے دانتوں کی نمائش کی اور بولا۔

''ارے یار ایک لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔اس کے بھائی سے میری دوستی تھی تھی بھی یہودی مگر وہ تو کسی مسلمان کے عشق میں مبتلا تھی اور مزے کی بات وہ ہے بھی فلسطین کا۔''

اب جب پوچھ پڑتال اور کھرید کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ خیر سے یائل نکلی تھی۔

تم جن دنوں اپنے ماموں کے پاس گئی ہوئی تھیں یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے۔یقیناً تمہیں سمجھ آگئی ہوگی۔

موشے نے ہنستے ہوئے میری طرف اشارہ کیا اور بولا۔

''یہی ہے وہ طرّم خان۔''

''اوہو''

ابراھم نے بغور مجھے دیکھا۔ہنسی اس کی آنکھوں میں تیری۔اُس کے ہونٹوں پر پھیلی۔اُس کی گالوں کی طرف بھاگی۔

''ارے واقعی!ویسے تم ہو تو ایسے ہی کہ تم سے شدید محبت کی جائے اور تم پر مرا جائے۔مگر یار یائل بھی کمال کی لڑکی ہے۔لعنت بھیجو سب پر اور شادی کرو۔''

میں نے قدرے حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔اُس کے لہجے کی سادگی قابلِ توجہ

تھی لفظوں کے بین کہیں منافقت یا ریا کاری کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

ابھی موزز کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سگریٹ کا دھواں ناک سے خارج کرتے ہوئے وہ پھر بول اُٹھا۔

ہاں میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اسرائیل میں بنیاد پرستی انتہا پر جا رہی ہے اور فلسطینی اس وقت شکست خوردہ کیفیت میں ہیں۔تمہاری شادی سنگین واقعہ ہو بھی سکتی ہے۔جس میں پہلا نشانہ تم اور ڈھیر سارے فلسطینیوں کے بننے کا ہے۔یائل بھی نشانے پر ہوگی مگر قسمت اگر یاوری کرے تو پھر کبھی کچھ درست ہو سکتا ہے۔

''قسمت کی یاوری کے امکانات محدود ہیں۔''منڈل ہنسا۔

''چلو یار منصور اگر تم نے اپنی نہیں کرنی تو میری کروا دو۔میرا ابھی دل اُس لڑکی پر بہت ہے۔میں حیفہ میں اُس کے والدین سے ملا ہوں۔گھر گیا تھا اُن کے۔اچھے لوگ ہیں۔وہاں اُن کی ایک بوڑھی عزیز کارمیلا تو یہ جان کر خوشی سے ہی نہال ہو گئی کہ میں نے یائل کیلئے پروپوزل دیا ہے۔مذہبی سی عورت ہے۔خبطی بھی لگتی ہے۔مجھے بااصرار رات کیلئے ٹھہرا لیا گیا۔ڈنر کے بعد میرے کمرے میں قہوہ لائیں تو بولیں۔

''یائل بہت محبت اور خیال کرنے والی لڑکی ہے۔یہ پورا گھرانہ ذرا مسلمانوں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔یروشلم اور حیفہ میں رہنے والا خالدی خاندان تو اِن کی ناک کا بال ہے۔''

آپ شاید منصور کی فیملی کے بارے بات کرتی ہیں۔میں نے قہوہ کا گھونٹ بھرا اور کہا۔

وہ حیرت زدہ بولیں۔''تم منصور کو جانتے ہو؟''

''جانتا تو نہیں پر اب اُسے ڈھونڈنے نکلوں گا۔ایڈمنڈ اس کا بڑا مداح تھا۔اسی

کی وساطت سے تھوڑی بہت غائبانہ شناسائی ہے۔

ابھی میری بات جاری تھی جب اُس نے ایک لمبی سی آہ کلیجے سے نکالی۔

''ہائے کاش مسلمان نہ ہوتا۔لڑکا وہ ہیرا ہے۔''

''کارمیلا سیونا منصور اگر ہیرا ہے تو پیتل میں بھی نہیں۔یوں اگر تمہارے اور گھر والوں کے خیال کے مطابق شادی یہودی سے ہو تو پھر میں حقدار ہوں۔ویسے میں صرف نام کا یہودی ہوں۔''

وہ بیچاری تو بٹر بٹر میرا منہ دیکھتی تھیں کہ یہ ہے کیا بلا؟

ہم سب تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے تھے۔

باب نمبر: ۱۴

اور وہ ایسا ہی سبت shabbat کا ایک دن تھا جب وہ بہار کے کسی معطر جھونکے کی مانند گھر میں داخل ہوئی تھی۔ سارا گھر خوشی سے مسکرا اُٹھا تھا۔ وقت بھی عین وہی تھا سورج کے اندر باہر ہونے سے ذرا پہلے کا جب ملکہ سبت اپنے چاہنے والوں کے گھر تشریف لاتی اور یہودیوں کو تقدس، خوشیوں اور محبتوں کا تحفہ عنایت کرتی ہے۔ یائل کا آنا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

یرڈینا ابھی چند لمحے پہلے کھانے کے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھی ہی تھی جب یہ حیات آفرین خوشی ملی۔ سر سے پاؤں کی اُنگلیوں کی آخری پور تک میں سرایت کر جانے والی مسرت بھری لہریں اُسکے بھاری بھرکم وجود کی لڑکھڑاہٹ کا باعث بنیں کہ وہ تیزی سے اُٹھنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچی تھی کہ ڈیوڈ نے فوراً اُسے سنبھال لیا۔ اپنی آنکھیں مسلتے اور اُسکے بازوؤں میں جھولتے ہوئے وہ بے اختیار ہی بولے چلی جاتی تھی۔

"ڈیوڈ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔"

کارمیلا سیونا نے بھی خوشی سے کلکاری ماری اور بے اختیار ملکہ سبت کیلئے پڑھی جانے والی دعا لبوں پر لے آئی۔

"آؤ کہ اس پیاری دُلہن کا استقبال کرو۔"

کتنی دیر وہ تابڑتوڑ سوالوں کی زد میں رہی کہ بھلا اطلاع کیوں نہ دی اور ڈیڑھ ماہ ہوتا ہے کوئی خط نہیں لکھا نہ فون کیا۔ تمہیں قطعی احساس نہیں کہ یہاں تین بندے تمہارے خط، تمہارے فون اور تمہاری جانب سے ملنے والی کسی چھوٹی سے چھوٹی اطلاع کیلئے بھی

کتنے بے چین رہتے ہیں۔

یائل دراصل بات اتنی سی ہے کہ تمہیں ہماری ممتا کا امتحان لینے کا شوق رہتا ہے۔وہ ابھی کچھ اور بھی سُنانے کے موڈ میں تھی کہ ڈیوڈ نے اسکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''فارگاڈ سیک ریڈینا اب بس کرو۔جانے وہ کب سے سفر میں ہے؟''

اور وہ بس مسکراتی رہی پھر اُس نے کہا''میں تھکی ہوئی ہوں۔مجھے کھانا کھانا ہے اور سونا ہے۔''

دراصل رات کا بیشتر حصّہ منصور اور اُس نے ستاروں اور چاند کی چھاوں میں گزارا تھا۔جنین کے اِس عارضی اسپتال کے نواح میں جنگلی پھولوں کی بہتات تھی جن کی خوشبو رات کی ہواؤں سے مل کر ان لمحوں کو مدہوش کیئے دیتی تھی۔

علی الصبح اُسے روانہ ہونا تھا۔رات منصور نے کہا تھا کہ اس کی گاڑی اُسے چھوڑنے جائے گی۔اُس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''ضرورت کیا ہے؟ بس میں بیٹھوں گی اور چلی جاؤں گی۔''

مگر منصور نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

''ہرگز نہیں یائل''۔

علی الصبح وہ بمعہ ڈرائیور گاڑی کے اسپتال کی ڈارمیٹری کے سامنے موجود تھا۔ دونوں نے جب وقت رخصت ایک دوسرے کو دیکھا دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔گاڑی چل پڑی تھی اور جب تک منصور آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگیا وہ اُسے دیکھتی رہی اور پھر ٹپ ٹپ آنسوؤں کی بوچھار اُس کے رخساروں پر گرنے لگی تھی۔

صبح وہ بہت دیر تک سوتی رہی۔کسی نے اُسے اُٹھانے کی کوشش نہ کی بس ریڈینا آتی اُس پر نظر ڈالتی اور چلی جاتی۔کوئی دو بجے وہ اُٹھی۔

کارمیلا سیوتا Savta (دادی) بڑی کٹڑ اور روایتی یہودن تھی۔چار سال گھر سے باہر رہنے کے باوجود دیائل جانتی تھی کہ ہفتہ کے دن سہ پہر تک اُس نے آرام میں گزارنا ہے اور گھر کے کسی کام کو توجہ نہیں دینی۔ پھر وہ اُٹھے گی اور کولہو کے بیل کی طرح کام میں جُت جائے گی۔ ہفتے کی شام کو آلو گوشت کا سالن بننا ہے۔حریب کی پھلیوں کی بُھرجی بنے گی۔وہ اپنی الماری میں سنبھالا ہوا زیتون کی لکڑی سے بنا ہوا بکس جس میں دارچینی، لونگ اور آلا بچی ہیں نکالے گی اور میز پر سجائے گی۔لونگوں کی خوشبو ہر بندے کے نتھنوں میں گھسائے گی اور ساتھ میں دعاؤں اور سکون کیلئے کہے گی۔

اِس ساری کاروائی کے اختتام پر وہ سبت کا دن اُس کے حسب حال اچھا گزر جانے پر شکر ادا کرے گی۔

گھڑی دیکھنے کے بعد اُسے اندازہ ہوا اور حیرت سے اُس نے خود سے کہا تھا۔

''اُف میں اتنا سوئی ہوں۔''

شاور لیا۔تازہ دم ہوکر وہ یرڈینا کے کمرے میں آئی تو وہ ناشتے کا سامان ٹرالی میں سجائے اُس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔محبت سے اُس کے گلے میں بانہیں ڈالتے اور باری باری اس کے دونوں رخساروں پر بوسہ دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

''آپ کو پتہ چل گیا کہ میں اُٹھ گئی ہوں۔''

''لو میں تو صبح سے کوئی بیس چکر تمہارے کمرے کے لگا بیٹھی ہوں۔''

یرڈینا محبت پاش نظروں سے اُسے دیکھتے اور اُس کے ماتھے گالوں پر بوسے دیتے ہوئے بولی تھی۔

سالوں بعد اپنی ماں کے پاس بیٹھنا اور چائے پینا اُسے بہت اچھا لگا تھا۔دیر تک دونوں باتیں کرتی رہیں۔سچ تو یہ تھا کہ یرڈینا سے تو خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔سب سے

پہلے تو ضالیہ کو خبر دی۔ پھر سب واقف کاروں اور عزیزوں کے ہاں فون کھڑکا دیئے حتیٰ کہ جابرہ نکولا کو یروشلم بھی اطلاع دے دی اور یائل کو بھی ساری تفصیل سنا دی۔

''کمال ہے ممی آپ نے تو میرا ریکارڈ لگا دیا۔ بھئی میں آپ کے لیے اہم ہو سکتی ہوں۔ لوگوں کیلئے نہیں۔ میرے آنے سے کسی کو کیا دلچسپی ہے؟'' چلو ضالیہ آنٹی کو چھوڑو ان کی بات اور ہے۔

یائل حد درجہ خفت محسوس کر رہی تھی۔

یرڈینا پیار بھری خفگی سے کہتی تھی۔

''یائل تمہیں ممتا کی پیاس کا کیا پتہ؟ ماں بنو گی تو جانو گی۔''

گذشتہ سال بھر سے جب بھی ٹیلی فون پر بات ہوتی یا وہ اُسے خط لکھتی۔ ہر خط اور ہر کال میں بہت ساری باتوں کے بعد وہ ہلکی سی پیار بھری سرزنش کرتے ہوئے کہنا یا لکھنا کبھی نہ بھولتی۔ ''یائل دیکھو میری جان اب جب تمہیں کسی یہودی سے ہی شادی کرنی ہے تو پھر کسی ملنے ملانے والے کو اِس نظر سے بھی تو دیکھو۔ کوئی اچھا اور معقول نظر آئے تو توجہ دو۔ اپنے ساتھ پڑھنے والے کسی یہودی کلاس فیلو یا کالج میٹ کو خیال میں لاؤ۔

ماں کی ایسی فضول اور لایعنی باتوں پر وہ کبھی ہنس پڑتی اور کبھی جھلاتے ہوئے کہتی۔

''ارے ممّا آپ کی یہ بونگی باتیں میرا خون جلانے لگ جاتی ہیں۔''

نہ پر یائل شادی تو کرنی ہے نا۔ کوئی کنوارکوٹھا تو چھٹنا نہیں تمہیں۔ میں تو تجھے اس یہودی والی زنجیر سے کبھی باندھنے کا نہ کہتی پر ایک حالات کی سنگینی اوپر سے تیری ددھیال کی تنگ نظری اور تعصب وگرنہ منصور جیسا ہیرا لڑکا ساری دُنیا سارے جہاں میں نہیں۔

اب گزشتہ پانچ ماہ سے ابراھم ایلان زیرِ بحث آ گیا تھا۔ اُس پر دباؤ اور اصرار کی

بارش سی تھی۔بار بار یہ کہا جاتا کہ اس پروپوزل کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔اس وقت بھی وہ اِس حوالے سے بات کرنا چاہتی تھی پر تھوڑی سی خوف زدہ بھی تھی اور خود سے کہتی تھی۔

''ابھی اپنی زبان بند ہی رکھوں تو بہتر ہوگا۔سالوں بعد آئی ہے۔بات کروں گی تو کہیں موڈ ہی نہ خراب کر لے۔''

دو دن بعد کوئی بارہ بجے وہ یرڈینا کے کمرے میں آئی۔اُس نے لونگ سکرٹ پہنا ہوا تھا۔یرڈینا اس لباس میں اُسے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کہاں جانے کے ارادے سے آئی ہے۔تاہم اُس نے اُس کے بولنے کا انتظار کیا۔

''ممی میں اولڈ حیفہ ضالیہ آنٹی کی طرف جا رہی ہوں۔جدّی کا افسوس کرنا ہے۔''

''جانا تھا تو مجھے پہلے بتایا ہوتا میں بھی چلتی۔''یرڈینا نے فوراً کہا۔

یائل اس وقت اُس گھر میں تنہا جانے کے موڈ میں تھی۔

''ارے مما بیٹھے بیٹھے میرے ذہن میں آیا کہ چکر لگا لوں۔

ماں کا کیا جواب ہو سکتا ہے وہ اس چکر میں نہیں پڑی۔

اُس نے کچھ کہنے کی بجائے باہر جانے کیلئے قدموں کو حرکت دی ہی تھی جب ماں کے سوال پر رُک گئی۔

''منصور سے تمہاری ملاقات ہوئی؟''

یرڈینا کی سوالیہ نظریں اُس کے چہرے پر جمی تھیں۔

''منصور آج کل نابلس، رملہ، ہیبرون، جنین اور کبھی کبھی غزہ کے کیمپ اسپتالوں میں ہوتا ہے۔ایک ماہ تو میں نے بھی وہاں ڈیوٹی دی۔روز ہی ملنا ہوتا تھا۔

''اچھا اب چلتی ہوں۔''وہ باہر نکل آئی۔

پیرس سکوائر پر اُتر کر منصور کے گھر جانے تک کے فاصلے میں یادوں کی ایک یلغار

تھی جو اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ سوچوں کے بھنور تھے جن میں ڈوبتی اور اُبھرتی رہی۔ خیالات کی گھمسن گھیریاں تھیں جن میں وہ اُلجھتی رہی۔

بڑے سے چوبی کندہ کاری سے گھستے پھاٹک نما دروازے سے گزر کر ایک لمحے کیلئے رُک کر اُس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ اس کا بچپن جیسے کھلکھلاتا، کلکاریاں بھرتا، شور مچاتا اُس کے آگے پیچھے رقص کرنے لگا تھا۔ یہ گھر جہاں آنے کی اُسے ہمیشہ بڑی تمنا رہا کرتی تھی جہاں منصور رہتا ہے اور منصور جو اُس کی زندگی میں سانسوں کی طرح ہے۔

گھر کی فضا پر جس اُداسی اور دُکھ کی کیفیت کے سائے محسوس ہوئے تھے وہ اُس کے اپنے احساسات کا عکس نہیں تھے بلکہ گھر پورم پور اُداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس پر پڑنے والی سب سے پہلی نظر اُمّ غسان کی تھی جو کسی کام کے سلسلے میں باورچی خانے سے باہر آئی تھی اور اُسے دیکھتے ہی خوشی سے چلاّتے ہوئے اس کی طرف بھاگی تھی۔

''یا ئل یا ئل بچی۔''

ضالیہ دوڑی آئی تھی۔ ضالیہ کے سینے سے لگتے ہی اُس کے آنسو پھوٹ نکلے۔ کتنی دیر وہ ایک دوسرے میں ضم کھڑی رہیں۔ ضالیہ اُسے سینے سے چمٹائے اُسکے بالوں پر بوسے دیتی، رخساروں کو چومتی اور پھر اپنی بانہوں کے دائرے میں سمیٹے سمیٹے کمرے میں لے آئی۔ وہ باتیں کرتی تھیں جدّی کی، جنگ کی جس نے فلسطینی مسلمانوں کو تنکوں سے ہلکا کر دیا تھا۔ جدّی کے شہید ہونے کی۔ ڈاکٹر موسیٰ کے غزہ کی پٹی پر دن رات مصروف رہنے کی۔ کتنی دیر گزر گئی تھی۔ وقت کا تو کوئی احساس ہی نہیں تھا دونوں کو۔

ضالیہ کے ساتھ وہ جدّو کے کمرے میں گئی اور دنگ رہ گئی۔ وہ جلال اور جمال کی حامل چھ فٹی قامت والی بہت باوقار اور خوبصورت عورت کہاں تھی؟ یہاں تو ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بیٹھا تسبیح کے دانے گرا تا تھا۔

اُن سیاہ آنکھوں کی پُتلیوں پر تیرتے پانیوں میں جیسے اُداسی اور غم ٹھہر گئے تھے۔ وہ لرز گئی تھی۔

''میری قوم اِس کی ذمہ دار ہے۔ اُس نے سوچا۔

پاس بیٹھی تو جیسے اُن بانہوں میں بکھری گئی۔ بہت سے پیار بھرے بوسے تھے جو اُس کے گالوں پر ثبت ہوتے تھے۔ یہ کیسے عالی ظرف لوگ ہیں۔ وہ خود سے کہتی۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے بعد اُس نے اجازت چاہی تو ضالیہ نے کہا۔

''نائل میری تو ابھی پیاس بھی نہیں بجھی اور تم جانے کا کہہ رہی ہو۔ تم نے میرے پاس شام تک رُکنا ہے۔ میں تمہیں رات ٹھہرنے کا نہیں کہوں گی کہ یہ ڈینا تو خودترسی ہوئی ہے۔''

اُسے ضالیہ کا اصرار کرنا اچھا لگا تھا۔

''ضالیہ آنٹی اِس گھر کو منصور کی دُلہن کی فوری ضرورت ہے۔ یہ گھر بہت اُداس ہے۔ مجھ سے اس کی اُداسی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

ضالیہ نے بے اختیار اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔

''دُلہن تو میرے سامنے بیٹھی ہے مگر میں اِسے اپنے گھر کیسے لاؤں؟''

ضالیہ کی اِس بات پر اُسکا ضبط جواب دے گیا۔ کسی ننھے سے بچے کی طرح اُس نے اپنا چہرہ ضالیہ کے سینے میں گھسیڑ لیا تھا۔ اب وہ کوئی جذباتی لڑکی نہیں تھی پر پھر بھی آنسو بہے چلے جاتے تھے اور ہمیشہ کی طرح اُسے آج بھی یہی محسوس ہوا تھا کہ اُسے ضالیہ سے شدید محبت اور اُسکی ذات سے اُسکا ایک انوکھا سا تعلق ہے۔ اسی لئیے شاید اُسے اپنی ماں کے ساتھ یہاں آنا کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

''آنٹی دُلہن ڈھونڈ دیئے۔ منصور کو راضی کرنا میرا کام ہے۔''

امّ غسان نے کتنا مزے کا کھانا بنایا تھا۔اپنی ساری چاہت اُس نے مقلوبے میں ڈال دی تھی۔

اُس نے اپنی اُنگلیاں چاٹتے ہوئے کہا تھا۔

''بہت مدّت بعد میں نے جی بھر کر کھانا کھایا ہے۔''

وقتِ رُخصت اُس نے ضالیہ کو پھر تاکید کی۔

گھر آکر تھوڑی دیر یڑینا سے باتیں کرنے کے بعد اُس نے ٹی وی لاؤنج T.V.Launge میں ٹی وی آن کیا۔یاسر عرفات کا اقوام متحدہ میں خطاب نشر ہو رہا تھا۔اُس نے آواز تھوری سی اُونچی کی اور توجہ سے سُننے لگی۔اُس کی گفتگو میں ایک واضح تبدیلی محسوس ہوتی تھی۔یہ تعاون اور مفاہمت کی حکمتِ عملی تھی۔اُس نے ایک ایسے متحدہ فلسطین کا مطالبہ کیا تھا جہاں ہر شہری کو بغیر کسی تخصیص کے بنیادی حقوق حاصل ہوں،جمہوریت اور سیکولر اِس حکومت کا طرّۂ امتیاز ہو۔کیا یہ ممکن نہیں کہ اِس مملکت میں عیسائی،یہودی اور مسلمان انصاف،مساوات اور اخوت و بھائی چارے کے ساتھ رہیں۔

ایک زہر خندی ہنسی کے ساتھ ساتھ ایک زہریلا سا سوال بھی اُس کے ہونٹوں پر تھرّایا تھا۔کیا کوئی اس کی اِس بات کو توجہ دے گا۔ہرگز نہیں۔امن کی یہ خواہش کمزور کی طرف سے آئی ہے اور یہ ہوس، قبضے اور غلبے کے راستے میں رکاوٹ ہوگی۔طاقت کیوں اِسے قبول کرے گی۔

اُس کے لہجے میں اُمید کی کرن تھی اور جب وہ کہتا تھا میں یہاں آتے ہوئے اپنے ساتھ شاخِ زیتون اور آزادی کے مجاہد کی بندوق لایا ہوں میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ہاتھ سے شاخِ زیتون گرنے نہ دیں گے۔

''ایسا ہی ہو جیسا تم گمان کرتے ہو۔''

اور عین اسی وقت منصور بھی ٹی وی کے سامنے بیٹھا اِس کاروائی کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسی ہی سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

اُسے گھر آئے یہ دوسرا جمعہ تھا اور شام کا وقت۔ پائل ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے کارمیلا کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ وہ تالمود (تورات کی تفسیر) کھولے قدرے اُونچی آواز میں پیدائش کا بیان پڑھتی تھی۔

اور بچے کی تخلیق سے بھی چالیس دن پہلے جنت سے ایک آواز زمین پر سنائی دیتی ہے کہ فلاں لڑکی کی شادی فلاں لڑکے سے انجام پائے گی۔ یہ بیان اُس نے کوئی چار بار دہرایا ہوگا۔ پائل نے خود سے کہا تھا۔

''کہیں یہ اُسے سُنانے کی لاشعوری کوشش تو نہیں۔'' کارمیلا سیوتا (عبرانی میں دادی نانی) ہرگز اِس مزاج کی عورت نہیں تھی پر پائل گزشتہ چار سال سے اسرائیل سے باہر تھی۔ بہت سی باتیں اور عادتیں وقت کے ساتھ انسانی فطرت میں شامل ہوتی جاتی ہیں۔ خطوں میں وقتاً فوقتاً اس کا اظہار ہوتا تھا، وہ اُسے بہت باقاعدگی سے خط لکھتی تھی۔ آدھا خط تو اُس کی ماں کے ذکر سے بھرا ہوتا کہ وہ اس کیلئے کتنی فکرمند رہتی ہے؟ پھر اِدھر اُدھر کی بھی باتیں ہوتیں۔ آخر میں اُس کی شادی سے متعلق ضرور لکھتی اور جب کبھی پرڈینا اُس سے فون پر بات کرتی تو وہ کہتی۔

''حد ہوگئی ہے پرڈینا اب تم ہی باتیں کیے جاؤ گی رُکو۔ فون مجھے پکڑاؤ مجھے بھی تو اُس سے کچھ کہنا ہے۔''

اور یہ کہنا کیا ہوتا وہی کہ اب آجاؤ۔ کب تک اِن پڑھائیوں میں جان ہلکان کرتی رہوگی۔ تم نے شادی نہیں کرنی۔

یوں اُس کی شادی کیلئے تو وہ تب سے سرگرم تھی جب وہ سولہ سترہ سال کی تھی۔

''تو بیٹے یہ خدائی فیصلے ہیں جن سے رُوگردانی ممکن ہی نہیں۔''

اُس نے سر اُٹھایا اور اُس کی طرف دیکھا۔ پائل چُپ تھی۔اب وہ پیدائش اور شادی کا سارا بیان بھی اُسے سُنانا چاہتی تھی پر پائل نے اُسے روک دیا مگر پھر وہ بھی پڑھتی چلی گئی۔ Chavah(حوّا) کی شادی کہ جب فرشتوں نے عالم سرشاری میں رقص کیا اور موسیقی کی خوب صورت دُھنیں بجائیں۔

اُس نے آنکھیں اُٹھائیں اُس کے چہرے پر جمائیں اور بولی۔

''تیرے بیاہ میں بھی سب فرشتے آئیں گے اور تجھے سرشار کریں گے کہ تیرے دل میں ایک جنتی روح ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔

''آپ میری شادی بیاہ کو چھوڑیئے اور وقت دیکھیں۔آپ کی مترنم آواز سبت کے گانے کیلئے نہیں گونجی تھی۔تو میں نے سوچا آپ آج سارا دن کاموں میں ہلکان ہوتی رہی ہیں۔کہیں سونہ گئی ہوں۔آپ کو جگاؤں اور آپ کی مدد کروں۔''

اُسے کبھی بھی سبت یا دیگر مذہبی تہوار شالوش ریگلیم Shalosh Regalim یا تہوار قسمت Festival of Purim وغیرہ کی لمبی چوڑی تفصیلات سے کچھ خاص دلچسپی نہیں رہی تھی ہاں البتہ جب بڑی ہوئی تو یوم کپور اس لحاظ سے اچھا لگنے لگا کہ انسان اپنے گناہوں اور اپنی زیادتیوں پر خدا اور بندوں سے معافی مانگتا ہے۔دُنیا سے چلے جانے والے عزیزوں کیلئے شیشی گاگ میں ان کے نام کے آگے سارا دن موم بتیوں کا جلانا بھی اُسے بہت پسند تھا۔اپنی نانی ایموس کیلئے وہ ضرور موم بتی جلاتی۔اُن کا پورا نام لکھتی۔ایموس روز کے حروف کو نمایاں کرنے میں ہلکان ہوتی۔کہیں انکے گرد نیلی کالی اور سُرخ سیاہی کے حاشیے اور گل بوٹے بناتی۔پھر انکا تنقیدی نظر سے جائزہ لیتی۔پسند کی کسوٹی پر پورا نہ اُترتا تو

پھاڑ کر نیا بنانے میں جُت جاتی۔اُس کی ماں ہولوکاسٹ میں مرنے والے اپنے بیٹے کو یاد کرتی۔

پاس اور ر(ہجرت) اُس کا انتہائی ناپسندیدہ تہوار تھا۔ایک تو اس تہوار میں خمیر کا سیاپا۔ہر وہ شے جس کے اندر ذرا سے خمیر کا شائبہ ہو بھی ممانعت کے زمرے میں آتا تھا۔اُوپر سے کارمیلا سیونا (دادی) کی اِس معاملے میں پابندیاں اور سختیاں۔

وہ جھلّاتی۔اپنی ماں سے اُلجھتی۔''ڈبل روٹی کے بغیر ناشتہ اُف بندہ مرنہ جائے۔''

یرڈینا خاموشی سے اُس کیلئے بریڈ لے آتی۔اُسے چُھپا کر رکھتی۔اس کے جزبز کرنے پر کہتی۔

''نائل میری جان وہ بوڑھی ہے نا۔چلو اُسے تکلیف ضرور دینی ہے۔''

دوسرے اُسے ہجرت کے واقعات سُننے سے سخت بوریت ہوتی تھی۔کس شدومد سے تاریخ دہرائی جاتی۔میز پر اپنے سامنے پڑی ہگادہ Haggadah کو وہ بہت کم توجہ سے پڑھتی؟

بھئی مصر سے ہجرت کو زمانے گزر گئے ہیں۔اب ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو کیا دہرانا اور ان تلخیوں کو کیا یاد کرنا؟اور تھوڑی تلخیاں اور دُکھ ہیں زمانے میں۔ہاں سخت اُبلے انڈے بہت شوق سے کھاتی۔

اس کے اِس شوق پر کارمیلا سیونا بھی اُسے یہ بتانے اور سنانے سے باز نہ رہتی۔

''دیکھو صدیوں کے ظلم وستم کے بعد بھی یہودی قوم زندہ ہے اور زندہ رہنے کیلئے بہت پُرعزم ہے اور یہ انڈے اسی بات کا اظہار ہیں۔''

بس اِس سارے ہنگامے میں اُس کا اپنی ماں کو بہترین سفید لباس میں گڑیا سی بنی

دیکھنا نہایت اچھا لگتا تھا۔

سبت سے بھی اُسے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن اُسے اپنے ماں باپ، پہلے بھائی تھا اس کے جانے کے بعد کارمیلا سویتا آگئی۔ اُن سب کے ساتھ میز پر بیٹھنا اور اپنے باپ کا دعائیں دینا بہت پسند تھا۔ جب وہ اپنا بھاری سا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے اور محبت بھرے لہجے میں کہتے۔

تم بھی سارا، لیہہ اور راشیل کی طرح بنو۔ تم جانتی ہو اِن خواتین پر یہودیوں کو ناز ہے۔ یہ عورتیں ہمارے دین کا سرمایہ ہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کیلئے بہت قربانیاں دیں۔

ایسے میں ذہنی دریچے کا ایک پٹ کھٹ سے کھل جاتا۔ ہمیشہ اُسے منصور یاد آتا۔ اُس کا گھر اُس کے تصوّر میں اُبھرتا۔ جلال و جمال والی جدّو آنکھوں کے سامنے آتی۔ نہایت خوبصورت، مہربان اور محبت سے بھری عورت ضالیہ آنٹی۔ سب قطار در قطار چلے آتے۔ یہیں وہ اکثر جدّو اور ضالیہ آنٹی کے منہ سے فاطمہؓ، خدیجہؓ، عائشہؓ جیسی عورتوں کا ذکر سنتی۔

اور کبھی کبھی جدّو (منصور کی دادی) کا یہ کہنا اسلام اور یہودیت تو ایک دوسرے کے چچیرے بھائی ہیں جیسے الفاظ سننا اچھا لگتا تھا۔

کارمیلا سیوتا (دادی) کی آواز اتنی خوبصورت تھی کہ جب وہ جمعے اور ہفتے کی شام کو گھر میں گونجتی تو اُسے سننے میں لطف آتا۔ وہ دم سادھے شالوم ولیکم مالک یوم مل کم سنتی۔ کارمیلا تین بار اسے دہراتی اور پھر آگے بڑھتی۔ اُس کی آواز میں بڑی نغمگی تھی۔

وہ جب بھی گھر میں ہوتی اور سبت کا آغاز ہوتا یا اختتام وہ اپنے سارے ضروری کام چھوڑ کر صرف دادی کی مدد کیلئے کچن میں جا کر اُس کا ہاتھ بٹانے لگتی تھی۔

کارمیلا سیونا (دادی) کو بھی خبط تھا۔ جمعہ کی صبح سے ہی سبت کی تیاری میں جُت جاتی تھی۔ میز پر بچھانے کیلئے سفید چادر کا ڈھلنا ضروری ہوتا۔ سبت کی خاص وو دھاگے والی موم بتیاں الماری کے خانے میں علیحدہ سے سنبھالی ہوئی ہوتیں۔ شراب کیلئے عام گلاسوں کی بجائے وہ اُسے ہمیشہ Goblets سجانے کیلئے کہتی۔ کارڈ کیلئے بھی تاکید ہوتی اور Challah Loaves کا بیک کرنا بھی لازمی ہوتا۔ اُس کی سوندھی سوندھی خوشبو جب سارے گھر میں بکھرتی تو وہ اِسے اپنے اندر جذب کرتے ہوئے کارمیلا کو تنگ کرنے کیلئے اُلٹے سیدھے سوال کرنے لگتی۔ کبھی اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے اور اپنی ٹھوڑی اُن پر جماتے، اور کبھی اُس کے پوپلے سے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں تھامتے ہوئے ڈُلار سے کہتی۔

کارمیلا سیونا۔ موم بتیاں بھلا جلانا کیوں ضروری ہیں اور یہ ملکہ سبت کیا ہے؟ کبھی کبھی کارمیلا کو غصہ آجاتا۔ وہ اپنے چہرے کو خفگی کے واضح اثرات سے سجا لیتی اور لہجے میں ذرا سی تلخی گھول لیتی اور کہتی۔

''تمہیں تو اپنے دین سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ تم نے پڑھائی کی تو وہ عیسائیوں کے سکولوں میں۔ ماں اور بیٹی کی یاری دوستیاں بھی مسلمانوں اور یونانی آرتھوڈوکس عیسائیوں کے ساتھ ہیں۔ اور وہ تمہاری ماں بھی بڑی ہی لفنگی ہے۔ مجال ہے جو تمہیں دین کی کوئی بات سکھائے۔

پھر وہ ڈھیلی پڑ جاتی اور بولتی۔

اور خدا نے موسیٰ سے کہا ''میرے خزانے میں تمہارے لیے بہت قیمتی تحفہ ہے۔ اس کا نام سبت shabbat ہے۔ جاؤ اور اسرائیلیوں کو بتاؤ کہ میں انہیں یہ تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ بائبل یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ خدا نے دُنیا تخلیق کی۔ چھ دن کام کیا

اور ساتویں دن آرام کیا تو سبت ہمارے لیے آرام کا دن ہے۔

ایسے ہی ایک دن کھانے کی میز پر پائل کی رگ ظرافت پھڑکی۔ اُس نے شیمپین کا چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور بولی۔

کارمیلا سیونا ایک لطیفہ سُنیں گی۔ ہاں سیونا پہلے وعدہ کرو۔ غصہ نہیں چلے گا۔

کارمیلا سیونا نے اپنا سُرخ و سفید چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ اس پر پیار بھری خفگی کے ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ خفیف سے طنز بھرے انداز میں اُن کی آنکھوں نے کچھ اس نوعیت کا اشارہ دیا کہ چلو سناؤ جو بکواس سنانی ہے۔

ایک خاتون ربّی (یہودیوں کا پادری یا مولوی) کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

''ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہتی ہوں۔'' خاتون نے کہا۔

پوچھو۔ ربّی کا لہجہ بڑا مشفقانہ تھا۔

خدائے واحد کو اس دُنیا کی تخلیق میں کتنا عرصہ لگا؟

''چھ دن'' ربّی کا جواب تھا۔

''تو اس کے بعد سے وہ بابرکت ہستی کیا کرتی رہی ہے۔'' خاتون نے پھر سوال داغا۔

''اس کے بعد سے خدائے واحد شادیوں اور طلاقوں جیسا اہم کام کرنے میں مصروف ہے۔'' ربّی نے کہا۔

ڈیوڈ اور ریڈینا ہنس پڑے۔ کارمیلا سیونا کو یہ بُرا لگا۔ انہوں نے منہ بسورا تو اُس نے فوراً معذرت کی۔

''معافی معافی کارمیلا سیونا۔'' اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''چلو سر ڈھانپو۔'' اُس نے حکم دیا۔

کارمیلا بہت اہتمام سے اپنا سر ڈھانپتی اور ریڈینا کو بھی کہتی ۔موم بتیاں جلاتی اور پھر انہیں تین دفعہ اپنی اور ان کی جانب لہراتی ۔اس کے بعد اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور دُعا پڑھتی ۔

''اے میرے خدا! کائنات کے مالک۔آپ بہت مقدس ہیں ۔آپ نے اپنے احکام ہم پر اُتارے ہیں اور ہمیں سبت کی روشنی کے اہتمام کا حکم دیا ہے۔''

وہ گھر والوں کیلئے دعا مانگتی ۔دونوں بچوں کی سلامتی کیلئے گڑگڑاتی ۔

ریڈینا بھی دھیرے دھیرے اس کام میں شامل ہونے لگی تھی ۔ہاں البتہ وہ یہ سب دادی کی خوشی کیلئے کرتی ۔

ڈیوڈ شیڈنگاگ سے واپس آتا اور پھر وہ سب فرشتوں کو خوش آمدید کہنے والا گیت گاتے اور برکت کی دعا مانگتے۔

اور وہ ایسا ہی سبت کا دن تھا۔

ضالیہ کے ہاں سے آنے کے اگلے دن سبت کی شام تھی ۔وہ میز پر بیٹھی اس سارے عمل کو دیکھتی تھی ۔پھر جیسے پائل کی خوبصورت آواز سارے گھر میں گونجنے لگی ۔

The Sun has gone down in the sky now

The darkness of evening is near

The days of the week passed have by now

The time for the Sabbat is here

Come Let us sit with our loved ones together

is where we belong

The children are patiently waiting

How lovely the food on the table

The candles are burning so brightly

Welcome the queen of Sabbat

Shabbat shalom omevorach

ڈیوڈ، بیرڈینا اور کارمیلا دادی نے تالیاں بجائیں اور جب وہ میز سے اُٹھتی تھی اُس نے کہا۔

''ممی آپ ابراھم ایلان سے کہہ دیجئے میں شادی کیلئے تیار ہوں۔''

باب نمبر: ۱۴

''منصور تم سن رہے ہونا''۔ یرڈینا فون پر تھی۔

''جی ڈھوڈا'' (عبرانی میں خالہ، چچی، ممانی کو کہتے ہیں)۔

''کچھ کہو کچھ بولو۔'' یرڈینا کی آواز میں اضطراب، بے چینی اور بے یقینی کا جو عنصر تھا وہ منصور سے چھپا نہ رہ سکا تھا۔

''ڈھوڈا میں سن رہا ہوں۔ہاں سنایئے آپ ٹھیک ہیں؟ یائل کیسی ہے؟ شادی کی تیاریاں جاری ہیں۔سب کام ٹھیک ہوں گے۔ خدا پر بھروسہ رکھیے۔ہاں کارمیلا سیوتا savta (دادی، نانی) کی دردوں کا کیا حال ہے؟''

''لو اپنی کارمیلا سیوتا سے خود بات کرو۔'' کارمیلا نے ریسیور پکڑتے ہی کہا۔''تمہیں آنا ہے منصور۔میری خواہش ہے۔میری خوشی ہے۔''

''میری پیاری سیوتا آپ کی خوشی میرے لیے بہت اہم ہے۔شادی میں شرکت میرے لیے ممکن نہ ہوگی۔یہاں ڈاکٹروں کی بہت کمی ہے۔یائل نے یہاں کے حالات دیکھے ہیں۔وہ بھی مصر تھی میں نے اُسے بھی سمجھا دیا ہے۔انشاءاللہ پھر اکٹھے ہوں گے اور ہاں آپ نے ملٹی وٹامنز Multi Vitamins کھاتے رہنا ہے۔''

کارمیلا نے فون رکھا اور لمبی سانس بھرتے ہوئے یرڈینا سے بولی۔

منصور اپنے کمرے میں تھا۔پس منظر سے آنے والی فرید العطرش کے دل میں ہلچل مچانے والے اس کے مشہور گیت ''البی وامفتاہو'' کی دُھن بہت مدھم سُروں میں بج رہی تھی اور اس وقت یائل بھی فرید العطرش کو ہی سُن رہی ہے۔

''کاش میرے اختیار میں ہوتا تو میں اِس یہودیت اور اسلام کو چولہے میں جھونک دیتی۔منصور جیسا لڑکا، ضالیہ اور ڈاکٹر موسیٰ جیسے لوگ۔''

اُس کے سینے سے ہوک اٹھی تھی جو سارے چہرے پر بکھر کراُسے غمگین کرتی گئی۔

کارمیلا نے قدرے خفگی سے کہا۔

''ارے یرڈینا اب تک تو تمہیں ان ہیریڈی (انتہاپسند) اور گش ایمونم (ایمان والے) گروپوں کی سمجھ آجانی چاہیے تھی۔یہ تو ہم سفاردیوں (سپین سے ہجرت کر کے عرب علاقوں میں سیٹل settle ہونے والے عرب یہودی) کو گھاس نہیں ڈالتے۔اللہ مارا ان اشکینازیوں (یورپی یہودی) کا تکبر،اِن کا نسلی اور نسبی ہونے کا غرور۔انہیں کہاں لے جائے گا۔ہم عرب یہودی،عرب عیسائیوں اور عرب مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہوئے بہت خوش و خرم تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اسرائیلی ریاست بنے۔

ہم پرانے بوڑھے سفاردی یہودی داؤد حسنی،فرید الاطرش،محمد عبدالوہاب اور زکریا احمد کی دُھنوں کے عاشق۔مجھے یاد ہے یرڈینا نے دیکھا تھا۔کارمیلا کی آنکھوں میں ماضی کے کسی خوشگوار احساس کا کوئی عکس جھلملایا تھا۔بازار میں سودا سلف لیتے ہوئے کسی کیفے پر گونجتی ام کلثوم کی آواز اور محمد عبدالوہاب کی دُھنیں مجھے پاگل کر دیتی تھیں۔میں تو آنے بہانے رُک جاتی تھی۔پورا گیت سُنتی تھی پھر کہیں پاؤں آگے کو اُٹھتے تھے۔

پیالیاں پیتے،شعروسخن کی محفلیں برپا کرتے جارج العبید کے مصری گروپ کا سماع سُننے بھاگے جاتے۔یہ سب ان کیلئے اور ہمارے لیے کتنا خوبصورت اور زندگی سے بھرپور ہوتا تھا۔

ہم نے احمد شوقی،ولادہ بنت المستکفی،بشر قبطی،فرانسس ماریش(Faranic Marrash)،انور شاؤل اور امرالقیس کو کبھی یہ نہیں سمجھا تھا کہ یہ کون ہیں؟عیسائی

ہیں، یہودی آرتھوڈوکس، آرمینیائی۔ بس اُن کی شاعری پڑھتے اور سر دُھنتے۔نئی آوازوں کی تلاش میں رہتے۔ایک دوسرے سے ملتے تو پوچھتے۔

''ارے تم نے فلاں کی فلاں چیز پڑھی ہے۔'' پھر اُس پر بحث ہوتی۔

مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولتے جب ہم قاہرہ میں تھے۔قاہرہ بڑا خوبصورت شہر تھا۔ہم غریب ضرور تھے مگر ادب اور آرٹ کے قدردان تھے۔پلی پلی جوڑتے اور اوپیرا تھیٹر جاتے۔سردیوں کی راتوں میں لالٹینوں کی روشنی اور گرمیوں کی دوپہروں میں ناول پڑھتے تھے۔

''ارے ریڈینا میں بھی! کیسی پاگل ہوں۔بوڑھی ہو کر سٹھیا گئی ہوں۔دیکھونا تمہارے سامنے یہ باتیں کر رہی ہوں۔تمہیں یہ سب سُنا رہی ہوں۔تمہیں یہ سب سُنا رہی ہوں۔تمہیں جو اس کلچر کو جانتی ہی نہیں۔تمہیں کیا پتہ ولادہ بنت المستکفی کا۔دسویں صدی کی بے باک اور لاجواب شاعرہ۔تم کیا جانو احمد شوقی کو۔

پھر وہاں ایک لمبی تاسف بھری آہ تھی۔

''تم بھی احمق ہی نکلیں۔کس نے تمہیں اتنا گھلنے ملنے کا کہا تھا۔جب بچے اتنا قریب رہتے ہوں اور خاندانوں میں اتنا پیار ہو تو مذہب کو کون دیکھتا ہے؟''

''کارمیلا ڈھوڈا واقعی تم سٹھیا گئی ہو۔تمہیں میں نے کتنی بار بتایا ہے کہ میری ماں منصور کے دادا کو زمانوں سے جانتی اور ان کی بلند ظرفی کی مداح تھی۔وی آنا میں جب وہ تھیوڈور ہرزل کے آفس میں ملازم تھی اور منصور کے دادا وی آنا یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے تو اُس کا ان کے گھر بہت آنا جانا تھا۔

ہم تو لٹے پٹے حیفہ آکر اُترے تو میری ماں کسی یہودی تنظیم کی مدد لینے کی بجائے سیدھی یروشلم ان کے پاس آ گئی۔مجھ جیسی ٹوٹی پھوٹی عورت کو جیسے انہوں نے سنبھالا یہ تو ان

کا بڑا اپن تھا۔ہاں مجھ جیسی اوندھی کو تو یہ عقل ہی نہ آئی ۔لہجے میں دُکھ گھل آیا تھا۔

''ارے تمہارا تو سسرال بھی اوّل درجے کا بدذات ہے۔کسی اور کی بات کیا کرنی ۔چلو چھوڑو اب ۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔یہوواہ(خدا)جو کر رہا ہے اچھا ہی ہوگا۔دونوں قوموں کے انتہاپسندوں نے ہماری بچی کو برباد کردیا تھا۔ایک جو اس وقت مظلوم اور بے بس ہے اُس نے اپنی فتح کا شور مچایا تھا اور دوسری نے دونوں میاں بیوی کو سنگینوں کی نوک پر رکھ لیا تھا۔''

دفعتاً اُس کی نظر کلاک پر پڑی ۔ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ۔''لو تمہارے ساتھ باتوں میں تو مَیں اپنی نماز ہی بھول گئی ۔مجھے تو شیشی گاگ جانا تھا آج ۔''اُس نے ہاتھ میں پکڑی کپاہ سر پر پہنی اور یا یہوواہ یا سکینہ کہتی تیزی سے باہر نکل گئی ۔

شادی یروشلم میں ہونا طے پائی تھی ۔ڈیوڈ کی فیملی کا پریشر تھا۔اُس کا سارا خاندان لدّہ رملہ اور مغربی یروشلم میں تھا۔یرڈینا کی نند بھی یونانی کالونی یروشلم میں رہتی تھی ۔اُس کا بھی اصرار تھا۔فون پر ڈیوڈسن سنٹر Davidson Centre کے بارے میں بتاتی تھی کہ مغربی دیوار کے ساتھ بنا ہے۔اتنا شاندار ہے ۔ڈوم آف دی روک کا منظر اور صدیوں بعد یہودیوں کا عُروج ۔ بہت لُطف آتا ہے وہاں جا کر۔ایک تاریخ نظروں کے سامنے پھڑ پھڑاتی ہے اور سچی بات ہے مسلمانوں نے یہ جگہ ہم سے چھین لی تھی اور اِن کی یہ مسجد اقصیٰ تو ہیکل سلیمانی کے کھنڈروں پر ہی تعمیر ہوئی ہے ۔وہ وقت بھی جلد آجائے گا جب ٹمپل ماؤنٹ پر ہمارا معبد پھر تعمیر ہوگا۔اب اس قبۃ الصخرہ اور مسلم مسجد کو یہاں رکھنے کا قطعی جواز نہیں ۔دراصل تو اس کی تعمیر ہی زیادتی کے زمرے میں آتی ہے ۔

''لعنت ہو تم پر۔''یرڈینا نے فون پٹختے ہوئے خود سے کہا۔

''ابھی بھی تمہارے کلیجوں میں ٹھنڈ نہیں پڑی۔فلسطین پر قابض تو ہو گئے ہو

تم۔ بحیرہ روم کی ساری ساحلی آبادیوں کو کیسے ملیا میٹ کر دیا گیا۔ دیرویاسین میں تو نازیوں کو بھی مات دے دی۔ پرانے اور نئے یروشلم میں جو ظلم و ستم ہوئے، گھروں پر جیسے بلڈوزر پھیرے گئے۔ ان کے اندر گھس کر قتل و غارت کا جو بازار گرم ہوا، کیسے کیسے پیارے اور انسان دوست لوگ قتل ہوئے۔ وہ اُن کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سے آگاہ تھی۔ بڑی حساس عورت تھی۔ ذہن زیادہ اضطراب میں پھنس جاتا تو خود کو لعن طعن کی پھٹکار سے مارتے ہوئے کہتی۔

''کمبخت بڑی بجن ہے ماٹو مسلمانوں اور عیسائیوں کی۔ سارہ ٹھیک کہتی ہے۔ اگر کہیں مسلمان غالب آجاتے تب یہ سب یہودیوں کا مقدر ہوتا تھا اور عیسائی بھی ایسے ہی ہیں۔ ارے ہم تو زمانوں سے دربدری کی خاک چھانتے آئے ہیں۔ بھئی مجھے نہیں جلنا کڑھنا۔ ہاں یہ مسلمان فیملی تو سچی بات ہے میری کمزوری ہے۔ مجھے اعتراف ہے اس کا۔''

انہی دنوں ابراھم ایلان کا فون آیا۔ یرڈینا سے اُس نے کہا تھا کہ وہ یائل سے ملنا چاہتا ہے کہ جب سے وہ اسرائیل آئی ہے وہ اُس سے ملا تک نہیں۔

یرڈینا تھوڑی سی خوف زدہ بھی تھی۔ چاہتی تھی کہ ٹیلی فونوں اور ملنے ملانے کے چکروں کی بجائے جتنی جلدی ممکن ہو سکے شادی کی تقریب سرانجام پا جائے۔ یائل جیسی موڈی لڑکی کا ٹھیک سے کچھ پتہ نہیں کب ہتھے سے اُکھڑ جائے۔

پر اب ابراھم کو انکار بھی کتنا مشکل تھا۔ یرڈینا نے ذرا جھجکتے ذرا ڈرتے ڈرتے یہ بات یائل کے گوش گذار کی تھی۔ یائل چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

''ممی وہ میرے لیے کوئی اجنبی تھوڑی ہے۔ اپنے سارے کچے چٹھے تو اُس نے مجھے سنا ڈالے ہیں۔ اب کیا ملاقات کرنی ہے۔'' تاہم ماں کے چہرے پر بکھرے ملتجیانہ سے تاثرات دیکھتے ہوئے اُس نے کہہ دیا تھا تو آجائے کسی دن۔ عکہ یہاں سے کونسا دُور

ہے؟

اُسے لندن کی وہ دوپہر یاد آئی تھی جب ایلان نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا تھا۔تمہیں ذرا دلچسپی نہیں ہوگی میرے خاندان سے مگر یہ بڑا عجیب وغریب سا خاندان ہے۔تضادات سے بھرا ہوا۔تم سنو گی تو ہنسو گی اور واقعی ہنسنے والی باتیں ہی تھیں۔دائیں بائیں نظریات کا ملغوبہ۔اُس کا باپ سچا پکا کیمونسٹ پولینڈ کے شہر پلانسک میں پیدا ہونے والا۔1910ء میں وہ فلسطین آیا۔ڈیوڈ بن گوریاں کا گرا ہیں،اُس کا یار مگر اس کا نظریاتی دشمن۔کھلم کھلا اُسے اسرائیلی شاونزم کی بدروح کہتا تھا۔بن گوریاں نے اپنی پہلی وزارت عظمیٰ میں 1952ء کے وسط میں ہی اُسے پار لگا دیا تھا۔شکر تھا کہ لاش مل گئی وگرنہ اُسے بھی گٹے بلیوں نے کھا لینی تھی۔

اُس کا چھوٹا چچا ربی (مولوی) تھا۔ویسٹ بنک کی ایک بستی کریت اربا کے ایک مذہبی سکول کا ہیڈ جس کا کہنا تھا کہ اسرائیل کے فرزندوں کا اسرائیل کی سرزمین سے تعلق تو زمین وآسمان کی تخلیق کے وقت ہی وجود پذیر ہو گیا تھا۔

یائل ہنس پڑی تھی۔چلو شکر ہے کہیں کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے سے ناطہ نہیں جوڑا۔اگر جوڑ دیتا تو اور مصیبت پڑ جاتی تھی۔

اُس کا ایک ماموں عبرانی اخبار "ماریو" کا ایڈیٹر editor نہایت فضول ربیوں کی بغلوں میں گھسا رہتا ہے۔اُن سے فتوے لینا،اشتہاروں میں عورتوں کے تصویری چہروں پر سیاہی پھیرنا اور سینائی،اُردن،لبنان،کویت اور شام کو ارضِ کنعان کہتا ہے۔اسے آزاد کرانا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے۔اس کی پھوپھی اسی اخبار میں سیاسی رپورٹر کٹر یہودی آرتھوڈوکس۔یہودیوں کو منفرد قوم سمجھنے والی۔بھائی نگیل انڈسٹریل گیس فونڈری میں کیمسٹ chemist ہے اور لیبر پارٹی کی پالیسیوں کو پسند کرتا اور اُسے ووٹ دیتا

ہے۔ساتھ میں گلوکاری بھی کرتا ہے۔

یائل نے ہنستے ہوئے کہا۔خاندان سے تو مل لیا۔اب خود سے ملاؤ۔

میں ایک چھوٹا سا سچ بولنے اور سچ لکھنے والا جو انسانیت کو ہی مذہب سمجھتا ہے۔یہاں تک کے سفر میں قلم کی طاقت کے ساتھ ساتھ قسمت کی عنایت کا بھی دخل کہوں گا۔''دی واشنگٹن پوسٹ'' کمپنی کے ایک ممبر نے میرا ایک مضمون The Star Ledger میں پڑھا اور ایک بڑے اخبار کے دروازے میرے اُوپر کھل گئے۔دراصل امریکہ کے لیڈنگ اخبار وال سٹریٹ جرنل، دی واشنگٹن پوسٹ، دی نیویارک ٹائمز، دی ڈیلاس مارننگ نیوز یا شکاگو ٹریبون لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے اِن اخباروں کی کمپنیوں کے بڑے حصے دار یہودی ہیں۔امور خارجہ پر لکھنے والوں کی ہمدردیاں اور ان کے رجحانات کسی نہ کسی رنگ میں صیہونیوں کے ساتھ ہیں۔اب ایسے میں میرے جیسا سر پھرا جو جان جائے پر سچ پر آنچ نہ آئے جیسے سکول آف تھاٹ School of thought رکھنے والے کر برداشت کرنا تو دل گردے کا کام ہے۔حقیقت یہ ہے کہ میرا سچ بڑے لوگوں سے ہضم نہیں ہوتا۔خودستائی نہیں مگر مشرق وسطیٰ پر ایک اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتا ہوں۔سچ لکھنے کا انجام اپنی زندگی کو مشکل کرنا اور موت کو دعوت دینا ہے لیکن مزہ اسی ہے۔

ابراھم اِس سارے سینوریو scenario میں تم فلسطینی مسئلے کو کس نظر سے دیکھتے ہو۔

یقیناً ظلم ہو رہا ہے۔تیسرے اور چوتھے درجے کے شہری بنا کر ان کی زندگیوں کو پابندیوں میں جکڑ کر آپ اُن سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے غم و غصّے کا اظہار بھی نہ کریں۔چھری، پتھر، دستی بم جو ان کے ہاتھوں میں آ رہا ہے وہ اُٹھا رہے ہیں۔خود زیادہ مرتے ہیں لیکن مارتے یہودیوں کو بھی ہیں۔کم از کم نفسیاتی خوف کا شکار تو بنا دیا ہے نا انہوں

نے ۔دوسری اہم بات میرے خیال میں اسرائیل فطرت کے ایک اہم اصول سے مسلسل روگردانی کر رہا ہے کہ زبردست ہمیشہ طاقتور نہیں اور کمزور ہمیشہ کمزور نہیں رہتا۔حال میں موجود طاقت کے فلسفے کو مان کر ظلم و جبر کی جو مثالیں قائم کی جا رہی ہیں وہ خوفناک ہیں ۔اسرائیل کا آج یقیناً بہت تابناک ہے مگر مستقبل تاریک ہے۔

ابراھم ایلان کی شخصیت میں کوئی بات بھی متاثر کرنے والی نہ تھی ۔ہاں البتہ وہ بہت سچا اور کھرا انسان تھا۔یائل نے اِن دنوں اس کے مضامین پڑھے تھے۔اور وہ اس کی تحریر کی سچائی اور بیباکی سے متاثر ہوئی تھی ۔دراصل غربی لندن میں یائل کوئی پندرہ دن اپنے ماموں کے پاس ٹھہری تھی جہاں ابراھم ایلان اُن کے ہمسایوں کا پے انگ گیسٹ تھا۔بارہ پندرہ ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔آٹھ نو تو ایلان کی مریض کی حیثیت سے اور تین چار ہمسائیگی کے ناطے۔آخری ملاقات میں اُس نے کہا تھا۔

ڈاکٹر یائل تم مجھے بہت پسند آئی ہوایسا۔۔۔۔ایسا کے بعد وہ کیا کہنا چاہتا تھا اس کی نوبت ہی نہیں آئی ۔یائل نے ٹوک دیا تھا۔

''میں فلسطینی مسلمان سے محبت کرتی ہوں۔''

اور جس شام وہ حیفہ کی جرمن کالونی کے اُس گھر میں داخل ہوا وہ اتفاقاً جمعے کی رات تھی ۔گیٹ کو شاید کوئی بند کرنا بھول گیا تھا۔وہ اندر آ گیا تھا۔گھر کے در و دیوار پر سبت کو خوش آمدید کہنے والا تالمودی داستان گوئی کا صدیوں پرانا شہرہ آفاق گیت بکھرا ہوا تھا۔

پورچ کی ملگجی سی روشنی میں اُس کے پاؤں رُک گئے جیسے بریک لگ جائے ۔شلوم علیکم مالکے یون مائی می لیک مالکِ مالاکم۔الفاظ کی سہ بار تکرار ہو رہی تھی ۔اُسے کوئی یاد آیا تھا۔کمزور سا ایک وجود جو جمعے کی رات کو اسی طرح ربی یوسی بن یہودا کا یہ گیت اسی محبت اور جذبے سے گاتا جس طرح اِس وقت اِس گھر میں گایا جا رہا تھا۔اس کا

سارا بچپن اسی گیت کے گرد گھوما تھا۔اس کی نغمگی اور رعنائیت ہمیشہ اُسے اچھی لگتی تھی ۔اُن دنوں سبت کے بہت سے نئے گیت بھی گائے جا رہے تھے مگر اُس کی ماں کو یہی پسند تھا۔آمین کہنا بھی اچھا لگتا تھا۔کبھی اگر چُپ رہتا تو ماں زور دے کر کہتی کہو آمین ۔نہیں کہو گے تو رحمت کے فرشتے نہیں آئیں گے۔

اور جونہی The Lord will guard your going and your coming from now and for all time. کی تکرار شروع ہوئی اُس نے شلوم کہتے اندر قدم رکھا اور موم بتیوں کی جلتی روشنی میں میز کے گرد بیٹھا خاندان اُسے دیکھتے ہوئے خوشی سے چہکا۔

پھر کھانے اور باتیں کرتے ہوئے اُس نے اپنی مرحومہ ماں کا تعارف کروایا۔

کھانے کے بعد کارمیلا سیونا نے ''برکت ہمازن'' کہا اور چار شکر ادا کیے ۔خدا نے انہیں کھانا دیا ،وہ سرزمین اُنہیں دی جس کے وہ وارث تھے ۔تیسری یروشلم انہیں لوٹایا اور چوتھے اسرائیل کو کبھی فنا نہ کرنے کی تاکید۔

ایلان اِس چوتھی دُعا پر زیرِ لب ہنسا تھا۔یہ تو ممکن ہی نہیں مگر بولا کچھ نہیں ۔

اگلے دن دوپہر کو دونوں پورچ میں بیٹھے باتیں کرتے تھے ۔رات جو وہ سٹی سینٹر سے روز ایلیگنس Rose Elegance اور پنک بلاسم Pink Blossom کے سپیشل گلدستے لے کر آیا تھا وہ دیواری گلدانوں میں سجے خوبصورت لگ رہے تھے ۔چھوٹے سے لان میں سامنے کے رخ تین سنگتروں کے بوٹوں پر کچے پھل کی بہار آئی ہوئی تھی ۔ابراھم نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

حیفہ کے سنگتروں جیسی مٹھاس اور سنہری رنگت دُنیا میں کہیں نہیں ۔

تھوڑی دیر بعد یائل نے پوچھا تھا۔ابراھم تم ملنا چاہتے تھے کوئی بات تھی کیا؟

"کچھ خاص نہیں۔ بس دل چاہتا تھا کہ تم سے ملوں اور یقیناً کہیں یہ بھی خواہش تھی کہ کہوں بہت لاابالی سا انسان ہوں مگر محبت دینے میں فیاض ہوں۔"

یائل خاموش تھی۔ اپنے سامنے گہرے سُرخ پھولوں کو دیکھتی تھی۔ کتنی دیر بعد بولی۔

میرے بتانے کے باوجود تم نے مجھے پروپوز propose کیا۔

ہاں دو باتیں تھیں۔ پہلی میرے باپ کی ڈائری میں جن لوگوں کا ذکر بہت احترام اور محبت سے کیا گیا تھا اُن میں ایک نام یوسف ضیا خالدی کا ہے۔ منصف اور جی دار۔ سچ حق پر کھڑا ہونے والا۔ میرے باپ کا یروشلم کے حسینی خاندان کے ایک بااثر شخص سے جھگڑا ہو گیا۔ کیس یروشلم کونسل میں سماعت کیلئے پیش ہوا۔ مدِ مقابل کو ایک یہودی کے مقابلے پر بہت سی ترجیحات حاصل تھیں۔ بیوی کا رشتہ دار، بااثر شخصیت، مسلمان۔ کس دھڑ لے سے فیصلہ کیا۔ نہ کسی کی پرواہ نہ کوئی خوف نہ لالچ۔ اُن کے مرنے کے بعد ہمارے دگرگوں حالات میں مدد کے کھاتوں میں اُن کا نام بھی شامل ہے۔ میں تمہاری فیملی سے ملنے حیفہ آیا تو یوسف ضیا کی فیملی سے تعزیت کرنے سب سے پہلے ان کے گھر گیا تھا۔

دوسرے تمہاری ذات سے ایک واقعہ جُڑ گیا اور وہ ذہن کی دیواروں سے نہیں چھٹتا تھا۔ اپنے باپ کی زندگی میں بھی ہم کوئی بہت خوشحال لوگ نہیں تھے مگر اُس کے قتل کے بعد اس کے بڑے دشمن ہمیں سپنولیے جان کر ہمارے سر بھی کچل دینا چاہتے تھے۔ تنگدستی تھی اُوپر سے پڑھائی کا معاملہ۔ ایک دن میری ماں نے صندوق سے ایک بہت پرانا سونے کا زیور نکالا۔ یہ شاید بازو میں پہننے والا تھا۔ خاصا وزنی۔ میری ماں سفاردی یہودن (سپین سے ہجرت کر کے آنے والے یہودیوں کو سفاردی کہتے ہیں) تھی اور وہ بڑی منفرد اور انوکھی سی چیز تھی۔ زمانوں پرانی اس کی کسی نانی دادی سے کسی تحفے کی صورت میں اُسے دان ہوئی

ہوئی۔

میں نے اُسے دیکھا۔میری ہتھیلی پر وہ رکھا ہوا تھا اور میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔اُس کی سنہری رنگت میں قدامت کی ایک گھمبیرتا کا ساوقار اور حُسن کا رچاؤ تھا۔شوخی اور چنچل پن نہیں تھا۔خالص،رتی بھر ملاوٹ کے بغیر ٹھوس،وزنی اور بے حد قیمتی۔میں نے اُسے بیچ دیا مگر وہ ہمیشہ میرے ذہن سے چپکا رہا۔اور جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا میں نہیں جانتا وہ زیور کیوں میری آنکھوں کے سامنے آیا اور اُس کی تم سے کیوں مماثلت جُڑی۔

منصور سے میری ملاقات جنین میں ہر روز رات کو ہوتی کہ میرا قیام بھی وہیں تھا۔منصور سے میں متاثر ہوا تھا۔معلوم تو مجھے کوئی ماہ بعد ہوا کہ وہ کس خانوادے سے ہے۔اب جب یہ شادی نہیں ہو رہی تھی تو پھر مجھے درخواست گزاری کا حق تھا اور چلو تم نے اِسے قبولیت دے دی۔

اور اس کے جانے کے بعد یائل کتنی دیر ساکت کھڑی رہی۔کہیں سنگن تھی،کہیں خلش تھی،کہیں تڑپ تھی اور کہیں حیرت تھی۔تاہم اُس نے سر جھٹکا۔"آپ کو زندگی میں سب کچھ نہیں ملتا۔"

کارڈ اور رضا لیہ کا خط دونوں منصور کو اکٹھے ملے تھے۔رضا لیہ نے لکھا تھا۔شادی اگر حیفہ میں ہوتی تو زیادہ اچھا تھا۔یروشلم جانا بہت تکلیف دہ ہے مگر شرکت بھی لازمی ہے۔سمجھ نہیں آتا کہ یروشلم کس دل سے جائیں۔ابھی زخم اتنے ہرے ہیں کہ ہر روز اُن سے خون رستا ہے۔گھر بھی نہیں رہا۔تمہارا باپ کوکوشش میں تو ہے لیکن سچی بات ہے مجھے تو ایک فی صد بھی اس کی واپسی کی اُمید نہیں۔امّو کا اصرار ہے اور یائل کا بھی۔اُس نے تو دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نہیں آئیں گی تو میں نے شادی ہی نہیں کرنی۔

اُس کی ماں کا یہ تھوڑا سا جذباتی اور غیر جذباتی سا خط محض اس کی تسلّی و تشفّی کیلئے

تھا۔وگرنہ کیاوہ اپنی ماں کے جذبات سے لاعلم تھا۔

خط اُس نے کتابوں کے پیچھے کہیں پھینک دیالاپرواہی کے سے انداز میں مگر تاریخ کا کیا کرتا وہ تو دل پر نقش تھی۔سارا سارا دن وہ مریضوں اور آپریشنوں میں جُتا رہتا اور جونہی تھک کر بستر پر گرتا ذہن کی سکرین پر فلم چل پڑتی۔

26اکتوبر۔کیایہ دن میرا مقدر نہیں بن سکتا تھا۔

اندر نے تلخی سے جواب دیا تھا۔

نہیں۔جوڑے تو کہیں اُوپر بنتے ہیں۔موز زمنڈل اور موشے کو جس دن کارڈ ملے منصور کا اضطراب اور بے چینی اُن کی سمجھ میں آ گئی۔دونوں نے یکسر خاموشی اختیار کی اور کچھ نہیں کہا اور دونوں نے فیصلہ کیا کہ اُنہیں شرکت نہیں کرنی۔منصور کے پاس ٹھہرنا ضروری ہے۔

اُس کی کُھلی آنکھوں کے سامنے یروشلم کی تاریخی اور تہذیبی ورثے کی حامل مغربی دیوار کے پس منظر میں بلند وبالا سرو کے پیڑوں اور گھاس کے لانوں سے بھرا ڈیوڈسن سنٹر کا اوپن ایئر ویڈنگ Open-air Wedding مرکز تھا۔

اُس نے خود سے پوچھا تھا۔

یہودی شادی کا بے حد اہم جُز مقدس شامیانہ chupah کیا سادہ اور سفید ہوگا یا ستارہ داؤدی اور توراتی آیات سے سجا کہ وہ ہمیشہ ایسی روایتی چیزوں کا مذاق اُڑایا کرتی تھی۔اُس کے بہت سے رُوپ اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔پھر ایک اور منظر اپنی پوری رنگینیوں سے اُبھرا۔

مرد وخواتین کی دو رویہ قطاروں کے درمیان سفید براق گاؤن اور جالی کے نقاب اندر سے دمکتے چہرے والی یائل نے اپنے والدین کے ساتھ رمپ پر چلتے ہوئے میرے

بارے میں سوچا ہوگا۔

آنٹی ریڈینا نے ابراھم کو گلے لگاتے ہوئے کیا مجھے یاد کیا ہوگا۔اُس کے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے کہیں میرے رخساران کے تصور میں اُبھرے ہوں گے۔

پھر جیسے اُسے خود پر غصہ آیا۔وہ کس قدر جذباتی ہو رہا تھا۔جو راستہ اُس نے چُنا تھا اس پر یہی ہونا تھا تو اب کُھلنے کا فائدہ۔اُس نے نیند کی گولیاں لیں۔پر کیسی مضطرب سی نیند تھی۔بار بار آنکھ کُھلتی اور بے چین کر جاتی۔

پھر ایک گہری جھوک سی آ گئی۔دو تین گھنٹے گزر گئے۔آنکھ کُھلی تو اندر جیسے بوٹیوں میں کٹنے لگا تھا۔وہ اُٹھا اور مریضوں کے پاس چلا گیا۔کون سا راستہ تھا توجہ ہٹانے کا۔صرف اور صرف خدمت کا۔

اُس نے سوچوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے اور ہر وقت مریضوں میں رہنے لگا۔جب اُسے پائل کا خط ملا۔

میں تو خود کو سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔جب یہ طے تھا کہ مجھے اب پیچھے ہٹ کر نہیں دیکھنا اور جذبات کو گہری نیند سُلا دینا ہے اور پھر میں نے یہ سمجھ لیا کہ میں بہت مضبوط ہوں۔میں نے اپنی محبت کو پچھاڑ دیا ہے مگر یہ کیسی احمقانہ سی سوچ تھی۔

شادی کے ٹکڑوں میں بٹے مرحلے بہت تکلیف دہ تھے۔ڈیڈی ابراھم کیلئے کیٹل kittel (دولہا کی سفید قمیض اور سفید کوٹ) بہت قیمتی اور مہنگا لے کر آئے تھے۔اُن کے چہرے پر چاؤ اور محبت کے بہت سے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔میں مما کے کمرے میں ہی تھی۔انہوں نے اُسے لہراتے ہوئے دادچاہی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ قمیض وہ کوٹ اور نکٹائی پہنے تو تم کھڑے ہو۔

کارمیلا دادی بھی کیسی زمانہ شناس ہیں۔آنکھوں کو پڑھنا جانتی ہے۔شر شر باہر

لپکتے جذبات پڑھ بیٹھی تھی ۔میں جب باہر نکلی میرے تعاقب میں آتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولی تھیں ۔

منصور کو نہیں سوچنا۔

بڑی مجروح سی ہنسی میرے ہونٹوں پر پیدا ہوئی تھی ۔میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا مگر اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے خود سے پوچھا تھا۔میں نے تو خود کی نفی کر دی تھی پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

مگر منصور وہ لمحہ میرے لیے قیامت کا تھا جب میں یروشلم میں ڈیوڈسن سنٹر کے رمپ پر ممی ڈیڈی کے ساتھ چلتی تھی اور میرے چہرے پر وہ آزردہ سی مسکراہٹ تھی جو ممی کے بار بار کہنے پر میں ہونٹوں پر بکھیرتی تھی ۔ہم رُک گئے تھے۔سامنے سے ابراھم آتا تھا۔یہاں میرے والدین نے مجھے اس کے حوالے کرنا تھا۔ممی نے مجھے متوجہ کیا تھا سنو اور دھیان دو۔فضا میں کسی آیت کو ترنم سے پڑھا جا رہا تھا۔میں نے سُنا۔

"اپنے لیے ستون کھڑے کر۔اپنے لیے کھمبے بنا۔اِس راستے پر چلتے ہوئے دل لگا۔اُس راہ سے جس سے تُو گئی تھی واپس آ۔اے اسرائیل کی دوشیزہ اپنے اُن شہروں کی طرف واپس لوٹ ۔اے برگشتہ بیٹی تُو کب تک آوارہ پھرے گی ۔"

"کیا یہ سب میرے لیے ہے ۔"

میرے باپ نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر میرے سر پر طویل بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

ابراھم بہت اچھا لڑکا ہے اُسے محبت دینا۔

میں کھڑی دیکھتی تھی ۔دونوں نے باری باری اُسے لپٹایا اور پیار کیا ۔اُس نے مجھے دیکھا اور میں بہت بہادری سے مسکرائی ۔

میں چلتی تھی پر کیا میں اس کے ساتھ چلتی تھی۔ میں دادی کی اُس بات کو بھی بھول گئی تھی جو اُس نے مجھے یاد کروائی تھی کہ جب ابراھم تمہارا ہاتھ تھامے گا اور تم اُس کے ساتھ قدم اُٹھاؤ گی تو خود کو ربیقہ سمجھنا اور ابراھم کو حضرت اسحاقؑ کا پرتو جاننا کہ جیسے وہ اپنی منگیتر کو کسی دُور دراز علاقے سے لا رہے تھے۔ کہاں کی ربیقہ اور کہاں کے حضرت اسحاقؑ۔

میرے ساتھ میرا ہاتھ تھامے جو چلتا تھا وہ منصور تھا۔

پھر ربّی کے سامنے سب مراحل طے ہوتے گئے۔ آیات مقدسہ کو ورد کرتے ہوئے انہوں نے سات نعمتوں کا ذکر کیا۔ خدا کی عطا کردہ یہ seven blessings جن کا سُننا محفل میں موجود ہر فرد کیلئے ضروری ہے۔ اور پھر جب قانونی عہد نامہ اُونچی آواز میں پڑھا گیا بیوی کے کپڑوں، کھانے اور دیگر ضروریات کی کفالت کا۔ میں نے دیکھا تھا اور پہلی بار ایسا ہوا مجھے ہنسی آئی کہ وہ مسکراتے ہوئے میرے کانوں میں دھیمے سے کہتا تھا۔ بس مجھے اپنے دل پر اور تم پر یقین ہے کہ ہم اچھی زندگی گزاریں گے۔ پھر ہنستے ہوئے اُس نے میرا داہنا ہاتھ پکڑا۔ والہانہ پن اُس کی آنکھوں اور چہرے سے جھلکتا تھا۔ اُس ہاتھ کی انگشت شہادت میں انگوٹھی پہناتے ہوئے جذبات سے بوجھل چہرہ میری بصارتوں میں بھرپور انداز میں آیا اور بلند آواز میں یہ الفاظ میری سماعتوں سے ٹکرائے۔

Behold, you are consecrated to me this ring
according to the law of Moses and Israel

اور جب عزیزوں میں سے دو لوگ انگوٹھی کی گواہی دینے کیلئے آگے بڑھے۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

یا ربّی کو اطمینان دلا دو اِس شادی کی ہر رسم میں دُولہا کا جو انبار بھرا خلوص شامل ہے وہ ہر چھوٹی موٹی کوتاہی کی کمی کو پورا کر دے گا۔

ڈولہا نے اپنے دائیں پاؤں سے شیشے کا گلاس توڑا مگر مہمانوں کے شور شرابے میں مجھ سے سرگوشی کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ بھئی میں کبھی نہیں کہوں گا If I forget Jerusalem۔ مجھے یروشلم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

علامتی طور پر اپنے سر پر ربی کی طرف سے تانے گئے سفید کپڑے کے نیچے میرے ساتھ جُو کر کھڑا ہوا۔ شراب کے گلاس سے گھونٹ بھر کر میری طرف بڑھاتے ہوئے پھر ہنسا اور بولا۔

میں اِس وقت فضول سی ہنگامہ آرائی کے موڈ میں نہیں ورنہ چاہتا ہوں کہ گھونٹ تو سب سے پہلے تم بھرتیں۔

اور سیاہ ہیٹ پہنے بڑے ربی نے اُونچی آواز میں ہمیں ہمارے حقوق بتائے اور مبارک سلامت کے شور میں اُس کے اور میرے عزیز رشتہ دار ملنے کیلئے بڑھے مگر وہ میرا ہاتھ پکڑے مجھے گھسیٹتا کھینچتا وہاں لے آیا تھا جہاں جدّو اور رضالیہ آنٹی بیٹھی تھیں۔ سارے لوگ منہ اُٹھائے حیرت زدہ سے دیکھتے تھے۔ اُس نے جدّو کو جھک کر تعظیمی سلام دیا اور بولا۔

''اِس پنڈال میں میرے لیے سب سے معزز اور محترم آپ ہیں۔ پھر اُن کے رخساروں پر بوسے دیتے اور لیتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

''دُعا دیجئے کہ مجھے آپ کی دُعاؤں کی ضرورت ہے۔''

منصور پہلی بار مجھے محسوس ہوا تھا کہ میرا ہاتھ جس نے تھاما ہوا ہے وہ منصور نہیں ابراھم ایلان ہے۔

باب نمبر: ۱۵

گاڑی ویسٹ یروشلم کی چھوٹی بڑی سڑکوں سے ہوتی چیک پوسٹوں سے گزرتی اپنے دائیں جانب جبل زیتون اور ہیبرو یونیورسٹی Hebreeu university کو پیچھے چھوڑتی شفت روڈ Shufat Road پر چڑھی۔یہ سڑک تھوڑے سے ہیر پھیر سے شفت کیمپ تک جاتی تھی۔

ویسٹ یروشلم کا یہ حصہ اپنی بلندو بالا عمارات، سر سبز درختوں اور کشادہ سڑکوں کی وجہ سے بہت خوبصورت لگتا ہے۔یائل نے گاڑی کے کھلے شیشوں سے باہر دیکھتے ہوئے خود سے کہا تھا۔میرے بچپن میں جب ہم ایما آنٹی کے ہاں آتے تھے تب بھی یہ ایسا ہی تھا۔بس ذرا سادگی تھی۔یروشلم کی قدیم عرب تہذیبی ثقافت کا زیادہ غلبہ تھا اب ذرا ماڈرن ازم Modernism کے تڑکوں نے اسے پُرکشش بنادیا ہے۔کیا یہ حُسن اجنبی جگہوں کے اُن لوگوں کی وجہ سے ہے جنہوں نے صدیوں سے یہاں رہنے والے مکینوں کو نکال باہر پھینک کر اسے نئے رنگوں سے سجادیا ہے۔

یائل کی خود سے گفتگو میں کیسے دکھ عود آیا تھا۔اُف ہم اپنے عشرت کدوں کی بنیادیں انسانی آہوں پر کیسے رکھ دیتے ہیں؟

1930ء کی دہائی میں عین شمس میں بننے والے وسیع وعریض گھروں کے سلسلے میں منصور لوگوں کا بھی ایک گھر ہے جو اس زور زبردستی میں کہیں بچ گیا تھا۔اس دومنزلہ گھر کے دونوں پورشن دو یہودی خاندانوں نے کرایے پر لے رکھے ہیں۔شادی کے بعد جب یائل یروشلم رہنے کیلئے آئی ضالیہ اور ڈاکٹر موسیٰ نے اصرار کیا تھا۔

''ایک حصّہ تمہارے لیے خالی کروائے دیتے ہیں ۔اپنے گھر میں رہو۔مگر نہ ہی وہ مانی اور نہ ہی ابراھم ۔انہوں نے حسینی محلّے والے گھر کی بھی آفر دی ۔اِس پر بھی اصرار کیا کہ وہ تمہارے کام کی جگہ سے قریب ہے ۔جدّ و کا الگ سے فون تھا مگر کرایے پر دیئے گئے اُس گھر کو خالی کروانا اُسے چھا نہ لگا۔دوتو وہ لوگ تھے ۔اتنے بڑے گھر کی ضرورت ہی کیا تھی ۔

گاڑی اب کوئی دم میں کیمپ پر پہنچنے والی تھی۔

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی طرف سے کیمپوں میں ٹائیفائڈ کی ویکسینیشن Vaccination ہو رہی تھی۔راملہ سے بیرون تک کے علاقے کو وہ مانیٹر کر رہی تھی ۔یائل نے گھڑی دیکھی اور ڈرائیور سے ذرا تیز چلنے کو کہا۔

ساڑھے گیارہ بجے جب وہ جریکو کیلئے نکلنے والی تھی ابراھم ایلان کا فون آیا۔

''یائل ضالیہ آنٹی تم سے بات کرنا چاہتی ہیں ۔گھر پر فون کرتی رہیں تم شاید نکل آئی تھیں ۔''

''خیریت ۔تمہیں کچھ بتایا ۔''اُس نے پوچھا تھا۔

''یار آج کل تو تمہیں میری مصروفیات کا علم ہی ہے ۔اس لیے پوچھنے پوچھانے کے چکر میں نہیں پڑا فون کر لو انہیں ۔''

وہ ٹھیک کہتا تھا۔گذشتہ تین ماہ سے وہ بہت مصروف رہا تھا۔1977ء کے انتخابات نے بڑا ہنگامہ مچائے رکھا۔اسرائیلی لیبر پارٹی اور Likud میں ہی اصل مقابلہ تھا۔دونوں پرانی اور بڑی پارٹیاں تھیں۔لیکوڈ نے میدان مار لیا تھا۔ابھی میناحم بیگن نے نئے وزیراعظم کا چارج بھی نہیں لیا تھا اور کینسٹ Knesset نے حلف بھی نہیں اُٹھائے تھے کہ لیکوڈ نے گریٹر اسرائیل کا نعرہ لگا کر مطالبہ بھی کر دیا۔

اُس دن ابراھم نے فون پر پائل سے کہا تھا۔"لو بھئی سُن لو ان دائیں بازو اور گش ایمونیم (ایمان والے)Gush Emunim کے نعرے۔افسوس نہ ان کا کوئی دین نہ ایمان نہ یہ کسی اخلاقی دلیل کو خاطر میں لانے والے۔کس ڈھٹائی سے بیان پر بیان دے رہے ہیں۔اُردن،غزہ کی پٹی اور ویسٹ بنک کا باضابطہ مطالبہ ہوگیا ہے۔اب جو بیچارے رہ گئے ہیں ان کے بوریئے بستر گول کرنے کی باری آ گئی ہے۔"

فون پر ضالیہ اُس کی طبیعت کا پوچھتے ہوئے کہتی تھی۔

"پائل تمہیں تکلیف تو ہوگی پر آجاؤ۔منصور کیلئے دلہن دیکھنے نابلوس چلنا ہے۔دراصل ریڈینا کے پاؤں میں بھی موچ آئی ہوئی ہے۔ہاں جو بھی تمہارا پروگرام ہوگا اُس کی اطلاع دے دینا۔جیفہ ریلوے اسٹیشن پر قاسم یا ابو سالم تمہیں لینے آجائے گا۔"

اُس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے وہیں بیٹھے بیٹھے پروگرام فائنل کر دیا۔"کل تو shavout (فصل کٹائی کا تہوار) کی چھٹی ہے۔پرسوں ٹھیک رہے گا۔شام کو گاڑی کے ٹائمنگ timing سے آپ کو مطلع کروں گی۔"

ابراھم سے دوبارہ بات کئی بار کوشش کے بعد ہوئی۔اُس نے بتایا اور ساتھ میں سیٹ کی ریزرویشن reservation کیلئے بھی کہہ دیا۔

اُس کا آنا افراد خانہ کیلئے گویا بہار کے کسی معطر جھونکے جیسا ہوتا۔اپنے اپنے کمروں میں بند خاموش سب مسکرا اُٹھتے،ہنستے اور قہقہے لگاتے۔اُس نے ماں کے پاؤں کو چیک کیا۔ملٹی جیسک ٹائپ کریم جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی اُس کی مالش کی۔رات کو ریڈینا نے کہا "پائل تیرے ہاتھ میں تو مسیحائی ہے مجھے بہت آرام ہے۔"

اگلے دن جب قاسم کوئی دم میں اُسے لینے کیلئے آیا ہی چاہتا تھا۔ڈیوڈ برآمدے میں بیٹھا ڈیلی Nachrichten (جرمن اخبار) پڑھتا تھا۔پائل اُسے سلام کرتے ہوئے

پاس بیٹھ گئی۔ڈیوڈ نے اخبار سے نظریں اُٹھائیں، بیٹی کو محبت پاش نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''ایلان سے کہو اتنی سفاکی سے نہ لکھے۔دیکھو اُس کے مضمون کا ترجمہ کیا گیا ہے اس میں۔اُس نے اخبار کا درمیانی صفحہ کھول کر یائل کے سامنے کیا۔اتنا سچ لکھنا تو اُس کیلئے مصیبت بن سکتا ہے۔یائل نے پڑھنا شروع کیا۔مغربی کنارے کی پہاڑیوں پر نئی settlements نیچے وادیوں میں رہنے والے فلسطینیوں اور کیمپوں کیلئے اذیت کا باعث بن رہی ہیں۔ناہالن Nahhalin، قتانا Qatanna t، دُرا، ال جانیا ایسی اور بے شمار نئی آبادیوں کی تمام تر گندگی اور غلاظت وادیوں میں آرہی تھی اور ایسا جان بوجھ کر کیا جا رہا تھا۔بہت سی صنعتی یونٹوں کے بارے میں رپورٹ تھی کہ جنہیں اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں میں شفٹ کیا گیا اور کیا جا رہا تھا۔اِن صنعتوں کا فضلہ سٹرس پھلوں کے باغات کو سخت نقصان پہنچا رہا تھا۔کاشت والی زمین خراب ہو رہی تھی اور زیر زمین پانی زہر آلود ہو رہا تھا اور یہ سب انتہائی سفاکانہ اور ذلیلانہ فعل ہیں۔

اُسے ایسے ہی لکھنا چاہیے۔میں ڈاکٹر ہوں۔فلسطینیوں کے بچے بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں اور یہ کمینی اور انسانیت سوز حرکات ہیں۔اتنے میں گیٹ سے باہر گاڑی کا ہارن بجا۔یائل اُٹھی۔باپ کو سلام کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی جب ریڈینا نے تعاقب سے کہا۔

''یائل میں بتائے دیتی ہوں۔ضالیہ کی وہ جو تک چڑھی بھانجی ہے جس کے والدین کویت میں ہوتے ہیں اُسے تو ہرگز دھیان میں نہ لانا اور ہاں اس کی ایک پھپھنی پھدکڑ سی بھتیجی بھی ہے اُسے بھی لفٹ نہ کرانا۔بس لڑکی تو اندھیرے میں بجلی کے قمقمے جیسی ہو اور نیک سیرت بھی ہو۔ضالیہ چوتیوں چالاکیوں والی عورت نہیں۔''

ڈیوڈ ہنسا۔اس سے تو اچھا تھا کہ تم خود چلی جاتیں اور وہ چھڑی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''لو اس مُٹھے پیھے جسے پیر کے ساتھ چلی جاتی۔ اے بے ڈیوڈ تم بھی سٹھیا گئے ہو۔'' لنگڑاتے لنگڑاتے گیٹ پر پہنچ کر اور گاڑی میں بیٹھے قاسم کو دیکھتے ہوئے ایک پیار بھری ڈانٹ دیتے ہوئے بولنا بھی ریڈینا کیلئے بہت ضروری تھا۔

''تم گاڑی سے اُتر کر اندر نہ آنا کہیں ڈوڈا کو سلام نہ کرنا پڑ جائے۔''

''واپسی پر ڈوڈا۔ قاسم نے بائی بائی کے انداز میں ہاتھ لہرایا اور بولا۔ دُلہن دکھوا کی ساری کہانی بمعہ نمک مرچ اپنی ڈوڈا کو آ کر سناؤں گا۔''

ریڈینا نے پیار بھری الوداعی نظریں اُس پر ڈالتے ہوئے بہت آہستگی سے کہا۔

''یہوواضالیہ اور میرے بچے تیری پناہ میں۔''

چلنے سے قبل قاسم نے یائل سے پوچھا تھا۔''اہوتی (عبرانی میں معنی میری بہن میری آپی) کس راستے سے چلنا ہے۔ سمندر کے ساتھ ساتھ حیدرہ Hadera اور نطانیا Natanya کو کراس کرتے یا حیفہ سے نذارتھ اور وہاں سے آگے۔'' ''میرے خیال میں تو ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا زیادہ لطف دے گا مگر ضالیہ آنٹی آپ کا کیا خیال ہے؟'' ''یائل یہی راستہ زیادہ بہتر ہے۔'' قاسم نے ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔''امّی تو آج آپ اپنی بے حد پسندیدہ گلوکارہ کے گانے سُنیں گی۔'' تاحدِ نظر پھیلے ہوئے نیلگوں پانیوں پر سے تیرتی ہواؤں کا کھڑکیوں کے راستے اُن کے چہروں سے ٹکراؤ میں شامی نژاد گلوکارہ اسما حان کی آواز گونجی تھی۔''انا بنت النیل'' کو دوبار سُنا گیا۔ تیسری بار سُننے کی فرمائش یائل کی تھی۔ انتصار اشباب، یا حبیبی تعالی، فرید الطرش اور عبدالوہاب جیسے موسیقاروں کی موسیقی، سماں بندھ گیا تھا۔ ضالیہ گلوکارہ کے متعلق بتاتی تھی۔ گلوکارہ ہی نہیں ادا کارہ بھی تھی۔ کس درجہ خوبصورت تھی۔ 1925ء کے شامی انقلاب کے بعد مصر چلی گئی۔ اصلی نام تو شاید امل الطرش تھا۔ قاہرہ کے اُس وقت کے شہرہ آفاق موسیقار عبدالوہاب نے اسمامان کا نام دیا۔

ہماری اُمّی (ماں) اور ابّی نے اُس کی پہلی پرفارمنس performance جو اُس نے قاہرہ کے اوپیرا ہاؤس Opera House میں دی تھی دیکھی تھی۔

ہماری اُمّی بتایا کرتی تھیں کہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں قاہرہ بڑا خوبصورت، شاندار اور بین الاقوامی شہر تھا۔ ادب اور آرٹ کا قدر دان۔ اُن دنوں ابی کا زیادہ وقت بزنس کی وجہ سے قاہرہ میں گزرتا تھا۔ امّی بتاتی تھیں کہ اُن دنوں قاہرہ میں اس شامی لڑکی کا بڑا چرچا تھا۔ بڑی بڑی مارکیٹوں میں اس کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ پروگرام قاہرہ اوپیرا ہاؤس میں ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی کی پہلی پرفارمنس۔ موسیقی کی دلنواز دھنوں نے سماں باندھا۔ سٹیج پر کھڑے حسن نے لشکارے سارا ہال شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو کی عملی تصویر بنا دم سادھے بیٹھا تھا۔

انا بنت لیل ختم ہوا تو لوگوں کی تالیاں تھیں کہ بجتی چلی گئیں۔ لیلیٰ مراد چھوڑ لوگوں نے اُس کا مقابلہ اُمّ کلثوم سے شروع کر دیا تھا۔

امّی اِس منظر کو بہت بار دہراتی تھیں۔ لگتا تھا جیسے یہ اُن کے ذہن پر نقش ہو گیا ہے۔

کیسا یاس بھرا لہجہ تھا ضالیہ کا جب اُس نے بتایا۔ بہت چھوٹی عمر میں دُنیا سے بھی چلی گئی۔

''ہیں'' پائل نے دُکھ اور حیرت سے گردن موڑ کر پیچھے بیٹھی ضالیہ کو دیکھا تھا۔

گاڑی کا ایکسیڈنٹ Accident مگر ہوا نہیں کروایا گیا۔ یورپی انٹیلی جنس نے الزام لگایا کہ وہ جرمن گستاپو کیلئے جاسوسی کرتی ہے اور نازیوں کا کہنا تھا کہ وہ اتحادیوں کی ایجنٹ ہے۔ اس کی موت پر بھی ہم کتنے دن افسردہ رہے۔ یہ فرید العطرش اس کا بھائی۔ بھائی بھی کمال کا حسین۔ بہن بھائی گویا چاند سورج کی جوڑی تھی۔ ہمارے تو بڑے

آئیڈیل تھے۔پھر وہاں قاسم کی آواز گونجی ۔وہ درویش محمود کی نظم A soldier dreams of white lilies گارہا تھا۔

یائل نے اسے پہلے عربی میں سنا تھا مگر عربی سے زیادہ یہ انگریزی میں خوبصورت لگی۔اور وہ ہنستے ہوئے کہتی تھی۔تمہیں کس نے میڈیکل کرنے کیلئے کہا ہے۔ٹی وی T.V پر ایک بار آجاؤ پھر دیکھنا ہالی وڈ Hollywood تک پہنچ جاؤ گے۔گانے گاتے، سُنتے،گپیں ہانکتے،راستے میں رکتے،کافی پیتے،فلافل کھاتے پتہ بھی نہ چلا اور نابلوس آگیا۔

ماؤنٹ ایبل Mount Ebal اور ماؤنٹ Mount Gerizim کی ڈھلانوں پر بکھرا نابلوس خوبصورت شہر لگا۔ضائیہ اپنے شہر سے محبت کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخ سے بھی مکمل آگاہی رکھتی تھی۔یائل کو جب وہ اس کے ماضی کا چہرہ دکھاتی تھی اُس کے لہجے میں ایک فخر یہ امتیاز کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ہونے والے افسوسناک سلوک پر دکھ اور ملال کی بھی گھلاوٹ تھی۔ارے یہ میرا پیارا سا نابلوس شہر انیسویں صدی کے وسط تک تقریباً تین سو گاؤں اور قصبوں پر مشتمل ایک وسیع و عریض علاقے کا مالک تھا۔حیفہ جیفہ اسی کی تو حدود میں تھے۔رملہ اور ال بیرہ کی پہاڑیاں بھی اسی میں شامل تھیں۔مگر اسے تو شازشوں نے ختم کردیا۔اِس کسان شہر کی زمین کی بڑی بڑی خریداریاں یونانی اور لبنانی عیسائی سورو کس خاندان نے کیں جوانہوں نے صیہونی آباد کاروں کے ہاتھوں مہنگے داموں بیچ کر فلسطین کی تاجر برادریوں کیلئے تباہی کا باعث بنادیں۔یہ روغن زیتون سے بننے والی سوپ فیکٹریوں کا بہت بڑا شہر تھا۔صابن تو اب بھی بنتا ہے مگر صنعتی میدان سُکڑ گیا ہے۔میرے ایک بھائی کی تو کان نامی فیکٹری کا صابن اپنی کوالٹی کے اعتبار سے پورے بحیرہ روم کے خطے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

بازار میں سے گزرتے پرانے شہر کے مینارہ کلاک ٹاور کے پاس وہ یوسف ضیا

کے دوست کے گھر تھوڑی دیر رُکے۔ یونہی رُکنے کا بہانہ تھا۔ گھر کی لڑکیوں پر نظر ڈال لی۔

نابلوس کا پرانا شہر واقعی اپنے اندر ایک تاریخ سمیٹے ہوئے تھا۔ یائل کو اس کی گلیوں بازاروں سے گزرتے ہوئے احساس ہوا تھا۔ اس کی تنگ تنگ گلیاں، ان کے پیچ و خم، مکانات کی بلندیاں جہاں آسمان اُن پر کسی نیلگوں سائبان کی طرح تنا ہوا نظر آتا تھا۔ جب وہ ایسے ہی ایک گھر میں قہوہ پیتے اور گپ شپ کرتی تھیں۔ خاتون خانہ نے کس قدر فخر سے اِن گلیوں کی افادیت کا بتایا تھا۔ ان کے لب و لہجے میں محبت و پیار کا بھرپور رچاؤ تھا جب وہ کہتی تھیں۔

''ارے یہ تنگ و تاریک گلیاں، انہی گلیوں نے ہمارا مان بڑھایا۔ ہماری حفاظت کی۔ ہمارے بچوں، ہمارے گھروں، ہمارے مال و اسباب کی محافظ ثابت ہوئیں۔ انہوں نے تو ماں کی گود کی طرح ہمیں اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ ہماری اِن گلیوں میں جب وہ اسرائیلی فوجی دستے ہلکائے کتوں کی طرح بھاگے تو انہیں سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ وہ کدھر جائیں؟ ٹیڑھی میڑھی بھول بھلیوں میں اُلجھے تو آدھے تو عورتوں اور نوجوان بچوں نے ہی پتھروں، اینٹوں اور گولیوں سے مار ڈالے اور بقیہ مردوں کی بندوقوں کی نذر ہوئے۔ کیا منظر تھا۔ یہاں وہاں اِن کتوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ کانوں کو ہاتھ لگالیا کہ دوبارہ اِن میں نہیں آنا۔ اب ہمیں اکیلے قابو کرنا ہے تبھی تو بیرونی راستوں پر بڑے بڑے گیٹ لگائے ہیں۔''

گھر کی دوسری معمر خاتون نے لعن طعن کی بوچھار میں بتایا۔

''نابلس کے لوگوں نے کمیٹیاں بنائی ہیں۔ امداد باہمی کی بنیادوں پر اِن میں سبھی مسائل شامل ہوتے ہیں۔ ہمارے نوجوان لوگوں اور دیہاڑی دار مزدوروں کو پکڑ کر لے جاتے تھے۔ اُن سے بیگار اور کارخانوں میں کام کرواتے۔ اسرائیل کو اپنی انڈسٹری کیلئے لیبر

کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔اِس کام کیلئے غریب فلسطینیوں کا خون چوسنا سب سے اچھا اور سستا کام ہے۔‘‘

مگراب لوگ متحد ہو رہے ہیں۔

اُسی معمر خاتون نے ضالیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

’’تم یقیناً سیبستا Sebasta اور اقربہ جاؤ گی۔ایک میں تمہارا بھائی اور دوسرے میں تمہاری بہن رہتی ہے۔تمہیں پتہ چلے گا کہ کیسے مضافات کے کسانوں نے خود انحصار معیشت کے پروگرام شروع کر رکھے ہیں۔وہ فصلوں کی کٹائی اور بوائی اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔‘‘

یائل گنگ بیٹھی یہ سب سُنتی اور ان کے حوصلوں کی داد دیتی تھی۔

سیبستا Sebasta نابلوس کے شمال مشرق میں بارہ کلومیٹر پر واقع قدیم ترین جگہ تھی۔یائل تو آنکھیں پھاڑے اِس حُسن کو دیکھتی تھی جو اِن راہوں پر بکھرا پڑا تھا۔پہاڑی ڈھلانوں کے درمیان زیتون کے جھنڈوں، کھجوروں، سنگتروں کے باغوں اور چھوٹے چھوٹے گھروں کی دیواروں کو ڈھانپتی انگوروں کی بیلوں نے ماحول کو کتنا حسین بنا رکھا تھا۔آوائل ستمبر کی سہ پہر کے سورج کی سونا بکھیرتی روشنی میں درختوں کے جھرمٹوں میں گھرے گھر نگینوں کی مانند لشکارے مارتے تھے۔پہاڑی چٹانوں سے پھوٹتے چشموں اور پہاڑی ڈھلانوں پر زینہ در زینہ پھیلے کھیتوں پر فصلوں کا پھیلاؤ جیسے کسی نے کسی بڑے عالیشان محل تک جانے کیلئے سیڑھیوں پر قالین بچھا دیئے ہوں۔

ضالیہ بتاتی تھی چشموں سے پھوٹنے والا یہ پانی کاریزوں کی صورت میں پورے نابلوس شہر کو زندگی دیتا ہے۔مسجدوں کے صحنوں میں بنے حوضوں میں یہ پانی، امیروں کی حویلیوں میں اس کے تالاب، شہر کے صنعتی علاقوں میں یہ استعمال، اناج کی چکیاں اِس پانی

سے چلتی ہیں اور یائل دیکھتی تھی کہ کہیں کہیں دُھند کے باریک نیلے پردوں کی طرح اس نے ماحول کو ڈھانپا ہوا ہے۔

اُف کیا جگہ ہے یہ؟

تبھی شاید یہ سکندر اعظم کو بہت اچھی لگی تھی۔اُس نے اِسے برباد کرنے کی پوری کوشش کی۔اب عصر حاضر کے خود کو سکندر گریٹ The Great سے بھی بڑا سمجھنے والے یہ اسرائیلی نا ہنجار اُسی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔نابلوسی اس قبضے کے خلاف ڈٹے بیٹھے ہیں۔

ضالیہ کے میرے بھائی کا گھر گھر نہیں محل تھا۔اس کا تعمیراتی حُسن قدامت و جدّت کے رنگوں کے ساتھ مرعوب کرتا تھا۔چھوٹے چھوٹے سفید اور سُرخ چھتوں والے ان کے ملازمین کے گھروں کے جھرمٹ،وسیع وعریض لان،زیتون،کھجور،سنگتروں اور خوبانی کے پیڑوں سے سجے پائین باغ۔گھر کیا تھا۔رنگوں میں لشکارے مارتا۔خوشبوؤں میں بسا،ہریالیوں میں تیرتا اور مصنوعی آبشاروں میں بھیگتا آنکھوں کو کسی ارضی جنت کا سا تاثر دیتا تھا۔

صاحب خانہ فیملی سمیت انگلینڈ کا شہری تھا۔اُن کیلئے نابلوس سے انگلینڈ جانا ایسا ہی تھا جیسے منصور فیملی کا حیفہ سے یروشلم آنا جانا۔تین بیٹیاں۔یائل کو درمیانی لڑکی بہت پسند آئی تھی۔تینوں کو جب تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا یائل نے کہا۔''ممی کہتی تھیں لڑکی جگمگاتے قمقمے جیسی ہو۔یہاں قمقمہ نہیں دو سو واٹ کا بلب ہے۔دوسری بات جوانہوں نے چلتے چلتے کہی تھی۔ضالیہ چوتیوں چالاکیوں والی عورت نہیں لڑکی نیک سیرت ہو۔''

ضالیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آرینا بہت محبت اور گھلنے ملنے والی لڑکی ہے۔احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم سے پہلی

بار ملی ہے۔ ساری ایجوکیشن باہر ہوئی اور لگتا ہے جیسے نابلوس کے گورنمنٹ سکول سے پڑھتی رہی ہو۔

قاسم نے فوراً کہا۔"آپ کو فوراً اپنی اوتی (میری آپی) بنالیا۔ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ اوتی آپ صرف میری ہیں۔ یہ حق میں کسی اور کو نہیں دوں گا۔

پائل نے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

اور وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے آرینا کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

ضالیہ کو خوشی ہوئی تھی۔ آرینا ادبی ذوق رکھنے والی لڑکی تھی۔ قاسم نٹ کھٹ سالڑ کا ماں اور پائل کو کھینچ کر اُس کے ذاتی کمرے میں لے گیا۔ کمرہ اُس کے سلجھے ہوئے ذوق کا نمائندہ تھا۔ کتابوں کے شیلف میں انگریزی شاعروں کے ساتھ ساتھ بہترین عرب لکھاری بھی موجود تھے۔ امین ریحانی کا ناول The Book of Khalid وہاں پڑی دیکھ کر ضالیہ نے پوچھا تھا۔ اِسے پڑھا ہے تم نے۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ضالیہ کو یہ ناول بہت پسند تھا۔ بے اختیار ہی اُس نے شیلف سے اُٹھالیا۔ خلیل جبران کی نقاشی سے سجا۔ نئے رجحانات کا عکاس۔

رات اُن کے وسیع وعریض لان میں ہلا غلا بھی ہوا اور گھر کے قدیمی ملازموں سے پائل نے نابلوس کی دوصدی پرانی زیتون کے تیل سے بننے والی صابن کی صنعت جس کا شہرہ بحیرہ روم کے پورے خطّے میں زمانوں سے تھا کی المناک داستان سُنی۔

اِس صنعت کی تکون تاجر، کسان اور بدّو کے ساتھ مثبت ہے۔ بالعموم تاجر امیر عیسائی، یہودی اور کہیں کہیں کوئی مسلمان بھی ہوتا تھا لیکن کسان اور بدو مسلمان ہی تھے۔ یہ جدّی پشتی نظام کاروباری اور دوستانہ تعلق اور رشتوں میں بندھا نابلوسی معاشرتی زندگی میں بڑا اہم تھا۔ تاجر اپنی سوپ فیکٹریوں کی عمارت کے زیرِ زمین ٹینکوں میں کسان کا لایا ہوا تنوں

روغن زیتون انڈیلتا۔صحرائی بدو خزاں کے دنوں میں بریلا جھاڑیوں کے انبار اکٹھے کرتا ،انہیں جلاتا اور پھر بریلا کی راکھ قلوا کی کھیپ اونٹوں پر لاد کر شہر لاتا ۔کاروبار کا ایک سائیکل جسے تباہ کر دیا گیا ۔زمینوں کے مالکوں سے خفیہ خریداریاں جن کی ادائیگی جیوش نیشنل فنڈ سے کی جاتی جس کا سربراہ آرتھر بن تھا۔نتیجتاً لڑائی جھگڑے اور کسانوں کی زمین سے جبراً بے دخلی کے ذلیل کام ہوئے ۔

''ارے بیٹی''ایک گہری آہ ابو یحییٰ کے سینے سے نکلی تھی ۔گیس کے ہنڈولوں کی روشنی میں پائل نے چمکتے آنسو اُس کی آنکھوں میں دیکھے تھے ۔

''میں اپنے اس شہر کی گہما گہمی کی جھلک تمہیں کیسے دکھاؤں؟صبح سویرے کہیں زیتون لانے ،انڈیلنے کا شور،کہیں بیلنے اور کاتنے کیلئے خام کپاس لانے کا شور شرابا،اناج پیسنے والی مشینوں کی آوازیں،سبزیاں،پھل بیچنے کیلئے آنے والوں اور شہر سے شفون کے کپڑوں،برتنوں،چاول،کافی خرید کر لے جانے والوں کی رونقیں ۔

کیا زندگی تھی اور کیا اس کا حُسن تھا؟

اسرائیلی دراصل ہمیں ذلیل و رسوا کرنا چاہتے ہیں ۔اُن کی خواہش ہے ہمیں سر اُٹھا کر جینے کا حق نہیں ملنا چاہیے ۔ہمارا کوئی علاقہ اگر اپنی آزادی کا اعلان کر دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے فوج کے حملے کی دعوت ۔اگر اُن پر سنگ باری کی جائے تو اس کا مطلب قتل و غارت اور اپنے پیاروں کی اموات اور تباہی ۔کیا کیا بتاؤں اور کیا کیا سناؤں ۔

باب نمبر: ۱۶

جہاز نے ڈیوڈ بن گوریاں ایرپورٹ پر جیسے ہی لینڈ کیا پائل نے بہت لمبی سانس بھرتے ہوئے شیشے سے باہر دیکھا تھا۔دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی تل ابیب کے آسمان پر چکریاں کھاتے گرم ہوا کے زوردار تھپیڑے اُس کے چہرے سے ٹکرائے۔ہال وے کی طرف بڑھتے ہوئے اُس کے اندر نے بین کرتی سسکیوں کو بُردباری سے ڈپٹتے ہوئے کہا تھا۔

''واویلا کرنا چھوڑ دو اور بس جان لو کہ یہی تمہارا نصیب تھا۔''

امیگریشن کاؤنٹر تک کے فاصلے میں اگرچہ نئی تبدیلیاں اُس کی توجہ بار بار کھینچتی تھیں تو وہیں راہداریوں سے گزرتے ہوئے بہت سا نیا سجایا گیا یہودی قوم کا علم و ادب ،فلسفہ،آرٹ اور سائنسی علوم پر مشتمل اثاثہ تصویری صورت میں دیکھنے والوں کو متاثر کرتا تھا۔تعمیری حُسن میں بے شمار نئی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔پُروقار اور مرعوب کرتے در و دیوار کے سلسلے بھی دھیان کو قابو کرتے تھے۔ٹرمینل دو کیلئے چلتے چلتے وہ اپنے آپ سے بولی تھی۔

''تاریخ کیسے کیسے چولے بدلتی ہے؟یہ کبھی فلسطینیوں کے مشہور شہر لدّہ Lydda کا مضافات تھا۔انگریزوں نے فوجی مقاصد کیلئے ایرپورٹ بنایا۔جب جانے یا بھاگنے لگے تو یہ لدّہ ایرپورٹ اپنے حواریوں کو دیتے گئے۔دینا بھی کہنا زیادتی ہوگی کہ ان کے فوجی ٹولوں نے باقاعدہ جنگ و جدل کا بازار گرم کرتے ہوئے اِسے قابو کیا تھا۔

اور پھر اسے نام دیا تھا آپریشن ڈینی (Denny)۔شہر پر بھی قابض ہو گئے اور سادہ لوح فلسطینیوں کو کہیں مار بھگایا اور کہیں موت کے گھاٹ اُتارا۔

سیکورٹی کے سارے مراحل اُس کیلئے بہت تکلیف دہ تھے۔شاید یہ پہلے بھی ایسے ہی ہوں اور تب وہ محسوس کرنے کی اِس کیفیت میں نہ ہو۔پر اب تو اپنی بہت ساری نئی تبدیلیوں کے ساتھ زیادہ کڑے اور سخت ہو گئے تھے۔جنگ کے مالیخولیا میں مبتلا ہر لحظہ اندیشوں اور خطرات کی سولی پر چڑھی یہ قوم کیسے مسافروں کو شک وشبہ کی سان پر چڑھاتی، انکوائری کے تکلیف دہ مرحلوں میں گھسیٹتی، تفتیشی نظروں سے ذلیل کرتی اور سکریننگ مشینوں سے بار بار گزارتی کیا پیغام دیتی ہے؟ کہ وہ غاصب ہے اپنی سلامتی اور تحفظ کیلئے بہت محتاط ہے،خوف زدہ ہے۔

کاش تم لوگ اتنی ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ امن کی اہمیت بھی سمجھ لیتے تو شاید یہ زیادہ بہتر ہوتا۔

اندر کہیں سُلگن تھی۔یادوں کا ایک بے ربط سا بہاؤ تھا جس نے اُس کے تھکے ہوئے وجود کو اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔کیبن میں بیٹھی نوعمر لڑکی نے پائل کے چہرے کو بغور دیکھتے اور پاسپورٹ کے صفحات کی یونہی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''امریکہ کس سلسلے میں گئی تھیں؟''

اُسے یہ سوال کتنا بے تکا اور فضول لگا تھا کہ بے اختیار ہی اُس کے اندر نے سٹوپڈ stupid کہنے کے ساتھ ساتھ لڑکی کے سر پر ایک زوردار سی جھانپڑ لگانے کی بھی خواہش کی تھی۔

تاہم اُس نے ہونٹوں کو بند رکھا اور قصداً جواب دینے سے گریز کیا۔بس خاموش تنی کھڑی رہی۔اِن لوگوں کے ساتھ فضول بحث وتکرار کرنا اُس کے نزدیک وقت ضائع کرنا تھا۔

پائل نے پاسپورٹ اُٹھایا اور اپنے اردگرد دیکھا۔ایک نوعمر دلکش سی ماں کا چھ

سات سالہ بیٹا اُس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت سے اپنا آپ چھڑا کر اُس کے آگے آگے بھاگتا جا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔ اُسے اپنے بیٹے شامیش کا بچپن یاد آیا تھا۔

وہ طویل راہداریوں سے گزرتی اور پانچ سالوں میں اس کے تعمیری سٹرکچر میں نئے اور رشاندار رنگوں کے اضافوں کو دیکھتی اور خود سے کہتی "چلو اچھا ہوا۔ اسرائیلی قوم نے اپنے پہلے وزیراعظم اور عظیم رہنما کو خراج پیش کر دیا ہے۔ کرنا چاہیے تھا بھئی آخر اِس قوم کیلئے وہ ہزاروں بے گناہوں کے خون میں اپنے اور اپنی دہشت گرد تنظیموں کے ہاتھ رنگتا اسرائیلیوں کو اس مقام تک لے آیا ہے۔ اتنا حق تو اس کا بنتا ہے۔"

بن گوریاں کبھی تعریفی یا ستائشی انداز میں اُس کے گھر زیر بحث نہیں آیا تھا۔ ابراھم ایلان کو اُس سے شدید نفرت تھی۔ وہ اُس کے باپ کا قاتل تھا۔

وہ پسنجر لاؤنج میں آگئی۔ اُسے لینے کیلئے ڈیوڈ نے آنا تھا۔ اِدھر اُدھر دائیں بائیں دیکھنے کے باوجود باپ کی صورت کہیں دکھائی نہ دی۔ اُس نے خود سے کہا تھا۔

"ڈیڈی تو وقت کے ہمیشہ سے بڑے پابند ہیں۔ کہیں جانا شام کو ہوتا وہ دوپہر سے ہی سارا گھر سر پر اُٹھا لیتے تھے۔ کہیں وقت کی کوئی غلط فہمی نہ ہوگئی ہو۔"

تاہم پسنجر لاؤنج میں رکھے صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اُس نے پاؤں جوتی سے نکال لیے تھے اور سر کو آرام دہ سیٹ پر پھینکتے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ آنکھیں جیسے خود بخود بند ہوگئیں۔ پر ان آنکھوں کا بند ہونا بڑا ظالمانہ تھا۔ کچھ عرصے سے وہ چاہنے لگی تھی کہ اُس کی ذہنی سلیٹ جو واقعاتی اور حادثاتی لکیروں سے اَٹی پڑی ہے۔ گیلی ٹاکی جیسے کسی میکانکی عمل سے اسی طرح صاف ہو جائے کہ کوئی دھبہ کوئی نقطہ اس پر نہ رہے۔ مگر ایسا کہیں ممکن تھا۔ آنکھوں کو چند لمحوں کیلئے ہی بند رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔

دُنیا جہان سے آنے والے لوگوں کی بھانت بھانت کی بولیاں فضا میں گونجتی

تھیں ۔سارا ماحول بس ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق کی عملی تفسیر بنا ہوا تھا۔

اُس نے دھیرے سے جھکی گردن اُوپر اُٹھائی تھی ۔آنکھوں کے کٹوروں میں اب پانی نہیں آتا تھا۔اُسے نفرت ہوگئی تھی اِس پانی سے ۔پر اُن اُداسیوں کا کیا کرتی جو کہیں آنکھوں میں مستقل بسیرا کر بیٹھی تھیں۔

اِس وقت وہ نٹ کھٹ شیطان اور چلبلی سی لڑکی آنکھوں کے سامنے آگئی تھی ۔دو چوٹیاں لہراتی ہر ایک سے پنگے لیتی ۔تب کیا وہ جانتی تھی کہ مستقبل اُس کے لیے کسی ظالم سوتیلی ماں جیسا روپ دھارے ہاتھ میں ہنٹر پکڑے اس پر سانٹے برسانے کیلئے تیار کھڑا ہے کہ کب وہ اُس کے ہتھے چڑھے اور کب وہ اس کے وجود کو خونی لاسوں سے بھر دے ۔اُس کی تمناؤں اور اُس کی آرزوؤں کو بدبختی کے بھاری بوٹوں تلے چیونٹیوں کی طرح مسل ڈالے ۔اُس کی خواہشوں کو تشنہ کام کر دے۔

اپنے سامنے بظاہر مگر جیسے خلاؤں میں گھورتے اور لمبی سی سانس بھرتے ہوئے اُسے خود سے کہا تھا۔

ابراہم ایلان کا زندگی میں آنا بھی بس ہوا کے جھونکے جیسا ہی تھا ۔پل جھپکنے میں گزر جانے والا ایسا جھونکا جس نے گزرتے گزرتے بھی وجود کو چھوتے ہوئے اُسے خوشگوار تازگی کا احساس دیا ہو۔

نظریں تو یونہی شیشوں سے باہر کسی سوچ ،کسی احساس یا خیال کے برعکس بھٹکی تھیں ۔مگر پل بھی نہیں لگا کہ حیفہ کے ساحل یادداشتوں تلے آگئے تھے ۔دونوں عورتیں ضالیہ اور ریڈینا اپنے اپنے بچوں کے ساتھ چھٹی منانے Hashaket Beach پر پہنچی ہوئی تھیں۔

نیلے اور سبز پھولوں سے سجے شارٹ سکرٹ میں شانوں پر دو چوٹیاں لہراتی وہ

لڑکی ریتلے ساحل پر کھڑی کبھی تا حدِ نظر پھیلے سمندر، کبھی سورج کی طلائی کرنوں کو پانیوں سے موج میلہ کرتے اور کبھی پانیوں پر اُترتے پرندوں کی قطاروں اور کبھی تینوں لڑکوں کو ریت پر دھینگا مشتی کرتے دیکھتی تھی۔ ہواؤں کے تیز جُھلار، اُس کے سکرٹ کا دامن اُڑاتے اور سنہری بالوں کی لٹوں کو بار بار اس کے چہرے پر بکھراتے تھے۔

ریت اس کی کمزوری تھی۔ اس سے کھیلتے ہوئے وہ اکتاتی نہیں تھی۔ اب بھی وہ کوئی گھنٹہ بھر سے ریت سے گھر بنانے میں ہلکان ہو رہی تھی۔ یہ گھر کبھی پانی کی لہروں میں بہہ جاتا اور کبھی اپنے ہی بوجھ سے بیٹھ جاتا۔ زچ ہو کر وہ تینوں کے پاس آئی۔ اُس نے منصور کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔

''منصور پتہ نہیں کیا بات ہے؟ میں گھر بناتی ہوں وہ بن نہیں پاتا۔ پلیز میری مدد کرو۔ مجھے گھر بنا کر دو۔''

ایڈمنڈ کو غصہ آیا۔ وہ اُس وقت باکسنگ کر رہے تھے۔ اُس نے بھناتے ہوئے کہا۔

''یہ کتنی بیوقوف ہے۔ بھلا ریت سے بھی کبھی گھر بنتے ہیں۔''

منصور نے نرمی اور پیار سے کہا۔

''پائل میں تمہیں لکڑی کا گھر بنا کر دوں گا۔''

قاسم نے اُس کا بازو کھینچا اور بولا۔ ''پائل آہوتی (میری آپی) آیئے میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔''

اور شیشوں سے باہر دیکھتے ہوئے اُس نے خود کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا گھر تو واقعی ریت سے ہی بنا تھا۔ ابھی تو پلک بھی نہیں جھپکنے پائی تھی کہ ٹوٹ بھی گیا۔''

اضطراری سی کیفیت میں آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔شاید وہ کہیں اُن ہی دنوں میں لوٹ جانے کی متمنی تھی یا چند لمحوں کا فرار چاہتی تھی۔اُسے تو معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ کوئی آ کر اُس کے قریب کھڑا ہو گیا ہے۔اُس کے چہرے پر جمی نگاہوں میں سناٹا ہے۔گرد و پیش میں بکھرے لوگوں کے اژدہام سے بے نیاز وہ اُسے دیکھتا تھا اُسے جو یائل تھی اور جو اُس کی زندگی تھی۔

اِس کیفیت میں چند لمحے ہی گزرنے پائے تھے کہ اُس کی بند آنکھیں پھر کُھل گئی تھیں۔اور وہ اُسے دیکھتی تھی اُسے جو ابھی چند لمحے پہلے اُس کے ساتھ تھا۔اُس کے ماضی اور اُس کے حال کے ہر راستے پر بیٹھا ہوا۔

وہ اُسے دیکھتی رہی۔منصور کا اندر اس کے انداز دید پر کسی زخمی کی طرح تڑپا تھا۔اُن نگاہوں میں سناٹا تھا۔دُکھوں کا دُھواں تھا۔اُس نے جُھک کر اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ہمیشہ کی طرح اُس کے بالوں پر بوسہ دیا اور اسرائیل آنے پر خوش آمدید کہا۔

یائل نے چاہا پوچھے۔آنا تو ڈیڈی نے تھا۔پر لمحات بڑے ظالم تھے۔اُسے جکڑے بیٹھے تھے۔ہونٹ خشک تھے اور اندر بولنے پر مائل نہیں تھا۔

گاڑی کی ڈکی میں سامان قرینے سے رکھنے کے بعد اُس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔یائل نے نشست سنبھالی۔وہ اُسے دیکھتی تھی۔وہ پہلے سے بھی زیادہ شاندار اور دل کش نظر آتا تھا۔اُس کے بالوں میں چاندی سی چھلکتی تھی جو اُسے اور زیادہ پُروقار بناتی تھی۔

وہ آرینا کی عدم موجودگی میں اکثر ہی اُس کے ساتھ ماضی کی پرانی عادت کی طرح فرنٹ سیٹ پر ہی بیٹھتی تھی۔

اور آج وہ ایک مدّت بعد اُسی انداز میں حقیقتاً بیٹھی ہوئی تھی۔

منصور شامیش کے بارے میں پوچھتا تھا۔ اُس کی پڑھائی، اس کی صحت اور یہ کہ اُس کا ارادہ اسرائیل آنے کا ہے یا نہیں۔

اُس کے لہجے کی وہ کھنک کہیں نہیں تھی۔ اُداسی گُھلی بیٹھی ہوئی آواز میں وہ دھیرے دھیرے بولتی اور جواب دیتی رہی۔ باپ کے بارے پوچھنے پر منصور نے کہا۔

''انکل ڈیوڈ ٹھیک نہیں ہیں۔''

پھر اُن کے درمیان یرڈینا اور ڈیوڈ کی صحت کے بارے باتیں تھیں۔ منصور نے ایڈمنڈ کا حال احوال پوچھا تھا۔

ایڈمنڈ بھی تو اس کی کمزوری تھی۔ اُس کا ذکر کرتے ہی پائل کی آنکھیں بے اختیار گیلی ہوگئی تھیں۔ اُس کی لاپرواہیوں اور بے نیازیوں کے قصّے وہ منصور کو کہاں تک بتاتی اور کہاں تک سُناتی۔

حیفہ کیلئے روانہ ہونے سے قبل جب منصور اُسے تل ابیب کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلانے لے جا رہا تھا اور وہ گُم سُم گاڑی کے شیشوں سے باہر بحرِ روم کی تیز ہواؤں میں جُھومتے کھجور کے پتوں، سہ پہر کی دھوپ میں ماند پڑی آسمان کی نیلاہٹوں کے اطراف میں نظر آتے پارکوں، سڑکوں اور کناروں پر گھنے درختوں کی ہریالی اور رنگا رنگ کِھلے پھولوں میں اپنا بچپن تلاش کرتی تھی۔ پھر جیسے اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ منصور سے کہے

''آؤ ساحل پر چلیں اور اس وقت کو کھوجیں جو کہیں کھو گیا ہے۔''

منصور نے گاڑی روک دی تھی اور اب اس کی طرف کا دروازہ کھولے کہتا تھا۔

''پائل تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ میں نے سوچا تم کھانا کھالو۔''

وہ باہر نکلی۔ اپنے سامنے ریسٹورنٹ کو دیکھتی رہی۔ پھر گاڑی میں دوبارہ بیٹھتے

ہوئے بولی۔

''منصور کہیں اور چلتے ہیں۔''

منصور نے خیال نہیں رکھا۔انجانے میں غلطی ہوگئی ۔اِس ریسٹورنٹ میں منصور نے اپنی شادی کی ٹریٹ دی تھی اور اسی میں پائل نے اپنی شادی کی۔

گاڑی کو مین سڑک پر لاتے ہوئے منصور کا جی چاہا تھا وہ کہے۔''پائل تم ساتھ بیٹھی ہو تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔''

''بھوک تو کچھ اتنی ہے نہیں ۔چلتے ہیں اگر محسوس ہوئی تو راستے میں کہیں سے کچھ لے لیں گے۔''اب وہ آرینا اور بچوں کا پوچھتی تھی۔

''ایمان کا قاہرہ سے ہر روز فون آتا ہے۔ہر روز تمہارے بارے میں سوال ہوتا ہے۔''پائل آنٹی کب آرہی ہیں؟ابی اُن سے کہیں وہ آجائیں۔

پہلی بار پائل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔

نیویارک میں ہر تیسرے چوتھے دن مجھے بھی یہی سُننا پڑتا تھا۔

''آخر آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟ پرڈینا سیوتا (نانی)اُداس ہیں۔میری کل اُن سے بات ہوئی تھی۔''

بیٹی کے گھر اُجڑنے پر ڈیوڈ اور ریڈینا اتنے افسردہ اور ملول تھے کہ پائل کو پوز کرنا پڑا تھا۔گھر اس بار کارمیلا سیوتا سے خالی تھا۔وہ مختصر سی علالت کے بعد چل بسی تھی۔

کھانے کی میز پر وہ شامیش کی باتیں اُنہیں سُناتی تھی اور وہ سب ہنستے تھے۔

پائل کیلئے مستقبل میں کیا کرنا ہے؟اس پر منصور نے کسی کو کوئی بات نہیں کرنے دی۔

''آرام سے سوچیں گے۔ابھی طویل ہجر کی اِس پیاس کو بجھنے دیں۔''

شام کی چائے کے بعد منصور چلا گیا۔رات یائل سونے کیلئے لیٹی تو ماضی پھر سامنے تھا۔

پندرہ سال پہلے کے شب روز جب ابراھم ایلان اُس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اور جب وہ ابھی یروشلم میں تھی ۔سب منظر ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے تھے۔

ابراھم واشنگٹن پوسٹ کی نوکری کے بعد گھر آکر بھی جیسے اُس دائرے سے نکل نہ پاتا۔اخبار ہی بنا رہتا۔یہ خبر وہ خبر۔کھانے کے لقموں میں،قہوے کی چسکیوں میں،سگریٹ کے مرغولوں میں۔

یائل ہاتھ جوڑ دیتی۔

''بس کرو اب،چین لے لو۔''

کتنا سچا اور کھرا انسان تھا۔چیتھڑے اُڑانے اور بخیے اُدھیڑنے میں۔نہ کسی کا لحاظ نہ خیال۔نہ سربراہوں کو بخشتا اور نہ کنیسٹ Knesset(اسرائیلی پارلیمنٹ) کو نہ ہیریڈی(بنیاد پرست)، نہ سیکولر، نہ روایتی، نہ اسرائیلی اے اور بی کے خانوں میں بٹے ہوؤں، نہ ہی فلسطینیوں، ان کے مذہبی طبقوں ، نہ ہی ملحقہ عرب ریاستوں کے حکمرانوں کو اور نہ ہی امریکہ اور یورپی ممالک کے بڑے بڑے کارندوں کو۔سب پر سچ کی لاٹھی برساتا رہتا۔اتنی خوبصورت اور جاندار تحریر ہوتی کہ پڑھنے والے کو جکڑ لیتی۔

اسرائیل کے لتے تو بہت لیتا۔

ایک دن بڑے ترنگ میں تھا۔باتیں کرتے کرتے بولا۔

''ارے امریکہ کی محبوبہ ہے یہ۔مشرقِ وسطیٰ میں اُس کے مفادات کی محافظ۔''

دونوں اس وقت ٹی وی روم میں کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے تھے۔جب یائل

نے کہا۔

''اگر کہیں امریکہ اور اس کا دُم چھلا برطانیہ اِسے سبز جھنڈی دکھا دیں۔اس کے سر پر سے شفقت بھرا ہاتھ اُٹھالیں تو ہوش ٹھکانے آ جائیں اس کے۔تکلے کی طرح سیدھا ہو جائے۔''

''ارے نہیں میری جان امریکہ اور برطانیہ کے بااثر ترین یہودیوں کی جان اس میں پھنسی ہوئی ہے۔تبھی تو یہ کسی بدمست سانڈ کی طرح ڈکراتا ہے۔73میں سادات نے سینائی تک دھکیل کر ثابت کردیا کہ یہ کوئی ایسی بھی قابل تسخیر شے نہیں۔اور یہی چیز اِسے انگاروں پر لوٹانے لگی۔''امریکہ جنگ میں نہ کودتا تو معاملہ آر پار ہو جاتا تھا۔

اب ایک چھوٹی سی مثال سُناتا ہوں۔اسی سے اندازہ لگالینا۔اسرائیلی ملٹری آتاشی موردیکائی نے امریکی ایڈمرل تھامس مورر جوائنٹ چیف آف سٹاف سے مطالبہ کیا کہ امریکہ اسرائیل کو فضا سے زمین پر مار کرنے والے Maverick ٹینک شکن میزائل سے آراستہ جنگی جہاز دے۔مورر کا کہنا تھا کہ امریکہ کے پاس ایسے ہوائی جہازوں کا صرف ایک سکواڈرن ہی تو ہے۔یہ کیسے دیا جاسکتا ہے اور اگر یہ بھی دے دیا گیا تو کانگرس نے حشر کردینا ہے۔

ابراھم پل بھر کیلئے رُکا۔سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ نکالا،سُلگایا۔کش بھرا۔دونوں نتھنوں سے دُھواں خارج کرتے ہوئے اُسی نیلگوں غبار میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہاں تو تم جانتی ہو اسرائیلی ملٹری اتاشی کو رنے کیا کہا؟''

''تم اپنی یہ لن ترانیاں بند کرو۔جہازوں کا بندوبست کرو۔کانگرس کو سنبھالنا میرا کام ہے۔''

''اور اُس نے جو کہا تھا وہ پورا کروایا۔بھئی امریکی صدر تو اُن کی جیبوں میں ہیں۔اسرائیلی سفارت خانہ عملاً کانگرس پر حاوی ہے۔جون 1967ء کے بعد سے دو سو بلین ڈالر کی فوجی اور مالی امداد وغیرہ اور ویسٹ بینک کے راستے براہ راست آرہی ہے اب ان بیچاروں کا تیا پانچہ تو ہونا ہی ہے۔''

عرب شاہوں اور جرنیلوں کے جو لتے لیتا اور جس جس انداز میں اُن پر حاشیہ آرائیاں کرتا۔یائیل تو ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی۔

''نرے خسرے۔تم نے لیبیا کا قذافی دیکھا ہے اُس کی گارڈ خواتین،اس کے خیمے،پورا بھانڈ ایکٹر۔ایسے ہی باقی سب ایک سے ایک بڑھ کر عیاش۔''

''ایلان اُن کے پاس تو تیل کا ہتھیار اتنا زہریلا اور نوکیلا ہے کہ اگر اُسے استعمال کریں تو امریکہ اور اس کے حواریوں کے چھکے چھوٹ جائیں۔ یہ لوگ گھٹنے ٹیک دیں''۔

یائیل کے اس سوال پر ایلان نے کہا۔

''ہنی یہ امریکہ ہو اسرائیل یا برطانیہ انکی مثال بڑی شرانت اور عیار قسم کی رنڈیوں جیسی ہے۔جنہوں نے مطلب برآری کیلئے ہر حربہ اپنانا ہے۔مقابل جو لوگ ہیں انکا احوال تمہارے سامنے ہے۔اب اس تیل والے قصے کی تفصیل بھی تمہیں سُنا دوں۔

1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں تیل پیدا کرنے والے ملکوں نے امریکہ سے اصرار کیا تھا کہ وہ اسرائیل کے معاملے میں توازن رکھے اور اسرائیل کو 1967ء کی پوزیشن پر واپس بھیجے۔مگر ہنری کسنجر اسرائیل کا لاڈلا، چہیتا اور اسکا مربی نکسن کو الٹی پٹیاں پڑھاتا رہا۔جونہی اسرائیل کو 220 کروڑ ڈالر کی ہنگامی مدد کا اعلان ہوا۔سعودی عرب نے فوراً امریکہ کو تیل کی فراہمی پر پابندی لگادی۔

لیجیے وخت پڑ گیا۔ایک بھونچال آ گیا۔اب کسنجر ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔امریکی سفارت کاروں کی ایک یلغار ہے جو شاہ فیصل کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے۔کسنجر کا لہجہ بڑا جذباتی تھا جب اُس نے کہا

''ہز ایکسی لینسی میرا جہاز ایندھن نہ ملنے کے باعث رن وے پر ناکارہ کھڑا ہے۔اسے بھرنے کا حکم دیں۔امریکہ آپکا ہمیشہ ممنون رہے گا۔''

شاہ فیصل کی آنکھیں جذبات سے عاری تھیں جب انہوں نے کہا

''مسٹر ہنری میری بھی ایک دیرینہ تمنا ہے کہ میں مسجد اقصیٰ میں دو نفل ادا کر سکوں کیا آپ میری خواہش کی تعمیل کریں گے''۔

اب اس اتنے بڑے سٹینڈ لینے کی سزا میرے خیال میں تمہیں شاید معلوم ہی ہو گی۔1975ء میں سی آئی اے اور برطانیہ کی M16 نے شاہ فیصل کو اُس کے بھتیجے کے ہاتھوں مروا دیا تھا۔

یائل لمبی سانس بھرتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

مسکراہٹ ایلان کے ہونٹوں کا ضروری جُز تھی۔

ہنستا کھلکھلاتا شور مچاتا گیٹ میں قدم دھرتے ہی جان لیتا کہ ٹی وی بند ہے۔اپنی کراری آواز کے فُل والیوم Full volume سے کہتا۔

''ارے بھئی اتنا سناٹا کیوں ہے؟ٹی وی بھی نہیں بول رہا ہے۔''

یائل اگر گھر میں ہوتی تو اُس کی پہلی آواز پر ہی سامنے آ جاتی اور ہنستے ہوئے کہتی۔

تمہارے ہوتے ہوئے ٹی وی کی ضرورت ہے بھلا۔

بازو لمبے تھے اور ہاتھ بھی خاصے چوڑے۔پل بھر میں ٹی وی آن ہو جاتا۔اگر

پروگرام کوئی پُرلطف ہوتا تو آواز خاصی اُونچی کرنے کے بعد چینج change کیلئے جاتا۔اگر خبروں یا کسی حادثاتی واقعہ کی رپورٹنگ reporting ہورہی ہوتی تب آواز تھوڑی مدھم کردیتا۔

یائل خادمہ کے ساتھ میز سیٹ کرتے ہوئے فوراً ٹی وی بند کردیتی۔

''حد ہوگئی ہے ابراھم۔میں تھکی ہوئی ہوں۔سکون سے کھانا کھانا ہے پھر آرام کرنا ہے۔''

''سویٹ ہنی یائل میں وقت کی مچھلی ہوں جسے ہمہ وقت خبروں کے پانی میں رہنا ہے۔نہیں رہے گی تو مر جائے گی۔''

اُسے غصّہ چڑھتا۔پر تھوڑی ہی دیر میں یہ زائل ہوجاتا۔بہت اچھا انسان تھا۔ہمدرد اور محبت میں گندھا ہوا۔

ابو بقاع یروشلم میں منصور کا ایک بڑا اور خوبصورت گھر واگزار کروانے میں اُس کا بڑا ہاتھ تھا۔اُسے جب معلوم ہوا تھا اُس نے افسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ان کی بھی ذلالت کی انتہا ہوگئی ہے۔قانون انہوں نے گھر کی لونڈی بنالیا ہے۔1949ء میں اقوام متحدہ کی رکنیت لیتے وقت ان کا وعدہ تھا کہ فلسطینی پناہ گزین اپنے گھروں کو واپس آسکیں گے اور پچاس میں قانون بن گیا کہ عربوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد پر یہودیوں کا حق ہوگا۔واپسی کے قانون میں دُنیا بھر کے یہودیوں کو اسرائیل آنے کا حق دیا گیا پر خیمہ بستیوں میں دھکیلے جانے والوں سے اُن کی واپسی کا حق چھین لیا گیا۔اب ان کے خدائے واحد کو جلال آئے گا تو ہی ان کا کچھ بنے گا۔''

گو اس گھر کی واگذاری میں تھوڑا سا ہاتھ منصور کے یروشلم کے معزز و معتبر خالدی خاندان سے تعلق اور با اثر یہودیوں سے گہری دوستیوں یاریوں کا بھی تھا۔تاہم ابراھم کی

کاوشیں اپنی جگہ بہت اہم تھیں۔ جس دن کاغذات پر دستخط ہوئے۔ شام کو اُس نے اس کی تفصیل سے پائل کو آگاہ کیا۔

پائل نے کہا تھا۔ ''ضالیہ آنٹی کو بتاؤ۔ چلو تھوڑی سی خوش ہو جائیں گی۔ اتنا قدیمی گھر جس کے ہر مسام میں جدی یوسف کے والد کا پسینہ تھا۔''

پائل کی اِس بات پر اُس نے تعجب سے کہا تھا۔

''پاگل ہوگئی ہو پائل۔ کوئی احسان کیا ہے اُن پر۔ ہمیں تو اِس زیادتی پر معافی مانگنی چاہیے۔ یہ تو اُن کا حق ہے جسے غاصبوں نے اُن سے چھین لیا تھا۔ میرے بس میں ہو تو کیمپوں میں بیٹھے ہر فلسطینی کو اُس کا گھر لوٹا دوں۔''

یہ اُس کا بڑا اپن تھا اور اسی طرح کے کئی بڑے پنوں نے اس کی ذات کو پائل کیلئے پسندیدہ بنا دیا تھا۔

منصور سے محبت اپنی جگہ تھی پر پائل کو ابراھم کی قربت تسکین دینے لگی تھی۔ اس میں پسندیدگی کا عنصر بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ رات کے کھانے پر دونوں کے درمیان بہت تفصیلی باتیں ہوتیں۔ وہ اُسے راملہ کے اسپتالوں میں زخمیوں کے بارے میں بتاتی۔ ان کی دربدری کی کہانیاں سُناتی جواباً سُنتی۔

ابھی انہیں اور رگڑے لگنے ہیں۔ قیادت نہیں۔ یاسر عرفات کیا کرسکتا ہے؟ اُردن کے شہر کرامہ کیمپ میں بے شک فدائین نے بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اسرائیلی ٹینک توپیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

پائل نے گہرے دُکھ سے لمبی سانس بھری تھی۔

کرامہ شہر اُس کے تصور میں اُبھر آیا تھا۔ اُردن کے اِس شہر کے اختتام پر الفتح کا ہیڈ کواٹر اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ پتھریلی کچی زمین پر بنے خیموں کی بستی جس کی کچی

گلیوں کے وسط میں بہتی گندے پانی کی نالیوں سے خود کو بچاتی دائیں بائیں جھولتی فدائیوں کے مرکز تک پہنچی تھی جہاں وہ یاسر عرفات سے ملی تھی جس نے راملہ سے نکل یہاں ڈیرے جمائے تھے اور یہیں اُس کے فدائیوں نے اسرائیل کے ٹینک توپوں کے منہ موڑ دیئے تھے۔ایک چھوٹی سی لڑائی ایک چھوٹی سی فتح مورال moral کی بلندی کیلئے مہمیز ثابت ہوئی تھی مگر تدبر اور فراست کے تقاضے کچھ تھے۔اُردن کی گردن مروڑنے کی ضرورت۔

وہ ابھی اسرائیل میں ہی تھی کہ پی ایل او(Palestian Libration Organisation)اور اُردنی فوجوں میں با قاعدہ جنگ کا طبل بج گیا تھا۔ٹینک توپیں مدّ مقابل تھے۔مسلمان کا گلا مسلمان کاٹ رہا تھا۔شام،اُردن کا تخم مارنے کا خواہاں تھا۔یاسر عرفات اُردن پر قابض ہو کر اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کا متمنی تھا۔اسرائیل سبھوں کو باری باری ہڑپ کرنے کا حامی تھا۔اس وقت اُردن کی مدد جاری تھی امریکہ اور اسرائیل دونوں کی طرف سے۔

اب وہ ابراھم کو یہ سب کہتے سُنتی تھی۔

وقت اور مصلحت کی فراست یاسر عرفات میں نہیں ہے۔اُردن ایجنٹ ہے برطانیہ اور امریکہ کا۔آخر اُس سے اُلجھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ شامی حکومت بھی شہہ دے رہی تھی کہ موقع مت گنواؤ۔اُردن پر قبضہ کرو۔اب 3000 فلسطینی مروا کر لبنان منتقل ہونا پڑا ہے۔ہزار منتوں طرلوں سے کہیں لبنان میں پاؤں دھرنے کی جگہ ملی۔وہ بھی لبنان کی اکثر جماعتیں رضامند نہیں۔یو این او(U.N.O)نے بڑے بڑے کیمپ صابرہ اور شتیلہ بنا دیئے ہیں۔ایک دن ان پر بھی بمباری ہوگی اور اس آگ میں خواب،آرزو ہیں خواہشیں سب جل کر راکھ ہو جائیں گی۔

''میری ایک دوست کا انتہائی ذہین بچہ اُردن کی انٹیلی جنس نے مروا دیا تھا کہ وہ

کالج میں گولڈا میئر کے ساتھ شاہ کی شازش پر بے باکی سے بولا تھا۔"

یائل کی اِس بات پر اُس نے کہا۔

''طاقت اور اقتدار کسی اخلاقیات کو نہیں مانتی۔''

میناحم بیگن کا انٹرویو لینا اُس کی صحافتی زندگی کے چند اہم واقعات میں سے ایک تھا۔اُس کے سوالات بہت نوکیلے ہی نہ تھے بلکہ بال کی کھال اُتارتے تھے۔بیگن بھی ایک کائیاں تھا۔اُس نے پہلے سوال پر ہی تُرش روئی سے کہا۔

''آج نہیں میں تو 1947ء سے دہائی دے رہا ہوں کہ یہ ہمارا وطن ہے اور یہ نا قابلِ تقسیم ہے۔اِسے ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور اِن ٹکڑوں کو قائم رکھنا مجرمانہ فعل ہے۔میری تنظیم ارگن کا تو نعرہ ہی ایک ہے۔اُردن کے دونوں طرف۔''

''دُعائیں دیں امریکی صدر ٹرومین کو کہ جس نے عربوں کے سینے میں خنجر گھونپا۔جس نے فلسطین صیہونیوں کے حوالے کیا۔جس نے اقوام متحدہ کی یہ تقسیم جنرل اسمبلی سے دباؤ کے تحت منظور کروائی۔وگرنہ آپ کی کاوشیں،آپ کی دُہائیاں اور آپ کے نعرے اور اعلان سب کہیں منہ چھپائے ماتم کررہے ہوتے۔''

بیگن نے بڑی تیکھی نظروں سے اُسے دیکھا۔

ٹرومین کو کریڈٹ دیں اور اپنی جدوجہد کو صفر کہیں۔کیا بات ہے تم جیسے کم عقل صحافی کی۔

دیر یاسین کا واقعہ زیر بحث لاتے ہوئے اُس کا سوال اُس بربریت اور ظلم پر مبنی منصوبے کے بارے تھا جسے ڈیوڈ بن گوریاں اور بیگن کی حمایت حاصل تھی۔

''ذرا یہ تو بتایئے بن گوریاں نے تو فوراً اپنی اور اپنی حکومت کی بریت کا اعلان کیا تھا اور ساتھ ہی دہشت گرد ٹولوں کی خدمت میں بیان بھی داغ دیا تھا مگر آپ کو یہ بھی توفیق

نصیب نہ ہوئی۔ آپ کے ہاں تو افسوس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔"

جواب آیا تھا۔ اُن کو سزائیں دی گئیں۔

ابراھم نے خفیف سا مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل۔ ابھی تو مقتولین کا خون بہہ رہا تھا کہ جب حگانا (Haggana)، لیہی (Lehi)، ایتزیل (Etzel) ٹولیوں کے دہشت گرد اسرائیلیوں کی باقاعدہ فوج بڑے میں بڑے عہدوں پر فائز ہو رہے تھے اور انعام و اکرام سے نوازے جا رہے تھے۔

بیگن کے انکار پر اُس نے اُس کے خط کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی تحریر تو ریکارڈ پر ہے۔ نہ صرف مبارکباد بلکہ یہ لکھا جانا کہ آفرین ہے تم لوگوں پر۔ یہودی قوم نازاں ہے تمہارے کارناموں پر۔ اسرائیل کی تاریخ بنانے والے تمہی لوگ ہو۔ فیلڈ کمانڈر جوڈاہ لاپی ڈوٹ پر نوازشوں کی بھی بھرمار ہوئی اور روسی یہودیوں کی ہجرت کو بھی ممکن بنانے کیلئے کوششیں ہوئیں۔"

دیر یاسین دراصل فلسطینیوں کا ہولوکاسٹ ہے۔ اِسے تو ماننا پڑے گا آپ کو۔

وہ بیگن کو زچ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

اب قبیہ میں کیا ہوا تھا؟ یہاں شیرون کے دستوں نے گھروں اور اُن گھروں میں لوگوں کو بارود سے اُڑا دیا۔ جب بات باہر نکلی تو بن گوریاں نے عربوں پر الزام لگایا۔ جب اعتراضات شدید ہوئے تو عرب نژاد یہودی زد میں لائے گئے۔ بن گوریان نے کہا ان یہودیوں کی ذہنیت کسی طرح بھی عربوں سے مختلف نہیں۔ یہی ناہنجار ہیں مگر پارلیمنٹ کے کیمونسٹ ارکان نے تفصیلات شائع کر دی تھیں۔" آپ انکار کرتے ہیں اس سے۔

بیگن کا چہرہ دھواں سا ہو رہا تھا۔

"کوئی اور سوال کرو۔"

امریکہ نے اسرائیل کے ساتھ اپنا نیا فوجی اتحاد وقتی طور پر ختم کردیا ہے۔امریکہ آپ کا سب سے بڑا مربی اور خیر خواہ۔آخر ایسا کیوں ہوا؟

بیگن کی نشتر زنی بہت تیز اور شدید تھی۔امریکہ کی کرتوتوں اور اُس کے کچے چٹھوں کا احوال میں نے سیموئل لیوئس (امریکی سفیر) کو اپنے گھر بُلا کر اُس کے گوش گزار کردیا تھا۔میں نے کہا تھا کہ تم لوگوں کی تو وہ مثال ہے چھاج تو بولے سو بولے چھلنی بھی بولے جس میں بہتر بہتر سو چھید۔ہمیں شہری ہلاکتوں پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہو اور اپنی کرتوتوں پر پردے ڈالتے ہو۔ہمیں کیا علم نہیں۔دوسری جنگ عظیم اور ویت نام میں کیا کیا ہوا؟ کیا یہ میں بتاؤں کہ شہریوں کو کیسے گاجر مولیوں کی طرح کاٹا گیا۔

آپ کے محاورے Body count کو ہم سے زیادہ بھلا کون جانتا ہے۔آپ پلیز کان کھول کر سُن لیں۔ہم کوئی امریکہ کی باجگذار ریاست نہیں ہیں۔ہم تیرہ چودہ سال کے لونڈے نہیں ہیں۔جنہیں سرزنش کرنے کیلئے ان کے ہاتھوں کی پوروں پر ضربیں لگائی جائیں۔بنی اسرائیل نے 1948ء میں جنم نہیں لیا۔3700 سو سال پُرانی تاریخ کا مالک ہے۔یہ تب سے اب تک زندہ ہے بغیر امریکہ کی دوستی اور امداد کے۔تسلی رکھیں ہم مزید تین ہزار سات سو سال بغیر کسی سہارے اور مدد کے جی سکتے ہیں۔''

ابراھم نے اس پر مزید سوالات کرنے چاہے مگر بیگن نے اِس پر مزید گفتگو کا دروازہ بند کردیا تھا۔

پورے تین گھنٹے کے اِس انٹرویو نے بیگن کو کنگھال ڈالا تھا۔

بیگن کا گھر جس پہاڑی پر تھا وہ عین دیرویاسین کے سامنے تھی۔اُس کے ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں۔گملوں میں ارغوانی پھول کھلے ہوئے تھے۔بوگن ویلیا کی بیلیں بہت دُور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔سامنے صنوبر کے درختوں کی قطاریں تھیں اور

زیتون کے پیڑ سورج کی ممتا جیسی دھوپ میں ہنستے تھے۔انگوروں کی بیلوں سے ڈھکی دیواریں، انجیر اور خوبانی کے پیڑوں سے بھرا، پھولوں پھلوں سے سجا یہ گھر اور اس گھر کا مکین ایک بہت بڑا انسان۔

سوال پھر بڑا زہریلا تھا۔چار سو بکھرے عرب دیہاتوں اور لاکھوں لوگوں کو بے گھر کرنے میں آپ کا کردار بڑا نمایاں ہے۔کسی وقت یونہی کوئی نظر کچھ یاد دلاتی ہو۔بچے کو چھاتی سے چمٹائے بھاگتی ماں، کسی بوڑھے، کسی بچے پر چلتی گولیاں، زمین پر پڑی سسکتی لاشیں، کہیں کوئی تصویر دماغ کے کینوس میں رہ گئی ہو۔''

بڑی مکروہ اور عیاری میں لپٹی مسکراہٹ بیگن کے ہونٹوں اور آنکھوں میں تیری تھی۔

''تم نے بہت تاریخ پڑھی ہے۔ایسی سوچ بڑے لوگوں اور حکمرانوں کو زیب نہیں دیتیں۔یہ چھوٹے لوگوں کی سوچ ہے۔''

''پر تاریخ کا کوڑا بھی زبردست ہے۔برسنے پر آتا ہے تو سارے پیچ کس ڈھیلے کر دیتا ہے۔یہ بھی کہیں یاد ہے یا بھولے بیٹھے ہیں۔''

''میں ایسی کسی فضول بات کو یاد نہیں رکھتا۔میرے لیے سب سے اہم بات، سب سے بڑا اعزاز بس یہی ہے کہ میں تاریخ میں صرف اپنے اِس اہم کارنامے کی وجہ سے زندہ رہ جاؤں کہ اسرائیلی سرزمین کی حدوں کو ابد تک قائم کرنے والا انسان میناحم بیگن تھا۔''

''یروشلم پوسٹ میں وہ چھپ نہیں سکا۔ نیویارک کے ویکلی میگزین Weekly Magazine میں فرضی نام سے چھپ گیا اور ساتھ ہی اُسے امریکہ جانے کے آرڈرز orders مل گئے۔یائل اُمید سے تھی۔یرڈینا کی خواہش تھی کہ بچہ

یہاں ہومگر ابراھم نے کہا۔

''بچہ ہونے میں تو ابھی کافی ماہ ہیں۔اتنے ماہ یہاں تو نہیں رہا جا سکتا۔نوکری کا معاملہ ہے۔

منصور کی شادی اُسی ماہ کے اختتام پر ہو رہی تھی۔اُس میں شریک ہونے اور آخری ہفتہ اُن لوگوں کے ساتھ گزارنے کیلئے وہ چند دن بعد حیفہ جا رہے تھے۔

''اور یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ جب وہ ہفتے بعد ایک شام گھر میں داخل ہوئے۔ کارمیلا برآمدے میں بیٹھی تالمود پڑھتی تھی۔''ابراھم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے کارمیلا سیوتا (دادی) مت پڑھا کریں اسے۔بڑی گمراہ کرنے والی کتاب ہے۔عورت کی تو بڑی تذلیل ہے اس میں۔غلاظت سے بھری ہوئی بوری کہا ہے عورت کو۔''

کارمیلا کے ماتھے پر ایک نہیں، دو نہیں، پانچ چھوٹی بڑی شکنیں نمودار ہوئیں۔

یائل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آپ تو میرے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔سُن لیا ہے نا آپ نے۔''

ابراھم ایلان نے اِس بار ذرا رسان سے کہا۔

کارمیلا سیوتا (عبرانی میں دادی) ''مجھے لگتا ہے کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ؟ کہیے میں نے اِسے بہت تفصیل سے پڑھا ہے۔میں آپ کے ہر اعتراض کا جواب دوں گا۔''

کارمیلا سیوتا تو بس گھٹ کر رہ گئیں۔یائل کا شوہر نہ ہوتا تو جی بھر کر سُناتیں اُسے۔خوب بے عزتی کرتیں پر ضبط کرنے والی بات تھی۔تاہم اتنا کہنے سے باز نہ رہ سکیں۔

''ایلان تم کیسے لکھاری اور دانشور ہو؟ اتنی سی بات نہیں جانتے کہ انسان اپنے

یقین اور عقیدے کو دلائل کی کسوٹی پر نہیں پرکھتا۔ بس اس کا اعتقاد ہے۔ یہ اندھا اعتقاد ہی اُسے مطمئن رکھتا ہے جہاں وہ دلائل کے چکر میں پڑا وہ پریشان ہوا اور اُلجھا۔''

''ابراھم ایلان نے بغور کارمیلا سویتا کو دیکھا اور کہا تھا۔

''کارمیلا سیوتا بات تو آپ کی بہت پتے کی ہے۔ آپ کی دانشوری کا تو میں قائل ہو گیا ہوں۔ چلیے مجھ سے غلطی ہوئی۔ معافی دیجیے۔''

منصور کی شادی میں پائل کو احساس ہوا تھا کہ اُس کے چھوٹے سے دل کا صحرا اب پھیل کر جیسے ایک نخلستان بن گیا ہے۔ خلوص، ایثار اور محبت کے پھولوں کی خوشبوؤں سے مہکتا۔ لاکھ اُس نے راستہ بدل لیا تھا تو کیا دل کے ایک گوشے پر منصور تو دوسرے پر ابراھم ایلان قابض ہو چکا تھا۔

منصور سفید لباس، کمر کے گرد تلوار کی پیٹی باندھے سر پر سُرخ و سفید کفیہ پہنے کس قدر خوبصورت لگ رہا تھا۔ اُس نے بھاگ کر رضالیہ سے جو کسی کام میں پھنسی ہوئی تھی کہا تھا۔

''سب کام چھوڑیں اور پہلے منصور کی نظر اُتاریں۔''

ابراھم ایلان نے اِس شادی میں وہی کردار ادا کیا تھا جو اِس گھر کے اچھے داماد کا ہو سکتا تھا۔

فوراً بعد ہی پائل امریکہ چلی گئی۔

باب نمبر: ۱۷

درمیانی وقت کچھ اتنا زیادہ تو نہیں تھا یہی کوئی ڈھائی تین سال کا ہوگا مگر یروشلم کی تو کایا کلپ ہوگئی تھی۔ چیک پوسٹیں تو خیر پہلے بھی تھیں پر اب تو کھمبیوں کی طرح اُگ آئی تھیں۔ بیریئر گیٹس Barrier Gates لگ گئے تھے۔ آبزرویشن ٹاورز Observation Towers میں بندوقیں تانے فوجی بیٹھے تھے۔ جابجا روڈ گیٹ رواں ٹریفک میں حائل ہو رہے تھے۔ ہر جگہ شناخت اور کاغذات دکھانے کا مرحلہ۔

ڈرائیور سے تو خیر بڑی حماقت سرزد ہوئی تھی مگر تھوڑی سی بیوقوفی آرینا نے بھی کی کہ تل ابیب جانے کیلئے جب ابوشعیب نکل رہا تھا۔ سودے سلف کی ایک لسٹ اُسے تھما دی یہ جانتے ہوئے بھی کہ پچاس سالہ یہ بوڑھا ڈرائیور جس کی زندگی کا ایک حصّہ پرانے یروشلم میں گزرا ہے۔ جس کی یاری دوستیاں اور جذباتی وابستگیاں مسلم حصّے کے لوگوں اور جگہوں سے ہی نہیں بلکہ یہ یہودی، عیسائی اور آرمینائی باڑوں سے بھی ذہنی طور پر جڑا ہوا ہے۔ اُس کوارٹرز (حصّے) کے یارانے اور محبتیں بلا امتیاز ہر مذہب و نسل کے اپنے ہم پیشہ و ہم مرتبہ لوگوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔

آرینا سے بھلا یہ بات کب چُھپی ہوئی تھی کہ پودینے کی ایک گٹھی لانے کیلئے بھی اُس کی ترجیح ہمیشہ پرانے شہر کے بازار ہوتے ہیں۔ بلا سے پانچ چھ کوس کا راستہ پیڈلوں سے مارو ماری کرنے میں صرف ہو۔ اُسے قطعی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

گھر کی قریبی مارکیٹ سے سبزی لانے کیلئے اگر آرینا مصر ہے تو اُس کے پاس بھی ڈھیروں ڈھیر دلائل ہیں۔ پُرانے شہر کی سبزی کا تازہ ہونا، سستی ہونا، راملہ (رام اللہ)

کے خاص کھیتوں کی پیداوار جوسلیمان سٹریٹ کے اختتام پر عیسائی کواٹر Quarter(حصے) میں ہولی سپلچر Holy Sepulcher چرچ سے ذرا فاصلے پر۔جہاں بوڑھی عیسائی اور فلسطینی عورتیں چوری چھپے سلاد اور سبزیوں کے پٹارے کھولے بیٹھی ہوتی ہیں کہ وہاں اجازت نہیں ہے۔

وہ اپنی یاوہ گوئیوں والی عادت کے باوجود آرینا کو کٹہرے میں لا کھڑا کرتا۔

''ارے آپ انصاف سے بتایئے کہ ان کے ذائقے کا کوئی مقابلہ ہے اِن کھادوں والی سبزیوں سے۔''

آرینا جب زچ ہوکر کہتی۔

''ذائقہ گیا بھاڑ میں۔مجھے تمہاری تکلیف کا احساس ہے۔اتنی دُور پینڈے مارتے جاتے ہو۔دس منٹ کا کام دو گھنٹوں میں ہوتا ہے۔''

''اب آئندہ دیری نہیں ہوگی۔بس یوں گیا اور یوں آیا۔''

مگر یہ دیری ضرور ہوتی۔اُس کیلئے تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ سارے میں گھومے پھرے نہ اور واپس آکر اُس کی رپوٹیں نمک مرچ مسالوں کے ساتھ آرینا یا ضالیہ بی بی اگر وہ حیفہ سے یہاں آئی ہوئی ہیں نہ سُنائے۔

جن دنوں حیفہ (یافا) گیٹ کے جنوب میں Zion گیٹ اور اس کے شمال میں ینو گیٹ کے درمیانی حصے تک اسرائیلی سٹی گورنمنٹ اس کے بیرونی قدیمی تاریخی طرز تعمیر کے حُسن کو قائم رکھتے ہوئے ایک بہت بڑی مارکیٹ اور اندرونی حصّوں میں تبدیلیاں کر رہی تھی۔وہ دُکھی ہوکر آرینا سے کہتا۔

انہوں نے یہودی اور عیسائی کواٹرز میں اُن سب بوسیدہ اور تنگ وتاریک گھروں کر گرادیا ہے۔گلیاں کشادہ کرر ہے ہیں۔گھروں کو چھوٹا اور خوبصورت بنانے کے ساتھ

ساتھ جگہ جگہ پارک بھی بنا رہے ہیں۔انہیں فواروں اور درختوں سے سجا رہے ہیں مگر وہ مسلم کوارٹر کی طرف کبھی توجہ نہیں کریں گے۔ان کے گھر کتنے پرانے کتنے بوسیدہ اور خراب ہیں؟ وہ انہیں نئے بنانے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔حالانکہ اُن میں رہنے والے مسلمان اب اسرائیلی شہری ہیں۔مگر انہیں وہ حقوق حاصل نہیں۔

مسلمانوں کے حصّے میں کتنی بدنظمی نظر آتی ہے؟ گدھا گاڑیاں، دھکم پیل، اُونچی اُونچی آوازیں، فرش پر بکتا سامان، بدنظمی، ہڑبونگ اور غربت۔

''میرے اللہ مسلمانوں کی حالت کب بدلے گی؟''

اور آرینا دُکھ سے سوچتی۔

''یہ سادہ لوح انسان جسے ہم جاہل سمجھتے ہیں۔اس کا اندر ہماری ہی طرح کیسے دُکھ سے بھرا ہوا ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم مفتوح قوم ہیں تقابلی جائزے لیتا ہے اور مغموم ہوتا ہے۔

''اللہ آرینا نے آسمان کے اُس ٹکڑے پر جو اُس کی عقبی انگنائی پر سایہ کیے کھڑا تھا خالی اور افسردہ نگاہیں دوڑاتے ہوئے خود سے یہ سب کہا تھا۔

نظار قبانی کیسے آرینا کے لبوں پر آ گیا تھا۔

My grieved country

In a flash

You changed me from a poet, who wrote love poems

To a poet who writes with a knife.

پچاس سالہ ابوشعیب جو اپنے والدین سے Zion Gate کو باب النبی کہتے سُنتے بڑا ہوا تھا۔جس کی زبان پر جیفہ Jaffa گیٹ کی بجائے باب الخلیل آتا اور رجونیو گیٹ

کو باب حمید کہتا۔ دمشق گیٹ کو اکثر باب العمود کے نام سے یاد کرتا۔ اب ایسے بندے کو جو لڑکیوں کو لینے ڈیوڈ بن گوریاں ایر پورٹ تل ابیب جا رہا تھا کے ہاتھوں میں لسٹ تھمانا حماقت ہی تھی نا۔

اور ظاہر تھا کہ اُسے تو سیدھے گھر جانے کی بجائے پرانے شہر کی طرف چل پڑنا تھا۔ جہاں یہ سارے سیاپے زیادہ شدومد سے تھے۔ وقت بھی صبح کا تھا کہ جب فلسطینی مزدور اپنے گھروں سے شہر کام کیلئے آتے۔ ٹریفک رُکی ہوئی تھی۔ تلاشی جاری تھی۔ گاڑیوں کو روک روک کر پوچھ پڑتال ہو رہی تھی۔

تانبے کی طرح ایمان کا چہرہ پکتا جا رہا تھا۔ ہر لمحہ جیسے اس پر کوڑے برساتا گزرتا تھا۔

''اُف اتنا ظلم۔ مرجانا چاہیے ہمیں تو۔ ذلالت کی انتہا ہے۔''

پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں سے وہ جلنے کڑھنے اور اپنا خون آپ پینے میں اُلجھی ہوئی تھی۔

ڈیوڈ بن گوریاں ایر پورٹ سے یروشلم آنے تک راستے کے منظروں میں بکھری دستِ قدرت کی کاریگری کو اُس کی نظروں نے ضرور سراہا۔ سورج کی روپہلی کرنوں میں چمکتے پستہ قامت پہاڑ جو مخروطی صورت پھیلے ہوئے دل کشی کا تاثر اُبھارتے تھے۔ کشادہ وادیاں ہریالیوں کے درختوں میں بستی جنت کے پھولوں اور درختوں کو اپنی دھرتی پر اُگاتی، سجاتی زمانوں پرانی کہانیاں سُناتی تھیں۔ پہاڑی ڈھلانوں پر اُگے باغات اور قدرے ہموار جگہوں پر اُگائی سبزیاں اور اناج جو تیز ہواؤں کے جھلاروں میں جھولتے آنکھوں کو ٹھنڈک دیتے تھے اِن سب منظروں کو شوق سے دیکھا تھا اُس نے۔

مگر انسانی ہاتھوں کی کاریگری نے بنجر پہاڑوں پر جنگلوں کی صورت ہریالیوں کا

جوطوفان اُٹھایا ہوا تھا اور عمارتی حُسن نے نشیبی اور بالائی جگہوں کو جیسے قابلِ دید بنا دیا تھا اس کی آنکھوں میں کہیں ان کیلئے تحسین نہ تھی کہ اِس حُسن کی پیدائش کے پسِ منظر میں جو ہاتھ تھے وہ خون آلودہ تھے اور جو دماغ تھے اُن میں فلسطینی گندگی کی پوٹ بہت حقیر اور قابلِ نفرت ہیں جیسے خناس سے بھرے ہوئے تھے۔

ہر رکاوٹ پر وہ دروازہ کھول کر سنتری سپاہیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کیلئے مری جا رہی تھی۔ ساتھ صرف سال بھر بڑی بہن تھی جو کہیں منتوں طرلوں سے اور کہیں زور زبردستی سے اُسے باز رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی اور وہ تھی کہ اُس کا نازک سا ہاتھ جھٹک جھٹک پھینکتی۔

ابوشعیب پیلے پھٹک چہرے کے ساتھ زیرِلب دعائیں پڑھتا چلا جا رہا تھا۔

''پروردگار اب عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ یہاں کوئی قاعدہ قانون تھوڑی ہے جی چاہے جب مرضی گولی چلا دو۔ سڑک کو لالوں لال کر دو۔ نیا خون بھڑک اُٹھا ہے۔

طبعاً بھی یہ لڑکی اپنے بچپن ہی سے باغی اور سرکش سی ہے۔ بہن کی نہیں سُن رہی ہے تو میری بات کی اوقات کیا؟

اور پھر وہ ہی ہوا جس کے خوفناک تصور سے دونوں کی جان نکلی جا رہی تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور روڈ گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر چلّانے لگی۔

پانچ فٹ ساڑھے آٹھ انچ کی قامت پر ایک بے حد دلکش اور صبیح چہرہ جو اس وقت غصے اور طیش کے عالم میں لال بھبوکا ہو رہا تھا کو گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں اور نوجوان فوجیوں نے قدرے حیرت و تعجب سے دیکھا تھا۔ یہ خاصی حیرت انگیز اور خلافِ معمول بات تھی۔ بس انداز کا فرق تھا۔ لڑکی کسی بپھری شیرنی کی طرح گرج برس رہی تھی۔

''ہمارے وطن میں ہمیں ہی محدود کر دیا گیا ہے۔اِن محدود حصوں میں بھی ہمیں زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔کب تک تم لوگ اِن بیساکھیوں کے ساتھ ہمیں دبائے رکھو گے؟ کب تک؟''

لعن طعن کا طوفان تھا جو اس کے عنابی ہونٹوں سے کسی آتش فشاں کے اُبلتے لاوے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر باہر بہہ رہا تھا۔

چیک پوسٹ پر کھڑا فوجی یونیفارم میں کسا کسایا کلاشنکوف گن سے مسلح نوجوان چلایا تھا۔

''خاموش کون ہو تم؟ بند کرو اپنی زبان۔''

چیک پوسٹ کی کُھلی کھڑکی میں بیٹھی ایک نوجوان فوجی یونیفارم میں ملبوس لڑکی برق کی سی سرعت سے نکل کر باہر آئی تھی۔اُس کی قہر آلود نگاہوں نے لڑکی کو جیسے کچا چبانے والے انداز میں دیکھا اور چلائی۔

''مرنے کی بہت خواہش مند ہو۔ابھی تمہاری خواہش پوری کرتی ہوں۔''

اُس کا دوسرا ساتھی گو چُپ کھڑا تھا مگر اُس کی آنکھوں سے بھی زہر ٹپکتا تھا۔پہلے نے ایک بار پھر چلاتے ہوئے بوڑھے اور دوسری نوجوان لڑکی کو جو گھبرائے ہوئے انداز میں اُسے گھسیٹ کر گاڑی کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ہاتھوں کے سگنل سے اُسے وہاں سے ہٹانے اور دوسری جانب لے جانے کا اشارہ دیا مگر لڑکی تو مرنے مارنے پر تُلی ہوئی تھی۔

فوجی لڑکی نے آٹومیٹک رائفل کی نال کا رخ عین اس کی چھاتی کی جانب کر لیا۔
وہ اپنی آواز کی پوری شدت سے چلائی تھی۔

''چلاؤ گولی۔اِس سڑک کو میرے خون سے سُرخ کر دو۔ظلم کی تاریخ میں نئے

اضافے کرتے جاؤ حتیٰ کہ تمہارے ظلم اتنے بوجھل ہو جائیں کہ تم خود منہ کے بل گر پڑو۔"

تبھی بجلی کی سی تیزی سے چھوٹے کیبن میں سے ایک افسر نکلا جس نے فی الفور فوجی لڑکی اور لڑکے کی تنی ہوئی رائفل کا منہ نیچے کروایا اور لڑکی کے قریب آیا۔ ترشی سے بوجھل اُونچی آواز میں اُس نے بوڑھے اور دوسری لڑکی سے کہا۔

"کھینچا تانی مت کریں۔ چھوڑ دیں اسے۔"

چیتے کی سی پھرتی سے اُس نے ایک پولیس سارجنٹ کو لڑکی کو کیبن کے اندر لے جانے کا اشارہ دیا۔ بقیہ تین کو تیزی سے بلاک ٹریفک کو رواں کرنے کیلئے کہا۔ معمر ڈرائیور کو گاڑی سڑک کے کنارے لگانے کا ہاتھوں سے سگنل دیا۔

اور جب صورت حال اس کے کنٹرول میں آ گئی وہ کیبن میں آیا۔

"کس کی بیٹی ہو؟"

سوال میں تیزی کے ساتھ ساتھ تلخی بھی نمایاں تھی۔ لڑکی ابھی بھی کیل کی طرح تنی کھڑی تھی۔

"بنت فلسطین ہوں۔"

"وہ تو تم ہو۔" لہجے میں سختی ہنوز برقرار تھی۔

میں اُس بڑی شناخت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جسے والدین کہتے ہیں۔

دوسری لڑکی جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی تھیں جس کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت بہتے تھے وہ بھاگتی ہوئی آئی۔ چھوٹے سے کیبن میں کھڑے چیف سارجنٹ کے ہاتھوں کو اُس نے اضطراری کیفیت میں تھام لیا تھا۔

"سر سر Sir Sir!" اُس کے انداز میں کیسا تڑپا دینے والا اضطراب تھا۔

"یہ بدتمیز لڑکی ہے پلیز فار گاڈ سیک For God Sake آپ اسے معاف

کردیں۔آپ کے بھی بچے ہوں گے۔ایسا کبھی ممکن نہیں کہ وہ غلطی نہ کرتے ہوں۔آپ نے بہت بار انہیں معاف کیا ہوگا۔بچے کہتے ہوئے ان کی غلطیوں کو نظر انداز کیا ہوگا۔''

اور ساتھ ہی اپنا تفصیلی تعارف کروادیا کہ وہ ڈاکٹر منصور کی بیٹیاں،ڈاکٹر موسیٰ کی پوتیاں اور یوسف ضیا کی پڑپوتیاں ہیں۔ان کے نانا نابلوس کے نجیب صیام ہیں۔وہ قاہرہ میں پڑھتی ہیں۔آج صبح قاہرہ سے تل ابیب آئیں جہاں سے ڈرائیور انہیں لے کر یروشلم گھر جارہا ہے۔

''سیری زیڈک Saare Zedek میڈیکل سینٹر میں ہارٹ سرجن ڈاکٹر منصور۔''

سوالیہ انداز میں نگاہیں اُس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

لڑکی نے اثابت میں سر ہلایا۔

''آنسو پونچھو بیٹا۔اپنے پاپا سے کہنا کہ وہ اسے سمجھائیں۔اس طرح کی حماقت اس کی زندگی کیلئے جان لیوا ہو سکتی ہے۔''

اس صورت حال کو ہینڈل handle کرنے والا چیف انسپکٹر سفر شک تھا جو اتفاقاً اس وقت پٹرولنگ پر تھا۔بہت دھیمے اور نرم مزاج کا انسان جس کی اپنی بیٹی نے گذشتہ دنوں اُسے کٹہرے میں لاکھڑا کیا تھا۔اُس کی سولہ سالہ بیٹی راشیل جو اخبارات اور مطالعہ کی دیوانی چیزوں کو کرید کرید کر پوچھتی اور اکثر ناک میں دم کر دیتی ہے۔ابھی کوئی ماہ پہلے ہی سوال جواب کرتے ہوئے اُس نے اُسے ایک طرح طعنہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''ڈیڈی آپ نے کفر قاسم جاتے ہوئے راستے میں بنے کیمپوں میں رہنے والوں کے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ہم پوچھتے تھے آپ جواب نہیں دیتے تھے۔شاید آپ کا ضمیر آپ کو اجازت نہیں دیتا تھا۔یہ کس حد صحیح ہے کہ اسرائیلیوں نے اُن کے گھروں کو اُن

سے چھین لیا ہے''۔

وہ تو سٹپٹا اُٹھا تھا۔''ایسا نہیں ہے۔اسرائیل نے یہ زمین خریدی ہے۔''

''نہیں ڈیڈی نہیں۔''راشیل نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔

''تمہیں کس نے بتایا ہے یہ سب۔''اُس نے قدرے غصّے سے پوچھا۔

''بتانا کس نے ہے میں نے ابھی چند دن پہلے ہی بی بی سی B.B.C پر ایک ڈاکومنٹری Documentary دیکھی تھی۔''

اُس نے شرمندگی اور خفت مٹانے کیلئے زوردار طریقے سے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں بکواس کرتے ہیں یہ میڈیا والے''مگر اپنی آواز کا کھوکھلا پن اُسے خود محسوس ہو گیا تھا۔

انہیں گاڑی میں بٹھا کر،احمق لڑکی کو مشفقانہ انداز میں تنبیہ کرتے،بوڑھے ڈرائیور اور لڑکی کی بہن کی آنکھوں سے چھلکتی ممنونیت کے جذبات سمیٹتا وہ واپس اپنی جگہ پر آیا اور حاروں سے بولا۔

''ایسی کسی بھی ناخشگوار صورت کو سمجھداری سے ہینڈل کیا کرو۔بات بات پر بندوقیں اور پستولیں نکالنا درست نہیں۔اسرائیل کا امیج image بہتر بنانے کی کوشش ہونی چاہیئے۔''

ڈاکٹر منصور کی یہ چھوٹی بیٹی بچپن ہی سے بڑی منہ پھٹ،گستاخ اور باغی قسم کی تھی۔گاڑی میں بیٹھی آنسو بہاتی بہن کی پریشانی کا اس پر قطعاً کوئی اثر نہ تھا۔اُس کے یوں ہلکان ہونے کی بھی اُسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔وہ غصّے سے پھولے چہرے اور تنی آنکھوں سے باہر فضا کو یوں گھورے چلی جارہی تھی کہ جیسے اُس ماحول،اُس فضا کو بھسم کر دینا چاہتی ہو۔

آرینا گاڑی کے ہارن کی آواز سنتے ہی پورچ میں آ گئی تھی۔سلامتی سے گھر آنے

پر اُس کے چہرے پر شکر اور خدا کی احسان مندی کے جذبات رقم تھے۔

رائیلا ماں کے گلے لگتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔آرینا نے گھبرا کر ایمان کو دیکھا وہ تنی کھڑی تھی۔ابوشعیب بھی خاموش تھا۔آرینا نے پریشان ہو کر اُسے دیکھا۔اُس نے دھیمے سے کہا۔

''آپ انہیں اندر لے چلیے۔رائیلا آپ کو سب کچھ بتا دے گی۔''

ماں سے ملنے کی بجائے وہ پاؤں بجاتی اندر چلی گئی۔آرینا نے سوچا دونوں بہنوں میں شاید جھگڑا ہو گیا ہے۔جب اندر جا کر حقیقت کا پتہ چلا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔

اس کے کمرے میں جا کر اُسے پیار کرنے اور سمجھانے کا مرحلہ بھی نہ آیا کہ جب اِس کام کیلئے اس نے پردہ اُٹھا کر اندر جانا چاہا تو اس کی تیز آواز سن کر رُک گئی۔فون پر وہ کِسی سے جھگڑ رہی تھی۔صرف چند لمحوں تک ہی وہاں کھڑے ہو کر سُننے سے وہ جان گئی تھی کہ وہ کس سے پھڈا ڈالے بیٹھی ہے۔پائل کی کلاس لے رہی تھی۔کتنی تیکھی اور کاٹ دار آواز تھی۔نہ کوئی ادب نہ احترام۔

''پائل آنٹی مجھے بتائیے آپ نے ایک بیٹا پیدا کر کے کیا تیر مارا؟ پانچ چھ بچے تو ہونے چاہئیں تھے نا آپ کے۔آپ اور انکل ابراھم ایلان جیسی سوچوں اور مثبت رویّوں والے۔احتجاج اور شور مچانے والے۔

اُف مائی گاڈ اُس نے لمبا سانس بھرا۔ایک شامیش اور وہ بھی بدھو سا۔''

فون پر پائل کی ہنسی اُس کی نرمی اور محبت میں بھیگی آواز جب وہ کہتی تھی۔

''میں شام کو آؤں گی میرے بچے تم اب آرام کرو سفر نے تھکا دیا ہو گا۔بیٹھیں گے تو باتیں کریں گے۔''

''نہیں یائل آنٹی۔آپ کو ابھی سب کچھ سُننا ہوگا۔''

اُس کے لہجے میں ہٹیلا پن تھا۔

آرینا کو وہاں کھڑے کھڑے یہ بھی احساس ہوگیا تھا کہ یائل نے کیا کہا ہے؟ مگر وہ تو کسی سرکش اور سرپٹ بھاگتے گھوڑے کا روپ دھارے بیٹھی تھی اور فون پر مسلسل خوفناک قسم کی گفتگو کیے چلی جارہی تھی بغیر اس خوف کے کہ وہ ایک ظالم حکومت اور سوسائٹی کے شہری ہیں جہاں کسی بھی چھوٹی سی بات کو ایشو issue بنایا جاسکتا ہے وہ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی پھر تیزی سے اُس نے فون کی تار کھینچ دی۔

واپس آئی تو احساس ہوا کہ اِس وقت اندر جانا اور اس سے کوئی بات کرنا فضول ہوگا۔اُسے غصّے اور اشتعال کی حالت میں احساس تک نہ ہوا تھا کہ فون منقطع ہوگیا ہے اور وہ تھی کہ اُسی طرح بولے چلی جارہی تھی۔

''اب یائل آنٹی یہ عذر آپ کا مجھے اپیل نہیں کرتا کہ ابراھم انکل کی زندگی مختصر تھی۔آپ کے ساتھ دس بارہ سال تو رہے تھے ناوہ۔''

یائل آنٹی میں آپ کو قاہرہ میں اُن فلسطینیوں کے بارے میں بتا ہی نہیں سکتی جو اپنی وطنیت،اپنی شناخت سے محروم بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنے ٹوٹے پھوٹے گھروں میں جہاں زندگی گزارنا ایک روگ ہے کیسے رہ رہے ہیں؟

1948ء کی ہجرت،1967ء کی ہجرت۔اپنے گھروں میں رہتے بستے اپنی زمینوں کا اناج کھاتے وہ کیسے دربدری کا شکار ہوئے؟فلسطینیوں کیلئے کیے جانے والے بلند آہنگ دعوے سب کھوکھلے ہیں۔عرب ممالک نے اُن کیلئے کچھ نہیں کیا۔

میری ایک دوست کرمس کی چھٹیوں میں مجھے بیروت میں اپنے گھر لے گئی۔یہ بزدل رائیلا مجھ پر چلاّتی رہی کہ مت جاؤ مگر میں نے بھی اپنی پردوست سے اجازت لینے کا

چکر چلا لیا۔

کوئی دو دن بعد ہم مغربی بیروت کے علاقے میں قائم کیے صابرہ اور شتیلہ کیمپوں میں گئے ۔آپ کو توان کیمپوں کی تفصیل بتانے کی ضرورت ہی نہیں ۔میرے لیے تنگ تنگ، گندی مندی گلیوں، اُن میں ٹوٹے پھوٹے بجلی کی تاروں کے بیجانی پھیلاؤ والے سلسلوں سے ڈھپے گھروں، گندے پانی سے بھری نالیوں کو دیکھنے کا کب حوصلہ تھا؟ آنسو بہنے شروع ہوئے تو رکتے ہی نہ تھے۔

ابھی مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جا رہا تھا اور جب گلیاں لاشوں سے بھری ہوئی تھیں ۔بوڑھے ،عورتیں، بچے سب ایک دوسرے میں گڈمڈ پڑے تھے۔شتیلہ کیمپ میں عورتوں کی جانوروں کی طرح چیری ہوئی ٹانگیں، بچوں کی کٹی ہوئی گردنیں، کوڑے کے ڈھیروں پر بکھری جوانوں کی لاشیں دیکھتی تو شاید وہیں پھڑک کر مر جاتی ۔عالمی طاقتوں کی گھناؤنی سازشیں ان کے ہر مسام ہر خلیے میں گھس گئی ہیں ۔لبنانی کرسچین فلانجسٹ ملیشیا کے دستوں نے جس طرح بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے خون سے ہولی کھیلی وہ ایک اور المناک باب ہے۔

میں کیا کروں شتیلہ کا وہ گھر میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا جہاں پانچ معصوم بچوں کی لاشیں ساتھ ساتھ پڑی تھیں جنہیں کسی رپورٹر نے اخبار میں شائع کیا تھا اور اُس کے بدنصیب باپ اور دادی نے وہ کٹنگ سنبھال کر رکھ چھوڑی تھی کہ گھر میں وزٹ visit کرنے والے لوگوں کو اپنے دُکھوں کا نجات دہندہ سمجھتے ہوئے وہ بوڑھی عورت اخبار کے اُس فریم شدہ ٹکڑے کو دکھانا ضروری سمجھتی ہے ۔وہاں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کا کوئی فرد شہید نہ ہوا ہو ۔اسرائیل نے کتنا ظلم کیا معصوم لبنانی شہریوں پر؟ ان کی املاک لوٹیں ۔ان کے خلاف کلسٹر بم استعمال کیے ۔نہ ہسپتال چھوڑے نہ کلینک نہ سکول نہ یواین او U.N.O کی

عمارت اور نہ سفارت خانے ۔اُسے تو کسی ضابطے کی پرواہ ہی نہیں ۔ان کا پانی، بجلی، خوردو نوش کی اشیاء بند۔

یائل آنٹی ۔وہ پل بھر کیلئے رُکی تھی۔

جوش گفتگو میں اُسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ فون تو دیر ہوئی اچانک بند ہو گیا ہے۔

یائل نے ریسیور ضرور رکھا تھا مگر اندر جیسے آگ سی بھڑک اُٹھی ۔بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔

ابراھم ایلان اِس حادثے کی رپورٹنگ کیلئے بیروت گیا تھا۔یائل کو جو پہلی اطلاع ایلان کی طرف سے ملی تھی وہ صحافیوں کے کیمپوں کے اندر نہ جانے کی بابت تھی ۔فون پر وہ مشتعل بھی تھا اور اسرائیلی وزیر دفاع آرئیل شیرون Ariel Sharon اور میناحم بیگن کو گالیاں دے رہا تھا۔

اور جب وہ واپس آیا وہ بہت نڈھال تھا۔

یائل وہاں درندگی تھی ۔بیسویں صدی کی تہذیب یافتہ قومیں تھیں جنہوں نے اُن وحشی چنگیزوں اور ہلاکو خانوں کو مات دے دی تھی۔

اور پھر ایک دن نیویارک کی اس خوبصورت سی صبح جب ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہی ایلان نے ایک موٹی سی گالی فضا میں اُچھالی اور کہا۔۔اِس بدمعاش میناحم بیگن کی باتیں سنو ۔کیا بے نیازی ہے ۔گوئیم مارے گوئیم کو(گوئیم کا لفظ غیر یہودیوں کیلئے استعمال ہوتا ہے ۔عبرانی میں اس کا مطلب چوپایہ ہے) ۔اِس بے حیا کو تو ڈوب مرنا چاہیے ۔ڈھٹائی تو دیکھو ذرا یعنی یہ ساری کارستانی غیر یہودیوں کی تھی ۔کوئی پوچھے بھلا اس منصوبے میں کون شامل نہیں؟ بیگن سے لے کر وزیر خارجہ، وزیر دفاع، آرمی انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر میجر جنرل سیگائے اور موساد کا سربراہ بھی ۔آپ بکواس کر رہے ہیں ۔لندن میں اسرائیلی سفیر

شلومر آرکوف کو کولی بھی پی ایل او P . L . O پر الزام دھرنے کیلئے ہی تو مروائی گئی۔ مسلمانوں میں غداروں کی کونسی کمی ہے۔ الفتح کے لوگوں کو خرید لیا گیا۔ چلو ان بڑی طاقتوں کی فیاضی اور یو این او U.N.O کو شاباش کہ مردے کے منہ پر مکھن کی مالش۔ پی ایل او P.L.O کی قیادت کو لبنان سے نکال کر تیونس میں پناہ دلوادی۔

''ارے فون تو شاید ڈیڈ ہو گیا ہے۔''

ایمان کو یکا یک احساس ہوا۔ ریسیور ہاتھوں میں پکڑے پکڑے اُس نے خود سے کہا۔ پھر اُسے کریڈل پر پٹختکے ہوئے وہ رونے لگی تھی۔

تبھی آرینا نے کمرے میں جا کر آنسو بہاتی بیٹی کو گلے سے لگایا۔ اُسے پیار کرتے ہوئے کچھ کھانے پر اصرار کیا۔ مگر اب وہ ماں کے ساتھ اُلجھ پڑی تھی۔

''مما مجھے بتایئے صرف تین بچے۔ آپ نے کونسا تیر مارا۔ آپ کہیں جاب بھی نہیں کرتی تھیں۔ گھر میں رہتے ہوئے دس بچوں کو پیدا کرنا تو ضروری تھا۔''

آرینا ہنس پڑی۔

''ایمان تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میری سوکس Civics کی ٹیچر بتاتی تھیں کہ اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریاں کو اسرائیلیوں کی نسلی ہم آہنگی کے عدم توازن کا بہت احساس تھا۔ 1949ء میں اُس نے اُن ماؤں کیلئے خصوصی تمغات کا اعلان کیا جن کے ہاں دسویں بچے کی ولادت ہو۔

انہوں نے ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ دس سال بعد یہ انعام منسوخ کرنا پڑا کیونکہ اسرائیلی شہریت رکھنے والی فلسطینی ماؤں نے یہ انعام جیتنا شروع کر دیا تھا۔ آٹھ دس بچے ہوں۔ آدھے اللہ کیلئے، وطن کیلئے شہید ہو جائیں تو چار پانچ باقی تو رہ جائیں گے۔''

آرینا ہنستی رہی۔

ماں کے خاموش پیار بھرے دُلار اور دلداری نے بڑا کام کیا۔وہ کافی نارمل ہوئی۔اُس نے کھانا کھایا۔قہوہ کی پیالی ہاتھوں میں لیے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

گذشتہ دو تین سال سے قہوہ اُسے چھوٹے چھوٹے گھونٹوں سے کسی سوچ کے ساتھ پینا اچھا لگنے لگا تھا۔بے شک ایسے وقت وہ کسی فلم کے بارے، کسی کتاب، کسی دوست، کسی اُستاد یا گھر والوں کے متعلق سوچتی۔آج کا واقعہ تو خیر تھا ہی سوچ والا۔پر جونہی اُس نے قہوے کا چوتھا گھونٹ بھرا آسمانی بجلی کی طرح ایک سین sceneاس کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

بے شمار گاڑیوں کا ہجوم،آگے پیچھے قطاروں میں ڈرائیونگ سیٹوں پر بیٹھے لوگوں کی تعجب بھری نظریں۔یہ سب یہودی تو نہیں ہوں گے۔اُن میں فلسطینی بھی ہوں گے۔کسی نے اپنی گاڑی کا دروازہ نہیں کھولا۔کوئی اُتر کر نہیں آیا۔جب اُسے کیبن میں لے جایا جا رہا تھا اور وہ تھوڑی سی مزاحم بھی تھی کیا کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا تھا۔کیوں؟وہاں تو ہنگامہ مچ جانا چاہیے تھا۔تو گویا اتنی بے حسی تھی کہ کسی نے یہ پرواہ ہی نہیں کی۔لوگ اپنی گاڑیوں میں مست گزرتے گئے۔

اور پھر اس کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔

مجھے لیلیٰ خالد کی طرح کا کوئی کام کرنا ہے۔فدائی بننا ہے۔ایسی جیالی فدائی جو تہلکہ مچا دے پوری دُنیا میں۔فلسطین کا نام گونج جائے۔

پھر کہیں اُس کے ہونٹوں پر توفیق زیاد تھا۔

لدہ میں راملہ میں گلیلی میں (لدہ، راملہ اور گلیلی فلسطین کے شہر)

ہم یہیں رہیں گے

ہم یہیں رہیں گے

تمہارے سینے پر دھری دیوار کی طرح

تمہارے حلق میں ٹوٹے شیشے کی کرچ کی طرح

ناگ پھنی کے کانٹے کی طرح

تمہاری آنکھ میں آندھیوں کی دھول کی طرح

غصے میں سڑکوں پر نکل آئیں گے

قید خانوں کو اپنے وقار سے بھر دیں گے

زیتون اور انجیر کی چھاؤں کی حفاظت کریں گے

اپنے بچوں میں انقلاب کا خمیر اٹھائیں گے

جیسے آٹے میں خمیر اُٹھتا ہے

ہم یہیں رہیں گے

ہم یہیں رہیں گے

کرتے کرتے وہ سو گئی تھی۔

شام کو جب سو کر اُٹھی تو پتہ چلا پائل اُس کے انتظار میں ہے۔چھوٹے سے دودھ پیتے بچے جیسا والہانہ پن جو ماں کی بانہوں میں ہمک کر سماتا ہے کچھ ایسے ہی انداز میں وہ پائل کے سینے سے چمٹی تھی۔

اُس کا بچپن زیادہ پائل کے پاس گزرا تھا۔ڈاکٹر منصور نے شادی کے بعد چار پانچ سال کا عرصہ نیو یارک میں گزارا تھا جہاں پائل اوران کے گھر آدھ گھنٹے کی ڈرائیو پر تھے۔تینوں بہن بھائیوں میں سال بھر کی چھوٹائی بڑائی تھی۔آرینا بہت کم زور تھی۔ڈیوٹی سے واپسی پر پائل ایمان کو اپنے ساتھ لے آتی۔بہت ضدی اور رونے والی بچی تھی۔پائل

کے سینے میں ہی گھسی رہتی ۔شامیش تو اُسے برداشت ہی نہیں ہوتا تھا۔بچپن کی وہ عادت ابھی بھی اس میں تھی ۔

''آپ نے فون بند کردیا تھا۔'' اُس نے ٹھنکتے ہوئے کہا تھا۔

پائل آرینا سے ساری تفصیل سُن چکی تھی ۔ہنستے ہوئے بولی تھی ۔

''کہاں میری جان ۔تمہارے سیٹ میں کچھ خرابی ہوگئی ہوگی ۔''

دفعتاً ''مما'' کی آواز پر اُس نے پائل کے چہرے پر جمی نگاہوں کا رُخ پھیرا۔سامنے شامیش کھڑا اُسے دیکھتا تھا۔

''ارے'' اُس کی آنکھیں گہری حیرت لیے اُسے سرتاپیر گھورتی تھیں ۔

یہ شامیش ہے جسے وہ دوپہر کو بدھو سا کہہ رہی تھی ۔اتنا اُونچا، لمبا، خوبصورت اور شاندار سا۔

''بڑے ڈیشنگ لگ رہے ہو۔دو سال میں تمہاری تو کایا کلپ ہوگئی ہے۔''

''جیلس jealous ہو رہی ہو۔''

''ہرگز نہیں اتنا خوش ہوئی ہوں کہ سوچ بھی نہیں سکتے ۔ارے تم پائل آنٹی کے بیٹے ہو ۔پائل آنٹی کے جس میں میری جان ہے ۔وہ میرا بچپن تھا جب مجھ سے تم برداشت نہیں ہوتے تھے اور میں کسی لڑاکا بلی کی طرح جو بھولے بھالے معصوم سے چوہے کو ہڑپ کرنے کیلئے اس پر ہمہ وقت حملہ آور رہتی تھی ۔''

شامیش نے گہری اور تیکھی نظروں سے اُسے دیکھا اور متانت سے بولا۔

''لڑاکا بلی تو تم ابھی بھی ہو۔ہاں البتہ میں وہ بھولا بھالا معصوم چوہا نہیں رہا۔''

اور ساتھ ہی اس کی جانب سے مزید کسی طنزیہ جملے کی آمد سے پہلے ہی وہ ماں سے مخاطب ہوا اور بولا۔

ضائیہ جذو نے آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔پلیز یاد رکھیے گا۔آپ نے
اُن سے ملے بغیر نہیں جانا۔میں فٹ بال کھیلنے جا رہا ہوں اور وہاں سے سیدھا گھر جاؤں گا۔

اور یا ئل کہتی تھی۔

''ارے میں اس گھر میں آؤں اور اُن سے ملے بغیر چلی جاؤں کہیں ممکن ہے۔''

باب نمبر: ۱۸

ڈاکٹر منصور ہنستے تھے۔ یائل نے فون پر کی ساری تفصیل انہیں سُنا دی تھی۔ دونوں دراصل ایک ہی اسپتال میں تھے۔ دونوں اپنی فرض شناسی، اپنے پیشے سے لگن اور اپنے حُسن سلوک کیلئے پورے یروشلم میں مشہور تھے۔ فلسطینی کیمپوں میں کام کرتے ڈاکٹروں سے دونوں مسلسل رابطوں میں رہتے۔ زیادہ پچیدہ مریضوں کو خود دیکھتے۔ دو تین ماہ بعد کسی نہ کیمپ کا معائنہ کرتے۔

کام کے اوقات میں اگر بہت زیادہ مصروفیت نہ ہوتی تو دونوں اکثر اپنے ساتھیوں اور کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ دن میں ایک بار چائے یا کافی ضرور پیتے تھے۔ اسپتال کا بیشتر عملہ انہیں ایک دوسرے کے اچھے دوستوں کی حیثیت سے جانتا تھا۔ کچھ اندر خانے کی باتوں کو بھی جانتے تھے اور کچھ متعصب لوگ بھی تھے جو اسے غلط معنی بھی پہناتے۔ فطرت کی کمینگی کے باعث پرانے گڑھے مردے اُکھاڑتے مگر وہ دونوں بے نیاز تھے۔ اُن کی محبت اور ان کے عشق کی گہرائی اور وسعت کہیں سمندروں کا روپ دھار بیٹھی تھی۔ اُن کی محرومیاں، لاچار اور دُکھی لوگوں کی پناہ گاہیں بن گئی تھیں۔ اِس محبت اور پیار کی خوشبو مشک نافہ کی طرح انہیں ہمہ وقت سرشار رکھتی تھی۔

ایمان کی کال منقطع ہونے اور ماضی کی المناک سوچوں میں گم رہنے کے بعد جونہی وہ باہر نکلی۔ اُس نے وقت دیکھا۔ اُٹھی اور فرسٹ فلور پر ڈاکٹر منصور کے کمرے میں آ گئی۔

منصور اِس وقت ایک مریض کی کیس ہسٹری Case history دیکھتے

تھے۔دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا،مسکرائے۔پائل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ذرا سنبھل کر گھر جانا۔ایمان چارج شیٹ تیار کیے بیٹھی ہے۔''

منصور نے قدرے حیرت سے پائل کو دیکھا۔

''بھئی تم لوگوں نے بچے کیوں کم پیدا کیے؟

منصور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔حیرت ابھی بھی اُن کی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔پائل نے ساری تفصیل انہیں سنائی۔منصور بہت دیر تک ہنستے رہے۔

گھر آئے تو آرینا کا دم خشک ہوا پڑا تھا۔منصور نے محبت سے دلجوئی کرتے ہوئے کہا تھا۔

''گھبراؤ نہیں۔فلسطین کو ایسے ہی جیالوں کی ضرورت ہے۔ہاں ایک بات کا مجھے ضرور افسوس ہے کہ اگر مجھے اِس بات کا ہلکا سا بھی احساس ہوتا کہ کل میری بیٹی نے مجھے کم بچے پیدا کرنے کی پاداش میں اعتراض کے کٹہرے میں کھڑا کر دینا ہے تو یقین مانو میں دس بچوں کی تجویز پر ضرور عمل کرتا۔''

آرینا کے عنابی ہونٹ ہنسے۔اُس کا گلاب جیسا خوبصورت چہرہ ہنسا۔شوہر سے عشق تھا اُس کا۔منصور بھی آرینا سے بہت پیار کرتا تھا۔بڑے ظرف کی حامل تھی۔پائل کی ذات اور دونوں کی محبت،کسی بھی انداز میں اُن کی زندگی میں کسی ہلکے سے تنازعے،کسی چھوٹے سے جھگڑے کا کبھی باعث نہیں بنی تھی۔دونوں عورتوں میں محبت اور بڑائی چھوٹائی کا احترام اور شفقت کا دخل تھا۔

باپ کی آمد کا سُن کر ایمان اور رائیلا کمروں سے نکل آئی تھیں۔دونوں بیٹیوں کو پیار کرتے اور اُن کے ساتھ گپ شپ کرتے کرتے دفعتاً انہوں نے ایمان سے کہا تھا۔

''بیٹے مجھے تمہیں ایک پیغام دینا ہے کہ کل شام فلسطین کا مایہ ناز انقلابی شاعر محمود

درویش ہمارے گھر آئیں گے۔آج وہ اپنے چیک اپ کیلئے اسپتال آئے تھے۔میں نے اُن سے تمہارے بارے میں بات کی تھی۔انہوں نے تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور میں نے انہیں مدعو کرلیا۔

ایمان تو نام سنتے ہی اچھل پڑی تھی۔

''محمود درویش ابّی۔آپ سچ کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں نا بھئی وہ میرا مریض بھی ہے اور تمہارے پردادا کا عاشق بھی۔''

''اللہ اتنا بڑا شاعر مجھ سے ملنے آئے گا۔ابّی یہ سب آپ کی وجہ سے ہے۔خدا آپ کو سلامت رکھے۔''

ایمان کی آواز ممنونیت کے تشکر سے بوجھل تھی۔

اگلا سارا دن وہ اندر باہر پھرتی اُس کی نظموں کے ٹکڑے گنگناتی رہی۔

You who stand in the door way, come in,

Drink Arabic coffee with us

and you will sense that your are men like us

You who stand in the door ways of houses

come out of our morning times

We shall feel reassured to be men like you

Here on the slopes of hills facing the dusk

and the cannon of time

close the gardens of broken shadows

We do what prisoners do

and what the jobeless do

we cultivate hope.

شام کو ایک دلکش نقوش والا دُبلے پتلے وجود کا حامل خوبصورت شخص آیا جس کے استقبال میں وہ سب سے پیش پیش تھی۔ پھولوں کا گلدستہ لیے پورچ میں کھڑی تھی۔ محمود درویش نے اُسے بانہوں میں سمیٹا۔ اس کے گالوں پر بوسہ دیا۔ آرینا سے رائیلا سے ملے۔

''میں نے ڈھیروں باتیں کرنی ہیں آپ کے ساتھ۔''

اُس کی آنکھوں میں جیسے دیئے سے جلتے تھے۔

وہ ہنسے اور بولے۔''میں تمہارے ساتھ باتیں کرنے ہی تو آیا ہوں۔''

وہ انہیں ہاتھوں سے پکڑے اپنی ماں سے معذرت کرتے ''سوری مما آج یہ صرف میرے مہمان ہیں'' کہتے انہیں اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔

اور پھر جیسے دھیرے دھیرے اُس نے اپنے ننھے ننھے دُکھ انہیں سنانے شروع کیے۔

اپنے چہرے کو شفقت و محبت کی شبنم سے سجاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''میری مٹی سی بیٹی میں بروہ گاؤں سے تھا۔ گلیلی کے بالائی حصے میں سرسبز پہاڑی پر واقعی خوبصورت اور پُرسکون گاؤں۔ میں چھوٹا سا تھا سات سال کا مگر وہ رات آج اتنے سالوں بعد بھی مجھے یاد ہے۔ میری تو آنکھوں میں خواب تھے اور ماں جھنجھوڑے چلی جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ اُونچے اُونچے چلاّتی تھی۔

''اُٹھو۔ اُٹھو میرے بیٹے کمبخت صیہونیوں نے حملہ کر دیا ہے۔''

پھر میں ماں کا ہاتھ تھامے سینکڑوں لوگوں کے ساتھ جنگلوں میں بھاگتا تھا۔ تعاقب میں گولیاں تھیں۔ پتہ نہیں ماں کیسے قافلے سے بچھڑ گئی اور دن پورے شور سے

طلوع ہو گیا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر قریبی کھیت میں چُھپ گئی۔ سُورج کی گرمی، سرسوں کے بھاپ چھوڑتے ڈنٹھل اور بھوکا پیاسا میں۔ رونے لگتا تو ماں میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتی کہ آواز نہ نکلے۔

میری یادداشتوں میں اُن لمحوں کی اذیت ابھی تک باقی ہے۔ میں چاہنے کے باوجود انہیں بھول نہیں پایا ہوں۔

پھر ایک موٹا تازہ فوجی ایک ہاتھ میں بندوق پکڑے ڈنٹھلوں کو دوسرے ہاتھ سے ہٹاتا ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ میری ماں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

''پرواہ سے ہو۔'' وہ چلّا رہا تھا۔

بندوق کی نال سے میرے سر کا نشانہ لیتے ہوئے اُس نے اُسے باہر نکلنے اور مشرق کی طرف بھاگنے کا کہا۔

''پرواہ کو بھول جاؤ۔ پلٹ کر اُس کی طرف نہیں دیکھنا وگرنہ گولیاں اندر تک اُتر جائیں گی۔''

پھر ماں میری انگلی پکڑے بھاگتی گئی اور میں تب سے آج تک بھاگ رہا ہوں۔ کہیں ظلم پر احتجاج کرتے، کہیں اپنے حق کیلئے لڑتے مرتے، کہیں دل کے جذبات منہ سے لفظوں کی صورت نکالتے۔''

خادمہ چائے کے لوازمات سے سجی ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی۔ سروس دینے کیلئے منتظر نظروں سے اُس نے ایمان کو دیکھا۔ زبان سے کچھ کہنے کی بجائے اُس نے آنکھوں سے اُسے باہر جانے کا اشارہ دیتے ہوئے ٹرالی اپنی طرف گھسیٹی۔ ایک ہاتھ سے پلیٹ اور نیپکن پکڑاتے دوسرے ہاتھ سے پودینے کے تازہ پتوں سے سجی کیوبی بالز (Kubbi Balls) کی چھوٹی سی ڈش اُنہیں پیش کرتے اور ساتھ ہی ساتھ یہ پوچھتے

کہ وہ چائے لینا پسند کریں گے، کافی coffee کا شوق رکھتے ہیں یا قہوہ من کو بھاتا ہے۔

محمود درویش نے تینوں جملے کسی چھوٹے بچے کی طرح زیرِلب دہرائے۔اُس پیاری سی لڑکی کو بغور دیکھتے ڈش سے پودینے کے چند پتے اُٹھا کر منہ میں چباتے ہوئے کہا تھا۔

''میری بچی تم تو بڑی سگھڑ ہو۔آج شام کا یہ ہوٹ ڈرنک hot drink تو تمہاری پسند کا ہوگا۔''

کنف (Kunaf) کے چھوٹے سے ٹکڑے کی چھوٹی سی بائٹ bite لیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''ہاں اب تم باتیں کرو گی اور میں سنوں گا۔''

پھر سُپر سونک طیارے کی سی رفتار سے اُس نے اُونچی اُڑان لی تھی۔کافی coffee کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے انہوں نے اس کی تیز رفتاری کو ٹوکا نہیں۔

اور جب لینڈنگ ہوگئی انہوں نے اپنی مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں تو بھئی ہماری ایمان فدائی بننا چاہتی ہے۔اولمپک ویلج Olympic Village میونخ میں اُن پانچ عربوں کی طرح جو کسی طرح اندر گھس کر گیارہ اسرائیلی کھلاڑیوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ایسا ہی کوئی کارنامہ انجام دینے کی خواہش ہے۔

میری پیاری سی بیٹی ایمان کیا تمہیں معلوم ہے کہ اُن گیارہ جانوں کے عوض کتنے فلسطینی بھینٹ چڑھے؟اِس واقعے کے صرف تین دن بعد اسرائیل 1967ء کی جنگ سے بھی زیادہ شدت سے حملہ آور ہوا۔شام اور لبنان کے پناہ گزین کیمپوں پر 75 ایئر کرافٹوں

کے ساتھ نہتے لوگوں پر حملے۔اتنی تباہی کہ جتنا جھوٹ بول لیا جائے۔وہ معصوم جنہوں نے ابھی زندگی کو دیکھنا تھا کیسے ملیامیٹ ہوئے؟ گولڈا مئیر کی زبان اور آنکھوں سے آگ برسی اور وزیر ثقافت و تعلیم یگائل ایلن نے صرف گیارہ بیواؤں کی دلداری کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہمارے طیاروں نے ان کے بیج مار دیئے۔''

یہ سب تمہیں بتانے سے میرا یہ مقصد نہیں کہ ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا چاہیے۔سوال صرف نقصان کا ہے۔کم سے کم نقصان پر زیادہ طاقتور نتائج۔یہ اُن کی خام خیالی ہے۔وہ آزادی کی جدوجہد سے آگاہی رکھتے ہوئے بھی اس اہم عنصر کو نظر انداز کرتے ہیں کہ اس وقت وہ طاقتور رہیں۔

''لفظ لکھو فلسطینیوں کے متحد ہونے کیلئے۔لفظ لکھو دُنیا کو بتانے کیلئے۔لفظ لکھو ذہنوں کو متاثر کرنے کیلئے۔تمہارا بس یہی کام ہے۔''

پھر انہوں نے اپنے لیئے چائے کا ایک اور کپ بناتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کتنی زبانوں میں لکھ اور بول سکتی ہو۔''

''انگریزی تو خیر بہت اچھی ہے۔مما کی ساری ایجوکیشن انگلینڈ میں ہوئی ہے۔انہوں نے اس پر بہت زور دیا۔فرنچ French بھی ٹھیک ہے۔میری جدو کی سکولنگ پیرس کی ہے۔عربی تو خیر ہماری اپنی زبان ہے۔''

''خوب۔'' ستائش بھرے لہجے میں کہا گیا۔

''یہ تینوں بڑی اہم زبانیں ہیں۔ان میں اور مہارت پیدا کرو۔بڑے لکھنے والوں کو پڑھو۔عبرانی بھی سیکھو۔سچی تحریر لاکھوں کروڑوں ذہنوں کو متاثر کرتی ہے۔مدلل تحریر ذہن میں کھلبلی مچا دیتی ہے۔تم جیسے لوگ قلم کی تلوار اُٹھائیں۔لوہے کی تلواریں، بندوقیں اُٹھانے والے بھی ہیں۔

میری بیٹی یقین رکھو پختہ یقین کہ اب اِن بے بس لوگوں نے اپنی زندگی اور اپنی قسمت کا فیصلہ خود اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوششوں کا آغاز کر دیا ہے۔ اِن کمزور لوگوں کے جذباتی ہیجان انہیں تشدد اور دہشت کی طرف مائل کرتے ہیں جو فطری امر ہے۔ کمزور نے اپنے وسائل کے تحت اس کا اظہار کرنا ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو مسلسل اپنے اُن گاؤں شہروں کے بارے میں بتاتے رہنا ہے۔ جن میں کبھی اُن کے بڑے رہتے تھے اور جن پر اب قبضہ ہے اور جہاں یہودی آبادیاں بن گئی ہیں اور مزید بن رہی ہیں۔''

اور جیسے راہ متعین ہو گئی تھی۔ اندر کے آتش فشاں کے اُبلتے کھولتے لاوے کو نکلنے کیلئے راستے مل گئے تھے۔

صرف چند دن بعد رات کے کھانے پر جب سب افرادِ خانہ میز کے گرد ابھی بیٹھے ہی تھے اُس نے قدرے اُونچی آواز میں دادی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''جدّو مجھے اب اعلیٰ تعلیم کیلئے امریکہ یا انگلینڈ جانا ہے۔''

جدّو کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ڈاکٹر منصور نے پوچھا۔

''کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''جگہیں تو دونوں ٹھیک ہیں۔ تاہم یائل آنٹی سے مشورے کے بعد فائنل فیصلہ کروں گی۔''

انگلینڈ آرینا کی ترجیح تھی کہ اُس کے باپ کا وہاں گھر اور بزنس بھی تھا۔ ماں سے کہیں زیادہ اُس کیلئے یائل کا کہنا اہم تھا۔ آرینا یہ جانتی تھی اسی لیئے اُس نے اندرخانے یائل سے کہا تھا۔

''یائل آہوتی (میری آپی) اُس نے آپ کی رائے کے مطابق چلنا ہے اور آپ کا دوٹوک اور حتمی فیصلہ صرف انگلینڈ کے حق میں ہونا چاہیئے۔''

اور چند ماہ بعد ہی اُس نے انگلینڈ کیلئے رختِ سفر باندھ لیا۔ اُس کا قیام وہاں کم و بیش پانچ سال رہا۔ یہ عرصہ اُس نے اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے، لائبریوں میں آزادی کی مختلف تحریکوں کی تاریخ پڑھنے، اخباروں میں مضامین لکھنے، یورپ بھر میں پھیلے فلسطینیوں سے رابطے کرنے، فلسطین کے سکولوں اور اسپتالوں کیلئے چندے جمع کرنے اور مہینے میں ایک دفعہ اکٹھے ہونے اور فلسطین کے نامور لوگوں کے ساتھ شامیں منانے، انہیں سُننے اور اسرائیل کی طرف سے ہونے والی زیادتیوں پر احتجاج کرنے کے سلسلوں میں صرف کیا۔

ڈاکٹر بشارالبشر سے ملاقات بھی ایسی ہی ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ انگلینڈ آئے ہوئے اُسے ابھی صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے جب شہرہ آفاق مصور اور کارٹونسٹ ناجی العلی کے بارے میں اُسے پتہ چلا تھا کہ وہ لندن آئے ہوئے ہیں۔

''ایک شام ان کے نام'' وہ انہیں کھوجنے لگی۔ کہاں ٹھہرے ہیں۔ اشرق الاوسط کے دفتر سے رابطہ کیا کہ ان کے کارٹون اس میں اکثر چھپتے تھے۔

''کل انہیں یہاں آنا ہے پانچ بجے کے قریب۔'' دفتر والوں نے اُسے بتایا۔ اُس نے پتہ سمجھا۔

Arab Press house 184 high Holborn۔ ٹیلی فون نمبر بھی لیا مگر کوشش کے باوجود فون پر رابطہ نہ ہو سکا تو دفتر پہنچ گئی۔ جب وہ فارغ ہوئے اُس نے انہیں پکڑ لیا۔ خالدی خاندان کی اِس بیٹی جو یوسف ضیا جیسے عالم کی پڑپوتی تھی کو انہوں نے فرطِ مسرت سے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اُس کے گالوں، بالوں پر متعدد بوسے دیئے اور کہا ایک عظیم ہستی جس پر فلسطین ہمیشہ ناز کرتا رہے گا۔ وہ اُس کے دادا ڈاکٹر موسیٰ اور والد منصور کو بھی جانتے تھے۔ اُس کی خواہش پر بولے تھے۔

''میرے لیئے اِس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہوگی کہ میں فلسطینیوں کے

درمیان وقت گزاروں گا۔"

اور لندن کی اُس بھیگی شام کو وہ رائل البرٹ ہال کے سیکنڈ فلور کے آڈیٹوریم Auditorium کے دروازے پر اپنے ساتھی لوگوں کے ساتھ ہاتھوں میں پھول پکڑے انہیں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

ہنستے ہوئے اُس کے ساتھیوں سے تعارف کے بعد دفعتاً انہوں نے ذرا فاصلے پر کھڑے ایک نوجوان کو دیکھا تھا جو اُن کی طرف مسکراتے ہوئے بڑھا تھا۔

"یہ ڈاکٹر بشارالبشر ہیں۔" انہوں نے ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ مسیحا ہے۔قدرت نے اس کی انگلیوں میں مشینیں فٹ fit کر دی ہیں جو مریض کے جسم پر پھرتے ہوئے مرض کی تشخیص کر دیتی ہے۔یہ لندن میں سپیشلائزیشن کیلئے آیا ہے۔اس کی ذات سے جُڑی اس کی یہ خداداد صلاحیت ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہے۔فلسطین اس کا عشق ہے۔اس نے چھٹیوں میں وہاں جانا اور کیمپوں میں علاج کرنا شروع کر دیا ہے۔شاید تمہارے والد اور دادا کو بھی اس کا علم ہو۔"

مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔پھر وہ معذرت کرتے ہوئے سٹیج stage پر آ گئی جہاں اُس نے پروگرام کے باقاعدہ آغاز کا اعلان محمود درویش کے اِن شعروں سے کیا۔

A woman looked at the sky and cried

O' cloud cover my beloved

For my clothing is drenched with his blood

ناجی العلی سے درخواست کی تھی کہ وہ سٹیج پر تشریف لائیں اور اپنے احساسات و جذبات سے اُنہیں آگاہ کریں۔

"اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔میری کہانی اُن لاکھوں فلسطینیوں سے مختلف تو

نہیں جنہیں ماؤں نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بچپن کی میٹھی نیند سے جگایا اور جنہیں جوتا پہننا بھی نصیب نہ ہوا۔اُترائیوں،اُونچائیوں،کھائیوں،گھاٹیوں،جنگلوں میں بھوکے پیاسے ٹھوکریں کھاتے لہولہو پاؤں،کیمپوں میں پناہ گزین ہوئے۔

میری جنم بھومی الشجرہ نامی گاؤں تھا۔نزارتھ(ناصرہ)اور تبریاس کے درمیان کی ایک خوبصورت جگہ جس کے سنگتروں کے باغ ہماری ملکیت تھے۔بہت بعد میں جب الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلوما ہولڈر Diploma Holder ہونے کے باوجود مجھے کہیں کام نہیں ملتا تھا تو میں نے سنگترے بیچنے کا کام کیا۔تب میں پیڑوں سے انہیں اُتارتے ہوئے روتا تھا اور اپنے بچپن کو یاد کرتا۔

آواز کیسے بھرّانے لگی تھی۔آنکھوں میں نمی سی اُتر رہی تھی۔میرا وہ گاؤں اب کہیں نہیں۔میرا بچپن،میری گلیاں،میرا وہ گھر،میرے ساتھی درخت،میرے سنگی وہ پتھر اور میری وہ یادداشتیں سب حرف غلط کی طرح مٹ گئی ہیں۔مگر کیا کوئی انہیں میری یادوں سے چھین سکتا ہے۔کبھی نہیں۔

لبنان میں عین الحلوہ کیمپ میں ایک جیل تھی۔بے بس و بے کس،دُکھی اور بے گھر لوگوں کی جیل اور یہیں میرے اندر لکیروں سے باتیں کرنے کی خواہش نے جنم لیا تھا۔یہ خواہش اتنی شدید ہوگئی تھی کہ میرے لیے کوئی چارہ ہی نہ رہا۔کاغذ پینسل تھی نہیں۔نہیں۔میں اپنے اکلوتے کمرے کی مٹی سے لپی پتی دیواریں کوئلے سے لکیریں کھینچ کھینچ کر بھر دیتا۔بعد میں دیکھتا تو وہ کچھ معنی دیتی شبہیں ہوتیں۔

جیلوں میں سزائیں کاٹتا۔باہر آتا تو نعرے لگاتا۔اپنے لوگوں کی حالت زار پر کڑھتا۔وہ لوگ جن کی زمین فلسطین تھی جو اپنی زمین سے جڑے اُس کے کھیتوں باغوں میں سانس لیتے اور جیتے تھے۔تو جب اُن سے اُن کے کھیت کھلیان چھین لیے گئے تو گویا اُن سے

ان کی زندگی چھن گئی۔

اور پھر یہیں ہم نے انقلاب کا سبق سیکھا۔یہیں ہم نے عربوں سے نفرت سیکھی۔یہیں ہم نے اسرائیل کے ظلم سہے جس کے ہر وار میں ہمارے لیے ایک پیغام ہوتا تھا۔فلسطین کو بھول جاؤ۔ہم نے جان لیا تھا کہ ہمیں اپنی مدد آپ کرنی ہے۔

اور 1982ء میں ہم نے بندوقیں اُٹھائیں اور مسلح جارحیت کا مقابلہ شروع کیا۔ہم یہ بھی جان گئے تھے کہ عرب ممالک نے نہ صرف ہمیں نقصان پہنچایا بلکہ فلسطینی انقلاب کے خلاف بھی سنگین جرائم کا ارتکاب کیا۔ہمیں اگر مدد فراہم کی جاتی تو یقیناً ہم بہت کچھ کر سکتے تھے مگر پناہ گزینوں کے پاس تھا کیا؟وہ بم باری کا مقابلہ کیسے کرتے؟اسرائیل جنوبی لبنان کا مکمل صفایا کر کے فلسطینیوں کو مار دینا چاہتا تھا۔وہ ہمارے گھروں کو ملیا میٹ کر دیتے۔مردوں اور لڑکوں کو جیلوں میں ٹھونس دیتے۔کہیں نوجوانوں کو شہید کر کے اُن کی لاشیں گلیوں میں پھینک دیتے۔ایسے کڑے وقتوں میں عورتوں اور بچوں نے عین الحلوہ تعمیر کیا۔مٹی سے،گارے سے،پتھروں سے جو چیز ملی اُسے لگا دیا کہ سر چھپانے کا آسرا ہو جائے۔

اور یہی وہ زمانہ تھا جب حنظلہ میرے اندر پرورش پانے لگا۔موٹا سا ایک لڑکا۔ہاتھ کمر پر باندھے عرب دُنیا کی طرف پیٹھ موڑے اور یہ لڑکا اخباروں کے صفحات پر نمودار ہونے لگا۔حنظلہ فلسطینی ہے۔اس کی ہر حرکت ہر انداز فلسطینیوں کا نمائندہ ہے۔

اس پر دباؤ پڑتا ہے بڑے لوگوں کی طرف سے،بڑے مُلکوں کی طرف سے جو امریکہ کے پٹھو ہیں،اس کے طفیلیے ہیں۔مگر یہ گھبراتا نہیں۔لوگ اِسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

آواز بھر بھرا رہی تھی۔

سٹیج پر بیٹھی ایمان نے پھرتی سے اُٹھ کر پانی کا گلاس اُنہیں تھمایا۔چند گھونٹ لینے

کے بعد ایمان کو پیار بھری ممنونیت سے دیکھتے ہوئے شکریہ کہا اور حاضرین سے بولے۔

''میں مایوس نہیں ہوں۔ نا اُمید بھی نہیں۔ یہ ایک مسلسل جدوجہد ہے جو انشاءاللہ رنگ لائے گی۔ اس میں بشارالبشر، ایمان اور یہ ڈھیر سارے نوجوان جو یہاں بیٹھے ہیں ہماری اُمید ہیں۔ میری بیٹی جو بمباری کے دوران زخمی ہوئی مہینوں اسپتال میں رہی، بیٹا جس نے ایک ایک کیمپ کو میرے ساتھ دیکھا اس مشن کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔ میں نا اُمید نہیں۔''

تالیوں کی بہت گونج تھی جس نے دیر تک فضا کو مرتعش رکھا۔ پھر ابراہیم غطام سٹیج پر آیا۔ لحن داؤدی میں وہ محمود درویش کی نظم کے چند اشعار پڑھ رہا تھا۔

زیتون کی کوئی شاخ مجھ سے لے لو
میرے المیے کی کوئی سطر
خیال کی کوئی لڑی
بچپن کا کوئی کھلونا
تمہاری آنکھیں فلسطینی ہیں
تمہارا نام فلسطینی
تمہارے خواب و خیال تمہارا بدن تمہارے پیر
تمہاری چُپ تمہارے بول
تم حیات میں بھی فلسطینی ہو
موت میں بھی فلسطینی رہو گی

یاشر عظام ابھی حال ہی میں فلسطین سے آئے تھے۔ غزہ سے تعلق تھا۔ ایمان نے اُسے دعوت دی کہ وہ آئے اور وطن سے دُور سامعین سے گفتگو کرے۔

مگراس کے سٹیج پر آنے سے قبل ایمان نے محمود درویش کی Our Loses کے چند اشعار پڑھے۔

Between two and eight martyrs each day

and ten wounded

and twenty homes

and fifty olive trees.

یاثر عظام نے چند لفظوں میں اپنا تعارف کروایا کہ وہ غزہ کے خان یونس سے ہے اور قانون پڑھنے یہاں آیا ہے۔اُس کا لب ولہجہ نوجوان ہونے کے باوجود جوشیلا نہیں تھا۔ مدلل تھا۔قابض قوموں کو بُھولنے کی عادت ہوتی ہے مگر جن کی دھرتی پر قبضہ ہوتا ہے وہ کبھی کسی کو مگو جیسی کیفیت کا شکار نہیں ہوتیں۔

کیمپوں میں پیدا ہونے والی نسل جن کے عارضی بنے سکولوں پر بھی بمباری کے شعلے بھڑکتے ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ بچے پڑھیں۔تو یہ بچے دھرتی پر بہنے والے اُس پانی کی طرح سے ہیں جسے کسی قاعدے میں نہ ڈالا جائے تو وہ اپنے راستے خود بناتا ہے۔

اور دُنیا دیکھ رہی ہے کہ ایسے ہی ان بچوں نے جن کے پاس بندوقیں نہیں، گولیاں نہیں، چھت نہیں، ممتا نہیں، پدرانہ شفقت نہیں۔ ہاتھوں میں پتھر اور ڈنڈے اُٹھا کر ایک نئے انتفاضا کا آغاز کر دیا ہے۔جبر کے ہاتھوں پس جانے والے لوگوں کے اندر سے بے اختیار پھوٹ نکلنے والا لاوہ جس نے صیہونیت کو لرزا دیا ہے۔یہودیت کو خوف زدہ کر دیا ہے اور بزدل اسرائیلی ٹینک توپوں سے اُن پر چڑھائیاں کر رہے ہیں۔انہیں خون میں نہلا رہے ہیں لیکن انہیں کب پرواہ ہے؟ وہ تو مجاہدانہ آن بان اور شان سے مزاحمت کا ہراول دستہ بن گئے ہیں۔وطن کی ہواؤں میں جدوجہد کے نئے انداز اور نئے رنگوں کے عکس ہیں۔یہ

انتفاضہ کا نیا روپ ہے۔کبھی کسی نے ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ دیکھا ہے۔نہیں دیکھا تو دُنیا اب دیکھ لے۔میں یہاں شام کے عظیم اور انقلابی شاعر نزار قبانی کی وہ شہرہ آفاق نظم سُناتا ہوں جو انہوں نے ان بچوں کو اپنی مدد کرنے اور اپنے زوربازو پر انحصار کرنے کا کہتے ہوئے لکھی ہے۔

We want an angry generation

Full of Zest

Which would tear the sky apart

That can Jolt the foundations of History

We want a new generation

Which would not tolerate mistakes

Which would not go down on its knees

We need a generation of Jinns

اور یہی وہ خوبصورت شام تھی،خوبصورت جگہ تھی اور خوبصورت محفل جس میں وہ یشارالبشر سے پہلی بار ملی تھی اور اُس نے یشار کے بارے میں جانا تھا۔

یشار بھی اسی مظلومیت کا شکار تھا۔عکہ کا یشار جس کا چچا آئرلینڈ Ireland میں تھا جس نے یشار کے خاندان کو کیمپ سے اُٹھا کر دمشق اپنے گھر میں رکھا اور کچھ عرصے بعد یشار کو اپنے پاس آئرلینڈ بُلا لیا۔اِن دنوں وہ لندن میں تھا۔ہر چھٹیوں میں فلسطین جانا اور کیمپوں میں ڈیوٹی دینا اس کے لئیے ضروری تھا۔وہ ڈاکٹر منصور اور ڈاکٹر پاکل دونوں کو جانتا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی کشش کو محسوس کیا اور وقتِ رُخصت ٹیلی فونوں کے نمبر نوٹ کیئے۔یہ اور بات ہے بہت سارے دن کیا بہت سارے مہینے گزر جانے پر بھی

دونوں نے فون کا سہارا تک نہ لیا۔ یوں کچھ تو ان کی مصروفیات تھیں اور تھوڑا سا انا کا چکر بھی تھا۔ یہ نہیں کہ ملنے یا فون کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ یشار ایمان کی شخصیت سے مرعوب ہوا تھا۔ خود سے کہتا تھا۔

''ارے یار کوئی ٹھوس بات تو ہو فون کرنے کیلئے۔ آپ کیسی ہیں؟ دل آپ کی آواز سُننے کو چاہتا ہے۔'' کتنی عامیانہ سی بات ہے اور مہینوں بعد جب وہ ملے تو اُسی ہال میں۔

تب اُس عظیم مصوّر اور کارٹونسٹ کے ساتھ ایک شام تھی اور آج اُس کی ناگہانی موت پر ریفرنس تھا۔ اُسے گولی ماردی گئی تھی۔ جب وہ چیلسی لندن میں ایک عربی اخبار کے دفتر سے نکل رہا تھا۔ کن لوگوں نے اُسے مارا تھا۔ خیال تھا اپنوں نے جن سے اُس کے کارٹون برداشت نہیں ہوتے تھے۔

دونوں افسردہ تھے۔ سارا ہال افسردہ تھا۔ ہاں البتہ ابو جہاد کے اسرائیلی ٹیم کے ہاتھوں شہید ہونے اور پی ایل او P.L.O کے اسرائیل کو منظور کرنے پر انہوں نے فون پر ہی اپنے دُکھ اور رائے کا اظہار کیا تھا۔

وقت، ایک علم دوست ماحول، تاریخ کے گہرے مطالعے کیلئے اُس کا اپنا ذوق و شوق، دانشوروں سے مکالموں اور ایک ملٹی نیشنل سوسائٹی Multinational Society رکھنے والے مُلک میں قیام کرنے نے اُسے ذہنی بلوغت دی۔ متانت اور بردباری سکھائی تھی۔ وہ منہ پھٹ اور بے باک تو ابھی بھی تھی مگر طریقہ سلیقہ سیکھ گئی تھی۔

اِن دنوں وہ گھر آئی ہوئی تھی۔ آنے سے قبل یشار سے اس کی بات ہوئی تھی۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا ''تم چلو میں ایمان کو اپنے ایمان میں شامل کرنے کیلئے جلد یروشلم پہنچ رہا ہوں۔''

باب نمبر: ۱۹

تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق فلسطینیوں نے ہاتھوں
میں پتھر اٹھا کر انتفاضہ (نجات پانا) کا آغاز کر دیا۔
سوویت یونین ٹوٹنے پر روسی یہودیوں کی امریکہ کیلئے نقل
مکانی روکنے اور اسرائیل کیطرف ہجرت کو یقینی بنانے کے
لئے اسرائیلی حکومت کو امریکہ سے گڑگڑا کر درخواست
کرنی پڑی کہ انکی یہودی تاریخ کے نظریئے کو بکھرنے
سے بچائیں۔

یہ نئی تبدیلیاں اُس کیلئے حیرت کا باعث تھیں۔

وہ کوئی پانچ سال بعد گھر لوٹی تھی۔ یہ نہیں کہ بیچ میں کوئی چکر نہیں لگا تھا۔ ایک بار ڈھائی سال بعد آئی تھی مگر گھر ٹھہرنے کی بجائے وہ اکیلی کیمپوں میں ہی گھومتی پھرتی، رپورٹیں بناتی اور اعداد و شمار اکٹھے کرتی رہی۔

اور کس قدر سنسنی خیز انکشافات اُس کے سامنے آئے تھے۔ بن گوریاں ایرپورٹ پر فلسطینیوں کو کس کس انداز میں ذلیل کیا جاتا تھا۔ اسرائیلی خفیہ پولیس کا نازی گسٹاپو سے کہیں زیادہ مکروہ اور ہولناک کردار تھا۔ پرمٹ سسٹم نے فلسطینیوں کی زندگی کو اجیرن بنا دیا تھا۔ ایک صفحہ کا فارم گویا ایک عذاب کی سی صورت رکھتا تھا۔ ذاتی اور کاروباری زندگی کی ایک ایک تفصیل کا اندراج۔ پھر اسے منظور کروانے کیلئے گھنٹوں لمبی

قطار میں کھڑے ہونا۔ پیدائش کا سرٹیفکیٹ ہو، ڈرائیونگ لائسنس کیلئے نام اندراج کروانا ہے۔ سکول میں داخلے کا معاملہ، بیرون ملک سفر کرنا ہو، تدفین کیلئے جگہ کا حصول چھ سات دفتروں کے چکر، گھنٹوں کا انتظار۔ اور یہی وہ سال تھے کہ جنہوں نے فلسطینیوں کو بہت مشتعل کر دیا تھا۔

اور تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق فلسطینیوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھا کر انتفاضہ (نجات پانا) کا آغاز کر دیا تھا۔

ایمان کی ملاقات اپنے اِن دوروں کے دوران بہت سی ایسی تنظیموں کے لوگوں سے بھی ہوئی جو انہی کی طرح حالات کے جائزے اور مشاہدے کیلئے یہاں آئے تھے۔ اِن میں ہیومن رائٹس فیڈ ریشنز کا بھی ایک ٹولہ تھا جنہوں نے ایمان کی اِس رپورٹ سے سوفی صد اتفاق کیا کہ بیشتر فلسطینیوں کو اسرائیلی دستے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مارتے اور زخمی کرتے ہیں۔

ایمان ویسٹ بنک میں بی تسلیم B'Tsclem کی کارکردگی اور انکے مشن سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ یہ تنظیم ہر شعبہ زندگی کے نامور اسرائیلیوں پر مشتمل تھی۔ جو اسرائیلی لوگوں میں عربوں سے متعلق انسانی حقوق کی اہمیت کا شعور پیدا کرنے، مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں کے مسائل کے حل اور اُن کے شہری حقوق کی واگذاری کیلئے بہت سرگرم تھی۔ یائل بھی اُن لوگوں کے ساتھ ان کے مشن میں شامل تھی۔

یائل کے حوالے سے، بہت سی جگہوں پر اُسے خاصی آسانی رہی۔

ایک تو اُس کا جلنا کڑھنا بہت رہا۔ ویسٹ بنک میں جو جگہ جگہ نئی یہودی بستیاں بنی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر وہ لمبی لمبی آہیں اندر سے نکالتی تھی۔ جنہیں یہاں ہونا چاہیے وہ ٹوٹے پھوٹے خیموں میں دھکّے کھاتے پھرتے ہیں۔ کہیں بے وطنی کے داغ ماتھوں پر

سجائے ہوئے ہیں۔امن مارچوں میں اسرائیلی دہشت گردوں کا سامنا کرتے ہیں اور سینوں پر گولیاں کھاتے ہیں۔

خلیل الوزیر جسے پی ایل او ابو جہاد کہتی تھی اُسے تیونس میں اسرائیلی کمانڈوز کے ہاتھوں شہید ہوئے بھی خاصا وقت ہوگیا تھا۔مگر ویسٹ بنک ابھی بھی اُس عذاب سے نکل نہیں پایا تھا۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے لوگوں کا بھی کہنا تھا کہ بغیر کسی معقول وجہ کے اسرائیلی فورسز کا وسیع پیانے پر آنسو گیس کا استعمال اور چودہ سال سے کم عمر کے بچوں پر اصلی گولیاں چلانا اسرائیلی حکومت کی شہہ پر ہے۔ایمان کھولتی رہی، گھٹتی رہی۔

اُس کی واپسی ایمنسٹی انٹرنیشنل کے لوگوں کے ساتھ ہو رہی تھی۔انہیں ہیبرون میں رُکنا تھا۔ایمان بھی ساتھ ہی رہی۔ہیبرون ماضی کا الخلیل تھا۔حضرت ابراہیم کا شہر۔بائبل تو یہاں آتی رہتی تھی۔ہاں البتہ ایمان اسے فلسطینی ہوتے ہوئے بھی پہلی بار دیکھ رہی تھی۔یہ کبھی فلسطینی مسلمانوں کی اکثریت کا شہر تھا جسے اسرائیل نے 1967ء کی لڑائی میں بغیر کسی خاص مزاحمت کے قبضے میں کر لیا تھا۔گاڑی کے شیشوں سے منظروں کی تابانی ایمان کا کلیجہ چیرے جاتی تھی۔

''اللہ اتنی خوبصورت وادی جیسے کسی انگلی میں پہنی انگوٹھی میں کوئی نگینہ چمکتا ہو۔''

اس وقت صبح کا سورج اپنی زرنگار کرنیں زردی مائل پہاڑیوں پر بکھیر رہا تھا اور وہ وادی میں داخل ہو رہے تھے۔شہر پستہ قامت پہاڑیوں پر بکھرا دُور تک چلا گیا تھا۔ایمان کو یہاں آکر مزید دُکھ اور کوفت ہوئی۔اتنے خوبصورت شہر میں مسلمانوں کی اکثریت غریبی کی دلدل میں دھنسی پڑی تھی۔کوئی صنعتی یونٹ نہیں تھے۔لے دے کر زراعت کا سہارا تھا۔اس پر بھی پابندیوں کی بوچھاڑ۔قانون زرعی کے مطابق کوئی اسرائیلی لینڈ لارڈ اپنی زمین بغیر

وزیر تجارت کی اجازت کے کسی فلسطینی کو پٹے پر نہیں دے سکتا تھا۔ گویا رزق کے حصول کا ہر دروازہ اُن پر بند کرنے کی کوشش لپیے ہوئے تھا۔

ہیبرون کے مضافات میں داہریا جیل کے باہر دن کا بہت سا وقت ضائع ہوا کہ وہ لوگ اندر جانا چاہتے تھے اور جیل کے حکام یکسر انکاری تھے۔ اور جب وہ ناکام لوٹتے تھے کم و بیش سبھوں کے ہونٹوں پر بکھری ایک بڑبڑاہٹ بڑی واضح تھی۔ انہوں نے ہولو کاسٹ سے کیا سیکھا؟

واپس آ کر مہمانوں کی طرح تین چار دن گھر میں گزارے اور پھر غزہ کیلئے نکل کھڑی ہوئی۔ راستوں کی چیک پوسٹوں پر رُکنے، نوکیلے سوالوں کے جواب دینے اپنی شناخت کے مرحلے کو اب وہ صبر و تحمل سے جھیلنے میں عافیت جانتی تھی۔ بچپنے کے اُس جذباتی دور سے نکل آئی تھی۔ تاہم غزہ تک کے راستے میں اُداسی اور دُکھ تو ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اُسے پائل یاد آئی تھی جو کہتی تھی کہ غزہ اُسے ایک وسیع و عریض جیل کی طرح نظر آتا ہے اور اب وہ خود اپنی آنکھوں سے اُسکا مشاہدہ کرتی تھی۔ بے حس ظالم اسرائیلی پائلٹ گھروں پر بمباری کے بعد جام مسرت نوش کرتے تھے۔

''اف خدایا! اتنی ساری زمین پر قابض ہو کر بھی اُنکا پیٹ نہیں بھرا۔ غزہ کی اِس چھوٹی سی پٹی میں گھسے بیٹھے ہیں۔ اُن کی بستیوں پر ٹپکتی خوشحالی اُس ماحول میں کیسی مکروہ نظر آتی تھی۔

جا بجا دیواریں نعروں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایمان نے سوچا اُسکے چچا کا کہنا ہے فلسطینیوں کو تدبر اور حکمت کی ضرورت ہے۔

جب آپ اتنے بے بس ہوں تو آپکا غصہ آپکے اندر پلتا اشتعال کہیں تو نکلے گا۔ وہ گالیوں کی صورت ہو، دیواروں پر تبروں کی شکل میں بکھرا ہوا ہو۔ اُسکا کوئی بھی روپ ہو

یہ تو فطری امر ہے۔

ہاں البتہ ایک بات خوش آئند تھی۔ ہر گھر شہیدوں کے باوجود پُرعزم اور بلند حوصلہ تھا۔ شفا اسپتال میں دواؤں کی شدید کمی، عملہ ناکافی، فنڈز نہ ہونے کے برابر، مریض اور متاثرین تھوک کے حساب سے۔

وہ دل شکستہ ضرور تھی تاہم ایک اچھی بات یہ تھی کہ اسرائیل کے اندر سے ہی آوازیں اٹھ رہی تھیں، تنظیمیں بن رہی تھیں۔

جب لوٹی تو گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرنے اور کچھ کہنے سُننے کی بجائے وہ سوتی رہی، تکان اُتارتی رہی۔

آرینا نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''ایمان تم بھی عجیب ہو۔ چند دنوں کیلئے آئی ہو اور گھر میں تمہارا ٹکنا محال ہے۔ میں ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی تھی تم سے اور تم لفٹ کروانے کے موڈ میں ہی نہیں ہو۔''

اسکے جواب میں دُکھ سا گھلا ہوا تھا۔ جب اُس نے ماں سے بات کی۔

''ارے مما خدا کا شکر ادا کریں کہ مزے سے گھر میں بیٹھی ہیں اور نہیں جانتی ہیں کہ کیمپوں کی زندگی کتنی کربناک ہے؟ بچوں کے سکول نہیں، ان کے اسپتالوں میں دوائیں نہیں۔ کھانے کو خوراک نہیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ خدا فلسطینیوں کو کس بات کی سزا دے رہا ہے''۔

اور اب تو خیر مستقل واپسی کی نیت سے ہی آئی تھی۔ آنے کے ساتھ ہی وہ ایشو اُس نے یائل اور باپ کے ساتھ شیئر کیا جسے لندن میں اُسے، بشار اور دیگر فلسطینیوں کو مضطرب کر رکھا تھا۔ سوویت یونین کا ٹوٹنا غالباً بیسویں صدی کا ایک اور بڑا واقعہ تھا۔ 1917 کے انقلاب روس کے نتیجے میں بالشویک پروگرام کی کامیابی نے یہودیوں کو خودمختاری کی جو اُمید دلائی تھی وہ سٹالن ازم کے طویل سالوں میں یہود دشمنی کے خوفناک

مظاہروں نے گل کردی تھی ۔سوویت یونین بکھرا تو دس لاکھ سے زیادہ یہودیوں کے سامنے مستقبل ایک خوفناک سوال کی صورت میں کھڑا تھا۔

روسی یہودیوں کو کیا کرنا ہے؟ وہ اسرائیل کے بجائے امریکہ نقل مکانی چاہتے تھے ۔اسرائیلی وزیراعظم یضحاک شامیر کی جان پر بنی ہوئی تھی ۔امریکی صدر پر دباؤ تھا کہ وہ انہیں ویزے نہ دیں ۔اسرائیل کی جانب انہیں دھکیلنے میں اسرائیلی گورنمنٹ کی مدد کریں۔

آپ کی مدد درکار ہے۔آپ کا تعاون چاہیے ۔دنیا کے سامنے ہماری تاریخ کو اپنے نظریات کے ساتھ زمین بوس ہونے سے بچایئے ۔دوستی کے رشتے مظبوط بنانے اور مشرق وسطی میں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے اسرائیلی وزیراعظم نے ہر قربانی کی پیشکش کی تھی ۔اور ساتھ ہی ان مہاجرین کی آبادکاری کیلئے امریکی قرضوں کے حصول کیلئے درخواست تھی۔

یہ وہ خبریں تھیں جو ایمان لندن کے اخبارات سے اپنے ساتھ لائی تھی اور جن سے یائل اور منصور فیملی اور پڑھے لکھے سب فلسطینی آگاہ تھے۔

ڈاکٹر منصور کے پاس اس حوالے سے مزید اہم خبریں تھیں۔

واشنگٹن نے اسرائیلی دباؤ پر روسی یہودیوں کا امریکہ کیلئے کوٹہ پچاس ہزار سالانہ کر دیا تھا۔

وائٹ ہاؤس چالیس کروڑ ڈالر بطور قرض اس ضمانت کے ساتھ جاری کر رہا ہے کہ اسرائیل یہ رقم مقبوضہ علاقوں میں نئی settlements بنانے میں خرچ نہیں کرے گا۔

''اور یہ خبیث اس بات کو سُنے گا۔'' ایمان بولی تھی ۔اور یائل کہتی تھی۔

''کہیں ممکن ہے ۔اب مزید ظلم و ستم کے بازار گرم ہوں گے ۔مجبور اور بے بس لوگوں کی جبری بیدخلی کیلئے بہانے ہوں گے ۔مزید settlements بنیں گی۔''

ایمان کے لہجے میں اضطراب اور بے چینی تھی اور جب وہ کہتی تھی۔لنڈن ٹائمز میں چھپنے والے مضمون نے وہاں فلسطینیوں کو بہت بے چین کر رکھا ہے۔

''اُف''اُس نے دُکھ سے ایک لمبی آہ بھری تھی۔

ابھی حالیہ چند سالوں میں جب میں نے اِن علاقوں کا سروے کیا تھا۔اسوقت تیرہ ہزار چھ سو پچاس ہاؤسنگ یونٹ زیرِ تعمیر تھے۔ذرا سوچیں یہ ہمیں اور کتنا دیس نکالا دینا چاہتے ہیں۔

وہ کڑھتے رہے۔دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے۔

چند دنوں بعد جب ذرا فرصت میں ایمان اپنی ماں کے پاس بیٹھی تو جونئی لہریں گھر کی دنیا میں موجیں مار رہی تھیں اُن سے واقف ہوئی۔باقی تفصیل بھائی نے بتائی کہ امریکہ میں مقیم اُس کے بے حد امیر کبیر چچا ڈاکٹر قاسم جو وہاں کی مقامی سیاست میں بھی خاصے اِن In رہتے ہیں نے اپنے ہم پلہ ایک بڑے امریکی سیاست دان یہودی دوست کے ساتھ مل کر ایک بڑا بینک یروشلم میں کھولا ہے جس کی ایک شاخ حیفہ میں ہے ایک نزارتھ (Nazarath) میں۔

اسرائیل میں ان کے پارٹنر اس کا بھائی اور ماموں ہے۔اُس کا بھائی عرب ڈیموکریٹک پارٹی Arab Democratic Party کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے والا ہے۔عبدالوہاب درویش نے پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور وہ اب اپنی پارٹی بنانے کے چکر میں ہے۔ماموں بھی اب اپنی پارٹی بنانے کا سوچ رہے ہیں۔

اپنے بھائی کے یہ لمبے چوڑے منصوبے سُن کر اُس نے اُسے پہلے تو تنقید کے تیروں سے چھلنی کر دیا۔وہ رسان سے اُس کی جذباتی باتیں سُنتا رہا۔پھر آہستگی سے بڑے ڈپلومیٹک انداز میں بولا۔

اِس جذباتیت کا کوئی فائدہ؟ہاں تمہارے چند اعتراض واقعی بڑے ٹھوس ہیں۔اِن کے

جواب دیئے دیتا ہوں۔

پہلے مدلل اعتراض پر اس نے کہا تھا۔

''میں تمہاری بات سے سو فی صد متفق ہوں کہ اسرائیلی نظام کی بنیاد تو شروع ہی سے برابری پر نہیں ہے اور اس کا امکان مستقبل میں بھی نہیں ہوگا لیکن ایک وقت آئے گا جب وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوں گے۔تھوڑا سا معاشی ترقی کے حوالے بھی دیکھ لیجیے کہ اس کے ثمرات سے فلسطینی عرب بھی مستفید ہو رہے ہیں۔70 کی دہائی میں عربوں اور یہودیوں کی فی کس آمدنی میں دس گنا فرق تھا جو اب صرف تین گنا رہ گیا ہے۔''

اُس کے بھائی کی گفتگو ڈپلومیٹک diplomatic ہی نہیں تھی کاروباری بھی تھی۔وہ دل میں ہنسی اور خود سے بولی۔

''یہ اپنے نانا اور ماموؤں پر گیا ہے۔پکا پکا بزنس مائنڈڈ business minded''۔

اُس کا ننہال تو خیر سدا سے چڑھتے سورج کو پوجنے والا تھا ہی کہ اُس کا پرنانا برٹش اور فرانسیسی حکومتوں اور سفیروں کا ہر دل عزیز دوست تھا۔نابلوس والے قلعہ نما گھر میں یہ لوگ کبھی ویک اینڈ week end اور کبھی چھٹیاں منانے جایا کرتے تھے اور اُس کے پرنانا کی عرب مہمان نوازی اور عنایات سے لطف اندوز ہوتے۔یوں کہنے کو اُس کا پردادا یوسف ضیا بھی غیر ملکیوں کیلئے بہت پسندیدہ تھا مگر سوچ او نظریے میں فرق تھا۔

اس کے نانا نے 1965ء میں لیبر پارٹی کو جوائن join کیا تھا اور باقاعدہ کنیسٹ Knesset کا ممبر بنا۔اجلاس میں شرکت کیلئے کئی بار اُس کے والد ڈاکٹر منصور نے انہیں کنگ جارج سٹریٹ یروشلم میں اُس بلڈنگ میں بھی ڈراپ drop کیا تھا جو فرومین Froumine فیملی نے اپنی ذاتی رہائش اور کاروبار کیلئے بنائی تھی اور جس نے تقریباً سولہ سال تک (اسرائیلی پارلیمنٹ) کنیسٹ Knesset کا کردار ادا کیا تھا۔

اُس کے دادا ڈاکٹر موسیٰ اور پر دادا یوسف ضیا کے اعتراضات پر وہ ہمیشہ کہتا۔

''دیکھو ان کے اندر بیٹھ کر آواز اٹھانا اور انہیں بتانا کہ وہ کہاں غلط ہیں؟ بہت بڑا کام ہے اور اس کام کو مسلسل کرنے کی ضرورت ہے۔عرب حکومتوں سے کچھ اُمید مت رکھو۔''

رفاہی کاموں میں بہر حال اُس کے پر نانا اور نانا دونوں کا کردار قابل مثال اور قابل تقلید تھا۔انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں جب یروشلم میں یورپی مما لک خیراتی اسپتال، مشن سکول اور زائرین کیلئے سرائے بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جارہے تھے انہوں نے یروشلم کے علامی حسینی اور خالدی خاندانوں کے ساتھ مل کر مدرسے اور خانقاہیں بنائیں۔

دو تین دنوں سے وہ ''الاہرام'' کیلئے لکھنے کا سوچ رہی تھی۔اُٹھی کہ چلو کچھ لکھنا شروع تو کروں۔

یشار کا پرسوں فون تھا کہ وہ چند ہی دنوں میں اقوام متحدہ کی طرف سے باقاعدہ متعین ہو کر یروشلم آنے والا ہے۔

یشار کے خاندان کی داستان بھی بڑی المناک تھی اُس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا تو ظالموں نے پتہ ہی کاٹ دیا تھا کہ ان کا تو فلسطین سے اب کوئی ناطہ ہی نہیں تھا۔خاندان تو بیچارہ جان بچانے کیلئے کیمپوں میں بھاگا تھا۔کیمپوں کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے انہوں نے دمشق جانے کا سوچا کہ وہاں اُس کے چچا کا گھر خالی پڑا تھا۔خیال تھا کہ جونہی حالات میں کچھ بہتری آئی وہ واپس آجائیں گے مگر یہاں اسرائیلیوں کی نام نہاد مردم شماری کے قواعد وضوابط دُنیا سے نرالے تھے۔

یشار کا وطن سے یوں محروم کئے جانے کا دُکھ اور کرب اُسکی گفتگو کو ہمیشہ اُس وقت جذباتی کر

جاتا جب فلسطین زیرِ بحث ہوتا ایمان اس الیے بابت بشار سے اپنی دوسری ملاقات میں ہی سب کچھ سُن چکی تھی۔ خس کم جہاں پاک۔ انہیں تو یہی چاہیے تھا۔ صدیوں پرانی قومیت جائے بھاڑ میں۔

بشار کا لہجہ کیسا دُکھی سا تھا؟ یہودی تنظیموں جن میں سرفہرست جیوش نیشنل فنڈ ہے۔ ان کی حرامزدگیوں کا احوال بندہ کیا سنائے؟ انہیں قانوناً اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر کسی غیر یہودی کے پاس ایک چپہ زمین فروخت نہیں کر سکتی۔ یہ زمین دنیا بھر کے یہودیوں کیلئے ہے۔ جو جب چاہیں اسے خرید سکتے ہیں۔

پہلا تقاضا تو یہی کہ جن کی زمین تھی سب بیدخل اور جن کا کوئی واسطہ ناطہ نہیں اُن کیلئے حاضر۔ اب عربوں کیلئے تو امتیازی قوانین کی ایک لام ڈور ہے۔ تیز دھار والے چھروں جیسے قانون جو اُن کی جب اور جس وقت چاہیں گردنیں کاٹ دیں۔

1950ء میں وہ سارے فلسطینی لوگ جو جانیں بچانے کیلئے گھروں کو چھوڑ گئے۔ ان کے گھر ہتھیا لیے گئے۔ پھر کسی بھی سرکاری کام کیلئے جب اور جس وقت چاہے جگہ قابو کرلو۔ کوئی داد کوئی فریاد نہیں۔ اب اس پر لے دے تو ہوئی کہ یہ تو نری قانون کی آڑ میں ڈاکہ زنی ہے مگر سُنے کون؟ یہاں ہر قانون ہر قاعدہ اُن کی اپنی خواہشات کے تابع ہے۔

اور بحر روم کے ایک ساحلی گاؤں الفردوس کے کسان کی کہانی بھی اُس نے بشار سے ہی سُنی تھی۔ ابوعبداللہ کی زمین جس پر وہ کاشت کرتا پھل اور سبزیاں اگاتا تھا۔ جدّی پشتی تھی۔ پڑتال افسر نے ایک دن آکر جانچ پڑتال کی اُسے بلایا اور کہا کاغذات کے مطابق یہ زمین سرکار کی ہے۔

ابوعبداللہ نے کہا۔

''سرکار کہاں سے ٹپک پڑی۔ میرا باپ، میرا دادا، پردادا اسی زمین کے مالک اور

کاشتکار تھے۔ابھی اسرائیلی مملکت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔برطانیہ کی ٹوٹی پھوٹی چھتر چھاؤں تھی۔

وہ اردگرد کے خطرات میں گھرا زندگی بسر کرتا رہا۔اسکا بیٹا جوان ہوا اور ابوجبیر بنا۔

ایکدن اُسے ضلعی عدالت سے حاضری کا سمن آیا۔

''تم جانتے ہو تمہاری زمین کا 60% رقبہ چٹانی ہے اور اس لیے یہ زمین سرکاری ملکیت ہے۔''اُس نے اونچی آواز میں احتجاج کیا۔

''حضور والا کو غلط فہمی ہوئی ہے۔میں اس پر ٹریکٹر سے کاشتکاری کرتا ہوں۔اسکا تھوڑا سا حصہ ضرور چٹانی ہے مگر وہاں میں انجیر انگور اور زیتون اگاتا ہوں۔میرے ساتھ میرے بچے بھی اِس پر کام کرتے ہیں میں اِس کے چپے چپے سے واقف ہوں۔''

چند مزید چکروں کے بعد اُسے فیصلہ سنادیا گیا۔زمین کا ساٹھ فیصد حصہ بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔

بوڑھے ابوجبیر نے اپنا کھونٹا زمین پر مارا اور بولا جس ملک کی بنیاد انصاف پر نہیں اُس کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔

اور ایمان کو محسوس ہوا تھا جیسے اِس بات نے اُسے جذباتی حوصلہ اور تقویت دی ہے۔کہ اسرائیل اپنے انجام کو بہت جلد پہنچ جائے گا۔

دنوں بعد جب اُسنے یہ بات یشار سے کی تو وہ ہنسا انجام کو تو ضرور پہنچے گا مگر کب؟ یہ فیصلہ تو قدرت کا ہے۔

اگلے چند دن مصروفیت میں گزرے۔ایک دو دن بائل کے پاس جاتی رہی۔ایک پورا دن مضمون کے پیچھے رہی۔ڈاکٹر منصور آج ہی جرمنی میں ہونے والی ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کیلئے گئے تھے۔انہیں رخصت کرنے تل ابیب بھی گئی۔

رات سونے کیلئے لیٹی تو جسم میں عجیب سی توڑ پھوڑ کا سا احساس ہوا۔سوچا شاید تھک گئی ہوں۔سونے کے دوران بھی وہ اپنے وجود میں بے چینی اور اضطراب سا محسوس کرتی رہی۔کچھ نیند کا غلبہ کچھ تھکن و تھکاوٹ کی غنودگی۔

صبح دم آنکھ کھلی تو محسوس ہوا جیسے وہ نزع کی سی کیفیت میں ہو۔جسم بھٹی کے دانوں کی طرح بُخار میں بھُن رہا تھا۔اعظاء یوں اکڑے ہوئے تھے جیسے لوہے کے سریئے ساتھ میں جوڑ دیئے گئے ہوں۔اُس نے حرکت کی کوشش کی پر اُس کی چیخیں نکل گئیں۔

خادمہ نے آرینا کو اطلاع دی وہ بھاگی۔ڈاکٹر موسیٰ حیفہ میں تھے۔اُس نے پائل کو فون کیا۔وہ فوراً اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ آ گئی۔چیک کیا،دوائی دی مگر صرف دو گھنٹے بعد ہی آرینا کی آنسوؤں میں گھلی آواز اُسے مضطرب کر گئی کہ ایمان بہت اذیت میں ہے۔

''میں ایمبولینس اور ڈاکٹر بھیج رہی ہوں۔آپ فوراً اسپتال بھجوائیں۔''

Saare Zedek میڈیکل سینٹر یروشلم کا سب سے پرانا ہسپتال اُن کے گھر سے کوئی چار کلومیٹر پر تھا۔ماؤنٹ ہرزل کی مشرقی سمت۔سڑکوں اور چوکوں میں رش بھی کچھ اتنا زیادہ نہ تھا پر آرینا کو لگتا تھا جیسے درمیان میں کوسوں میل کا فاصلہ ہو۔بیٹی کی اذیت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

پائل اس وقت فینا ہیلر فلور Fanya Heller Floor کی ایمرجنسی کے سامنے ان کے انتظار میں کھڑی تھی۔فی الفور سینئر ڈاکٹر اس کے بلاوے پر اکٹھا ہو گئے تھے۔یوں بھی وہ ڈاکٹر منصور کی بیٹی تھی اور منصور اسی اسپتال کے سینئر ترین ہارٹ سرجن تھے۔

ڈاکٹروں نے چیک کیا۔تبادلہ خیال ہوا۔یہ ٹیسٹ وہ ٹیسٹ کے مرحلے شروع

ہو گئے۔ وہ بڑی جی دار لڑکی تھی۔ تکلیف کی شدت انتہا پر تھی پر ہونٹوں سے سی کی آواز نہیں نکلنے دے رہی تھی۔

آرینا کے فون کرنے پر ڈاکٹر موسیٰ بھی حیفہ سے آ گئے تھے۔ اِس وقت پوتی کے بیڈ کے پاس کھڑے سمجھ نہیں پاتے تھے کہ اُس کا درد کیسے بٹائیں؟ ساری عمر مرض اور مریضوں کے ساتھ گزری تھی یہ تکلیف کیسی تھی؟ جو دوائی بھی دی جا رہی تھی اُس کا رتی برابر اثر نہیں تھا۔

اُس کی آنکھوں کے کونوں سے کرب قطروں کی صورت بہتا تھا۔ پورے بارہ گھنٹے گزر گئے تھے اور حالت میں رتی برابر فرق نہیں تھا۔ چند ٹیسٹوں کے نتائج بھی وہ نہیں تھے کہ جس بیماری کے خدشے کے پیشِ نظر یہ کروائے گئے۔ اذیت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جسم کو حرکت دینے سے معذور ہو چکی تھی۔

اور یہی وہ لمحے تھے جب اُس کے اندر نے کائنات کے رب سے کہا۔

''پروردگار میں بہت اذیت میں ہوں۔ کیا ایثار میرا مسیحا بن کر نہیں آ سکتا؟''

کیسا لمحہ تھا وہ۔ اُس کا وجود جیسے عبودیت کا پیکر بن کر خدا کے حضور مجسم ہو گیا تھا اور وقت شاید اسی انتظار میں تھا کہ کب الفاظ اُس کے ہونٹوں سے نکلیں اور کب وہ اُسے کسی معجزے کی صورت قبولیت کا شرف بخشیں۔

جس وقت ڈاکٹر موسیٰ، ڈاکٹر پائل اور یروشلم اسپتال کے تین بڑے ڈاکٹر اس پریشانی میں گم کھڑے تھے کہ کون سی پین کلر Pain killer اُس کا درد کم کر دے تاوقتیکہ اہم ٹیسٹوں کا رزلٹ آ جائے۔ ڈاکٹر ایثار کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہاں موجود صرف پائل اُسے جانتی تھی یا بیڈ پر لیٹا وہ مریض جو اُس کی آمد کیلئے دعا گو تھا اور اس کی مسیحائی کا منتظر بھی۔

اُس کی آنکھیں جیسے بے یقینی کی دھول سے اٹی پڑی تھیں۔

''کیا دُعا میں اتنی طاقت تھی کہ وہ آنکھ جھپکتے ہی بار آور ہوگئی۔''

ان اذیت زدہ لمحات میں بھی خود سے اُس کا مکالمہ تھا۔

پائل کے پاس آکر وہ رُکا۔دونوں کے درمیان اپنائیت سے بھری نظروں اور الفاظ کا تبادلہ تھا۔پائل نے اس کا تعارف دوسرے ڈاکٹروں سے کروانے کے ساتھ ایمان کے بارے میں بھی بتایا۔یثار آگے بڑھا۔پیروں کے ناخنوں سے شروع ہو کر اُس کے سر،گردن اور اُس کی پُشت کوٹٹولتے ہوئے جب اُس نے اُس کا سر نہایت آرام سے بیڈ پر رکھا تو سر سیدھا کرتے ہوئے اُس نے پائل کو دیکھا۔

''بہت خطرناک مینجائٹس کا اٹیک attack ہے۔''

ایک پَل کیلئے ڈاکٹروں نے اس کی رائے سُنی ۔دو نے بحث کی ۔علامات کا حوالہ دیا۔اُس نے بس اتنا کہا

''رپورٹ آنے دیں آپ میری تشخیص کے خود قائل ہو جائیں گے۔''

پائل سے کاغذ لے کر چند دوائیں اس پر لکھیں اور فوراً منگوانے کا کہا۔یہ بات کچھ قواعد کے خلاف بھی تھی مگر چونکہ ڈاکٹر پائل کا کیس تھا لہٰذا وہ خاموش رہے۔علاج شروع ہوا۔

اُس نے آرینا سے کہا۔

''آپ گھر جایئے اور خدا سے اس کی زندگی مانگیے ۔یہ اگر بچ گئی تو خدا کا معجزہ ہوگا۔''

اگلے دن رپورٹیں آئیں ۔ڈاکٹروں نے فوراً انہیں دیکھا۔ڈاکٹر یثار البشر کی تشخیص سو فی صد درست تھی۔دو ڈاکٹر یہودی تھے اور تیسرا عیسائی اور وہ حیران تھے۔رپورٹس کے رزلٹ ڈاکٹر یثار البشر کی تشخیص سے ذرہ بھر مختلف نہ تھے اور یہ تینوں ڈاکٹروں کیلئے

حیرت کی بات تھی۔ دو امریکن اور تیسرا برٹش تھا۔ کہیں انیسویں صدی کی وسطی دہائی میں بننے والے یروشلم کے اِس اسپتال کا بیشتر عملہ غیر مُلکی تھا۔ ساری فنڈنگ Funding باہر کی تھی۔ معیار کے اعتبار سے یہ کسی طرح بھی لندن، واشنگٹن یا نیویارک کے بہترین اسپتالوں سے کم نہ تھا۔

تین ڈاکٹروں سے یہ بات اگلے دو دنوں میں پندرہ ڈاکٹروں تک پہنچی۔ اسپتال میں چند اور اہم پیچیدہ کیسز بھی تھے۔ ایک وزیر تجارت مفحاک لیوی کا تھا۔ یشار نے اپنے اسی مخصوص انداز میں چیک کرنے کے بعد تشخیص کر دی اور یہ تشخیص سوفی صد صحیح تھی۔

ایمان کو خدا نے نئی زندگی دی تھی۔ ڈاکٹر منصور بے حد نفیس اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ اسپتال کے عملے میں بہت ہر دل عزیز۔ اُن کی بیٹی کو روبصحت دیکھ کر بھی خوش تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر یشار مشہور ہو گیا تھا۔

سبھی ڈاکٹر حیرت زدہ تھے۔ سینئر ڈاکٹروں کا پورا پینل Panel اُس کے ساتھ گفتگو میں شامل تھا اور خوش شکل مہذب سا یشار ہنستے ہوئے انتہائی عاجزانہ اور مودبانہ انداز میں انہیں بتاتا تھا کہ اُسے تو اس کا کبھی اندازہ ہی نہیں تھا۔ بس ایسے ہی مریض کے جسم پر انگلیاں پھیرتے پھیرتے جب ہاتھ سر تک پہنچتے ہیں تو جیسے وجود کی حسیات میں جل بجھ جل بجھ سا ہونے لگتا ہے اور مرض سامنے آ جاتا ہے۔

ڈاکٹر جیسن ویسٹ نے اُٹھ کر اُس کے ہاتھوں کو پکڑا۔ اُس کی انگلیوں کی پوروں کو باریک بینی سے دیکھا۔ کہیں کچھ خاص نہ تھا۔

اور پورے ہفتہ بعد جب ایمان گھر آئی اُس نے کہا تھا۔

''میری بیماری دراصل تمہیں یروشلم کے ڈاکٹروں میں مشہور کرنے کیلئے آئی تھی۔''

وہ ہنسا۔ ''شکر کرو بچ گئی ہو۔ یہ خطرناک ترین قسم تھی اِس بیماری کی جس میں ڈاکٹروں کو پتہ ہی نہیں چلتا اور مریض پار ہو جاتا ہے۔''

اس کے گھر آجانے پر آرینا نے فوراً ڈاکٹر موسیٰ کو اطلاع دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ دونوں اگر آجائیں تو اچھا ہوگا۔ ڈاکٹر یشار نے ایمان کیلئے پرپوزل دیا ہے۔ ایک طویل خط ڈاکٹر منصور کو بھی لکھا۔

اُس کے لیے بستر پر لیٹنا کتنا دشوار تھا؟ زندگی اتنے سارے دکھوں اور غموں کے باوجود کتنی حسین تھی اس کا اندازہ تو اُسے بستر مرگ پر ہوا تھا۔ آرینا کی بہت کوشش تھی کہ وہ ان دنوں اخبار نہ پڑھے۔ کوئی پریشان کن خبر اس کی نظروں سے نہ گزرے۔ شاید اسی لیے اُس نے فرانسس ماریش کا تاریخی ناول غابتہ الحق اور سفرنامہ یروشلم کی قدیمی لائبریری سے منگوا کر اُس کے سرہانے رکھ دیئے۔ انگریزی کا اخبار ''دی فلسطین پوسٹ'' جواب ''یروشلم پوسٹ'' بن گیا تھا۔ عربی اخبارات الاہرام، الاتحاد اور عبرانی کا میرو maariv تو زمانوں سے آتے تھے۔ حیفہ والے گھر میں تو یروشلم پوسٹ کا فرنچ ایڈیشن French Edition بھی آتا تھا۔ آج کل یہ اخبار آرینا کی سینسر شپ کے بعد ایمان کے کمرے میں جاتے تھے۔ پتہ نہیں کیسے الاہرام کا یہ صفحہ اس تک پہنچ گیا۔

مزاحمت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اُس کی سنگینی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اسرائیلی مملکت کی ہواؤں اور فضاؤں میں دہشت اور خوف وہراس کے رنگ اتنے نمایاں ہیں کہ بہت سے یہودی تارکین وطن نے سرکردہ رہنماؤں کو لعن طعن کرنا شروع کر دیا ہے کہ انہیں بلاوجہ اپنی جگہوں سے اُکھاڑ کر یہاں لائے جہاں اُن کا اور اُن کے بچوں کا سکون غارت ہو کر رہ گیا ہے۔ روسی یہودیوں کو اسرائیل لانے کیلئے حکومت نے بہت گندے کھیل کھیلے ہیں۔

اسرائیلی فوجی ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ نوعمر لڑکوں کو پکڑ کر لے جاتے اور اُن پر اِس درجہ تشدد ہوتا کہ وہ ختم ہو جاتے یا ان کے اعضائے رئیسہ ناکارہ کر دیئے جاتے۔ خود اسرائیل کی ہیومن رائٹس Human Rights تنظیموں کی رپورٹیں تھیں کہ فوجی ان کے سر اور دل کا نشانہ لیتے ہیں۔ غیر مُلکی تنظیموں کے نمائندوں کو ان علاقوں میں جانے سے روکا جاتا ہے۔

بہت سے بچوں کے بارے میں ان کے والدین کے انٹرویو تھے۔ روتی آنکھوں اور روتے دلوں والے ماں باپ جو اپنے بچوں کے بارے میں جانتے ہی نہیں تھے کہ وہ کہاں ہیں؟

اِن دنوں وہ عرب کلاسیکل شاعروں کا کلام بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی کے شہرہ آفاق گلوکاروں اور حال کے اچھے گائیکوں کی زبانی سُنتی تھی۔ احمد شوقی اور نزار قبانی کی شاعری کی خوبصورتی اور گہرائی نے بہت متاثر کیا تھا اور یہ سب اُس فراغت کی وجہ سے تھا جو اگرچہ تکلیف دہ تو ضرور تھی مگر جس نے زندگی کی چند رعنائیوں کو اُس پر آشکارہ بھی کیا تھا۔

آج کی اِس صبح بھی وہ اُس صوفے پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی جہاں کبھی محمود درویش بیٹھا تھا۔

پورا کمرہ اُمِ کلثوم کی مدھر آواز کے مسحور کن تاثر سے جیسے بھرا ہوا تھا۔ آواز کو بہت مدھم تھی۔ ''انا من انتظارک'' کی بار بار تکرار ہوئے جاتی تھی۔ پردہ ہاتھوں میں تھامے کھڑا ڈاکٹر بشارتذبذب میں تھا کہ آگے بڑھے یا پیچھے پلٹ جائے۔ جب دفعتاً بند آنکھیں کھلیں۔ پردے کے نچلے کناروں سے جھانکتے شناسا سے جوتے دل میں ہلچل سی مچا گئے۔ شگفتہ سا لہجہ اُبھرا۔

''ڈاکٹر یشار باہر کیوں کھڑے ہیں؟ اندر آیئے نا۔''

یشار نے قدم اندر رکھتے ہوئے کمرے کی بے حد مسحور کن اور رومانوی سی فضا کو محسوس کیا، ہنسا اور بولا۔

''مزے میں ہو۔''

''غم دُنیا کو آج کل بھول رہی ہوں۔''

''صحت مند رجحان ہے۔ ہاں دیکھو اُس نے گارجین اُس کی طرف بڑھایا۔ تمہارے مضمون پر بہت مثبت تنقید ہوئی ہے، بہت پسند کیا گیا ہے۔''

ایمان نے اخبار پکڑا اور بغیر دیکھے اُسے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

Peace Process کو میں نے عبرانی میں ترجمہ کروا کے میرو ''Maariv'' میں چھپنے کیلئے بھیج دیا ہے۔''

''یشار میرے خیال میں حامودیا Hamodia میں بھیجنا چاہیئے تھا۔ لیفٹسٹ کی وجہ سے وہ زیادہ لبرل Liberal ہے۔''

''فکر مت کرو۔ دیکھنا اسی میں چھپے گا۔ اس کی ریڈر شپ readership بہت زیادہ ہے۔''

اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''ہاں اب کیسا محسوس ہوتا ہے۔ طبیعت اور بہتر ہو جائے تو عبرانی سیکھنے پر توجہ دو۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ کتنے دنوں بعد ایسی ہنسی اُس کے ہونٹوں پر بکھری تھی۔

''خدا نے مسیحا بھیج دیا تھا۔ بس بچ گئی ہوں۔''

''تم جیسی دلیر اور بہادر لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں کچھ ٹھیک نہیں لگتیں۔ میں تو

تمہارے حوصلے سے متاثر ہوا ہوں۔اتنی جری اور جی دار لڑکی میں نے اپنی اب تک کی پیشہ ورانہ زندگی میں نہیں دیکھی۔"

پھر چند ہدایات تھیں دوائی اور کھانے پینے کے بارے میں اور ساتھ جانے کی اجازت بھی کہ ہیرون اسپتال جانا تھا۔

''ہرگز نہیں چائے کافی کے بغیر کیسے؟''

اُس نے لیلیٰ کو آواز دی۔

اور جب وہ چائے پیتے تھے اُس نے ڈاکٹر منصور کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ کب آنے والے ہیں؟

قاسم چچا کے پاس گئے ہوئے ہیں آج کل۔میرے بارے میں تو اطمینان ہو گیا ہے کہ بیٹی نے موت کو بھگا دیا ہے۔قاسم چچا کے چھوٹے دونوں بیٹے بہت پیار کرتے ہیں اُن سے۔تمہیں تو یاد ہوں گے بیثار۔شیطان کے چیلے۔''

بیثار ہنس پڑا تھا۔اُسے اُن کے ساتھ اپنی ملاقات یاد آ گئی تھی۔

دونوں لڑکے ایمان سے ملنے لندن آئے ہوئے تھے۔دونوں بھائی بڑے تھرل سیکر سے تھے۔ایک دن گٹار ہاتھوں میں پکڑے ڈاؤن ٹاؤن down town چلے گئے۔وہاں جنکیز (Junkies) کے ایک ٹولے سے مل کر گلا پھاڑتے رہے۔دن بھر کی خجل خواری کے بعد رات گئے گھر آئے تو جیبوں میں سات پاؤنڈ کی ریزگاری تھی۔

''ہماری رزق حلال کی کمائی''۔

دونوں نے جیبیں تھپتھپائیں۔

وہ بھی اتفاقاً اُس دن ڈنر پر ایمان کے ہاں مدعو تھا۔

کھانے کی میز پر ایمان اُسے بتاتے ہوئے اُن سے بھی مخاطب ہوئی تھی۔

''ذلیلو تمہارے باپ کو اگر پتہ چل جائے تو جانتے ہو حشر کیا ہوگا تمہارا؟''

''ارے چھوڑو ایمان اختی (آپی)۔ ڈیڈی کی تو اپنی ساری جوانی ایسی ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی گزری ہے۔ انہوں نے ہماری کیا کلاس لینی ہے؟''

باب نمبر: ۴۰

ضد، غصے اور ہٹ دھرمی کی تنی ہوئی رسی پر کھڑی تھی۔ سادگی، کفایت شعاری جیسے الفاظ کا ورد زوروں پر تھا۔ گھر کی فضا پر تھوڑا سا کھچاؤ ضرور تھا۔ تا ہم اِسے قابل توجہ نہیں سمجھا جا رہا تھا اور نہ ہی اسے کوئی اہمیت دی جا رہی تھی۔

امریکہ سے قاسم اپنی بیوی بچوں سمیت آرہا تھا۔ اسکا پہلا فون منصور اور آرینا کو تھا کہ" دور پار کے سب رشتہ داروں کو اکٹھا کرو۔ بہت مدت ہوگئی ہے ملے ہوئے"۔

آرینا کا لہجہ بڑا شکایتی تھا۔

"ارے قاسم ہمارا تو نتھنوں میں دم کر دیا ہے۔ روز کلاس لینے بیٹھ جاتی ہے۔ دس بار دن میں لکچر پلاتی ہے۔ فلسطین جس اذیت سے گزر رہا ہے اُس کا کیا ہمیں احساس نہیں؟ درد کا یہ سارا ٹھیکہ لگتا ہے اُسی نے لے لیا ہے۔"

قاسم نے جواباً کہا تھا۔

"میرا بتائیں اُسے کہ مجھے ہلّے غلّے کی خواہش ہے اور یہ سب میں چاہ رہا ہوں"۔

دوسرا فون پائل کو تھا۔ فون شامیش نے اٹھایا تھا۔ اسکی خیریت پوچھنے اور تھوڑی گپ شپ کے بعد اُس نے کہا تھا۔

"ماں کو بلاؤ"

شامیش نے رسیور ہاتھ میں پکڑے پکڑے آواز لگائی تھی اِمّی (Emi) (عبرانی میں ماں) قاسم ڈوڈ (عبرانی میں ماموں چچا) (DOD) کا نیو یارک سے فون ہے۔ جلدی آئیں"۔

اس وقت وہ ناشتہ بناتی تھی۔صافی سے ہاتھوں کو صاف کرتے بھاگتی ہوئی آئی۔

ہیلو ہائے اور خیر و عافیت پوچھنے کے بعد ''ہاں تو کب آرہے ہو؟

''یائل اہوتی (میری آپی) اُس گدھی کو سمجھائیں کہ فلسطین ہمیشہ ہماری ترجیحات میں ہوتا ہے پر نجی خوشیوں پر بھی تھوڑا سا حق ہے۔چلو اِس بہانے بچوں کا بھی ملنا ملانا ہو جائے گا''۔

اُسے تسلی دیتے ہوئے جب یائل واپس کچن کی طرف جاتی تھی۔اُسکی آنکھیں بھیگنی شروع ہوگئی تھیں۔اُسے ایڈمنڈ یاد آیا تھا۔اپنا بے حد پیارا اور لاڈلا بھائی۔وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ کیا انسان اتنا بدل سکتا ہے؟خونی تعلق کی بے نیازی اس حد تک ہوسکتی ہے۔ممی کے دل کا ٹکڑا، ڈیڈی کی جان و جگر۔سچی بات ہے مجھے تو یروشلم کے ایک کمرے میں رکھ کر بھول گیا ہے۔اُسے کچھ بھی یاد نہیں کہ بہن کس حال میں ہے؟

پر ڈینا کی موت پر وہ آیا تھا پر کیسے؟جیسے مہمان آتے ہیں۔دو دن گزارنے مشکل ہوگئے تھے۔اُسکی آئرش بیوی نے ٹیلی فونوں کی ڈاک بٹھا دی تھی۔

''وہ ایسا تو نہیں تھا''بڑبڑاتے ہوئے وہ خود سے مخاطب تھی۔

''تو یہ اُسکی آئرش بیوی کی وجہ سے ہے۔جو اُسے جونک کی طرح چمٹی رہتی ہے۔پر ایسا بھی کیا!کیا وہ خود عقل سے پیدل ہوگیا ہے؟پھر جیسے تاسف کی منہ زور لہریں تھیں جو واقعات کے سلسلوں کو اُچھالتی ایک کے بعد ایک اُس کے سامنے لاتی جارہی تھیں۔

قاسم میرا ماں جایا نہیں مگر ماں جایوں سے بڑھ کر ہے۔کتنا مان دیتا ہے؟

ابراھیم ایلان کے گولی لگنے کی خبر اُسے جس شام ملی تھی پہلا فون اُس نے ایڈمنڈ کو کیا اور دوسرا قاسم کو۔ایڈمنڈ نیویارک میں تھا اور قاسم لاس اینجلس میں جو امریکہ کے دوسرے سرے پر ہے۔مگر وہ اسپتال آگے پیچھے ہی پہنچے تھے۔ایڈمنڈ نے چند سوال پوچھنے

کے بعد خاموشی اختیار کر لی تھی۔قاسم نے یائل کا اُجڑا چہرہ اور متورّم آنکھیں دیکھیں اور بے اختیار اپنے پھیلے بازوؤں میں اُسے سمیٹ لیا تھا۔اُسکے سینے سے کیا لگی یائل کا ضبط جواب دے گیا ۔اُس سے پورے آٹھ سال چھوٹا پل جھپکنے میں اُس کا بڑا بن گیا تھا۔اُس کے بالوں کو چومتے ہوئے اُس کے انداز میں کیسی ممتا بھری شفقت تھی۔

اُسکے بعد کے سارے معاملات قاسم کی دردسری تھے۔پوسٹ مارٹم کا ہونا ۔پولیس کو بیانات اور اس سے نپٹنا۔یائل ہیجان زدہ کیفیت میں تھی۔پھٹ جانا چاہتی تھی۔اخباری نمائندوں کی اسپتال اور گھر پر یلغار تھی۔وہ مشتعل تھی۔گلا پھاڑ کر چلاّنا چاہتی تھی۔سب کچھ جو اُس کے اندر تھا اُگل دینے کیلئے بیتاب تھی۔وہ ابراھم ایلان کی قاری ہی نہیں اُس کی ناقد بھی تھی۔

اس کے تمام مضامین جو واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے کی حیثیت سے اس اخبار اور اس کے فرضی ناموں سے مختلف ریاستوں سے نکلنے والے روز ناموں اور ویکلی weekly پرچوں میں شائع ہوتے تھے جن میں ڈھکے چُھپے لفظوں میں نہیں بلکہ واشگاف انداز میں مُلکوں کی منافقانہ سیاست،حکمرانوں اور ان کے کارندوں کے دوغلے کرداروں کو زیر بحث لانا اور انہیں ثابت کرنے میں اُسے جو کمال حاصل تھا اُسے آسانی سے ہضم کرنا مشکل تھا۔یائل دلیر اور جی دار تھی مگر کبھی کبھی اس کی تیز کاٹ سے پریشان بھی ہو جاتی تھی۔اُسے ملنے والی خوفناک قسم کی دھمکیوں پر وہ گھبرا کر کہیں ضرور کہتی۔

''ابراھم جان کے دشمن نہیں بنو۔ہاتھ ہولا رکھو۔''

''یائل جی'' وہ اُس کی آنکھوں کو والہانہ انداز میں چومتا۔

''عمر تو میری لمبی نہیں پھر ارمان پورے کرنے دو۔''

فلسطین کے حالات نے یائل کو چھوٹی عمر ہی سے سیاسی آگہی کا شعور دیا تھا۔ایک

سیاسی جرنلسٹ کی رفاقت نے اُسے جلا دی۔ اکثر فارغ اوقات میں اُس کا محبوب مشغلہ اُس کی پرانی فائلوں کا مطالعہ اور باغبانی تھا۔ کبھی کبھی حیرت انگیز انکشاف چونکا تے بھی تھے یہ ایک ایسی ہی رپورٹ تھی۔

جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر اسرائیل کے دستخط نہ کرنے پر اس کے دوہرے کردار پر لکھتے اور اُسے اعتراضات کے کٹہرے میں کھڑے کرتے ہوئے سوال اُٹھائے گئے تھے کہ آخر اسرائیل نے بغداد کے نزدیک واقع OSIRAK میں عراق کے جوہری تحقیقاتی مرکز کو تباہ کر کے عراق کو انتہا پسند بننے کا موقع فراہم کیوں کیا؟ OSIRAK کا یہ مرکز پوری عرب دُنیا میں اعلیٰ ترین تحقیقاتی ادارہ تھا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ عراق کو سپلائی کرنے والی فرموں کے اہم فرانسیسی اور اطالوی اہلکاروں کے گھروں اور دفاتر پر بم دھماکوں اور عراقی جوہری توانائی کمیشن کیلئے کام کرنے والے ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر یحییٰ مشاد کو پیرس ہوٹل میں مروا دینے والے اسرائیلی خفیہ ایجنٹوں کے سوا کوئی اور بھی ہو سکتے ہیں۔

تو اب لبنان کی خانہ جنگی میں صدام کی مداخلت، فلسطینیوں کیلئے اسلحے کی امداد، دہشت گردوں کی پشت پناہی اور جوہری ہتھیار بنانے کیلئے خفیہ منصوبے اور تگ و دو تو ان کا ذمہ دار اسرائیل ہے۔ جو خطے میں پولیس مین کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اسرائیلی لیڈر اور حکمران کتنا جھوٹ بولیں گے؟ 1960ء سے تو بولتے چلے آ رہے ہیں کہ اسرائیل کے پاس کوئی جوہری ہتھیار نہیں۔

یہ 1986ء کے وہ دن تھے جب نیویارک میں خزاں بکھری ہوئی تھی۔ درختوں کے پتے اپنے رنگ بدلتے تھے اور رائل ناشتے کی میز پر بیٹھی لیونگ روم کے شیشوں سے باہر لان میں کھلے میری گولڈ Mari gold، لیونڈر ڈیزی Lavender Daisy اور زرد

للی پھولوں کے رنگوں کو دیکھتی ۔ان کے معصوم حُسن سے لطف اندوز ہوتی ۔ابراھم کیلئے کافی بناتے ہوئے کہتی تھی ۔

''میں تمہیں مصلحتوں کے ساتھ سمجھوتوں کا تو کبھی نہیں کہتی کہ یہ تو میرے اپنے مزاج کے خلاف ہے ۔تاہم تھوڑی سی احتیاط تو ضروری ہے ۔گریبانوں میں ہاتھ ڈال کر ان کی گردنوں پر سیدھی چھریاں چلاؤ گے تو معاملہ بگڑ سکتا ہے ۔''

ایلان نے کافی کا بڑا سا سِپ لیتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا ۔

''یائیل تم روایتی عورت نہیں بنتی جا رہی ہو۔ارے ہاں ڈارلنگ موِرڈیکائی وانونوکل رات ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے ۔خوب گپ شپ ہوگی ۔

''ڈیکائی وانونو'' یائیل نے ایلان کو استفہامی نظروں سے دیکھا اور کہا ۔

''اسرائیل کے ایٹمی ری ایکٹر کا انچارج نا ۔''

ایلان نے مسکراتے ہوئے یائیل کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا ۔

وانونو تو اسرائیل کے خلاف بھرا بیٹھا تھا ۔کھانے کی میز پر ہی شروع ہو گیا تھا ۔

''جانتے ہو تم وہ ایلان سے مخاطب تھا ۔اسرائیل کے پاس دو سو سے کم جوہری ہتھیار نہیں ہیں ۔گذشتہ پچیس برسوں سے وہ انہیں تیار کر رہا ہے اور جھوٹ پر جھوٹ بول رہا ہے ۔کہیں 1960ء میں جب امریکی صدر کینیڈی نے معائنے کے لئے اصرار کیا تو ایک مکمل جعلی کنٹرول روم بنا کر امریکہ کو بڑی عیاری ،بڑی مکاری اور بڑی ہوشیاری سے الّو بنا دیا ۔

اور اس رات یائیل یہ خوفناک سا انکشاف سن کر حیرت زدہ سی رہ گئی تھی کہ اسرائیل امریکہ کی مخبری پر کثیر رقم خرچ کرتا ہے ۔امریکی ایجنٹ اُس کے لیے حساس قومی نوعیت کی تکنیکی معلومات چُراتے ہیں ۔

گھر میں آنے والا مہمان اور میزبان دونوں سی۔آئی۔اے کی خفیہ رپورٹوں سے آگاہ تھے۔تہران میں امریکی سفارت خانہ پر جب قبضہ ہوا اور جو رپورٹیں برآمد ہوئی تھیں اس پر بھی لمبی چوڑی بحث ہوئی۔رات سونے تک کے وقفے میں پائل نے بہت تشنہ پہلوؤں پر ایلان کا نقطۂ نظر جانا اور ابھی اس ملاقات کو کچھ زیادہ وقت بھی نہیں گزرا تھا۔بہار کی آمد آمد تھی۔پائل چند دنوں کیلئے لندن آئی ہوئی تھی۔واپس گئی تو ایلان نے ذکر کیا۔

''لو بھئی ایک جوڑا تو پکڑا گیا۔بس دو ایک دن میں گرفتاری عمل میں آنے والی ہے۔''صرف تین دن بعد کے اخبارات نے جلی حروف میں دو امریکی شہری جوناتھن جے پولارڈ اور مسز این ہینڈرسن پولارڈ اسرائیل کیلئے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کرنے کی خبر دی اور انہوں نے اعتراف بھی کیا۔پولارڈ کو عمر قید اور این پولارڈ کو پانچ سال قید ہوئی۔

کوئی ہنگامہ اُٹھا۔اسرائیل نے شور مچایا مگر ثابت ہو گیا تھا کہ پولارڈ کے ذریعے حاصل کردہ معلومات وزیر اعظم شامیر نے سوویت یونین کو دیں۔

پائل حیران سی تھی۔خیر سے جوڑا گرفتاران صیہون بن گیا تھا۔پارلیمنٹ کے 120 ارکان میں سے 70 اراکین نے ریگن کو پولارڈ کی رہائی کیلئے درخواست کی۔اسرائیلی خواتین کے دو گروپوں نے بھی مطالبہ کیا۔اِن نامور خواتین نے دہائی دی خدا کا خوف کرو کچھ۔پولارڈ معدے کی خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔اُس کی رہائی میڈیکل گراؤنڈز پر ہونی چاہیے۔سرکردہ اسرائیلی شخصیات نے عوامی کمیٹی فنڈ ریزنگ کیلئے بھی ترتیب دے دی۔

1990ء میں اپنے کسی صحافتی مشن پر ایلان کو جنوبی افریقہ جانا تھا۔واپسی پر وہ چند دنوں کیلئے اسرائیل بھی آیا کہ پائل کی تاکید تھی۔

یہ بھی عجیب سا اتفاق تھا کہ اُسی دن اور اُسی وقت این پولارڈ اپنی ڈھائی سالہ قید

کاٹنے کے بعد رہا ہو کر اسرائیل پہنچی تھی اور بن گوریاں ایر پورٹ اُس کے استقبال کیلئے بچھا جا رہا تھا۔استقبالیہ نعرے تھے۔اسرائیلی پارلیمنٹ کی نمایاں شخصیات۔
دائیں اور بائیں بازو کی سرکردہ خواتین،لیبر پارٹی کی ایڈنا سولار بھاگی پھرتی تھیں۔

ایر پورٹ پر ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔اخباری نمائندوں اور الیکٹرونک میڈیا کے نمائندوں کا طوفان تھا۔اسرائیل کی عظیم ہیروئن کو خراج تحسین تھا۔وطن کیلئے صعوبتیں برداشت کرنے اور قید کاٹنے پر پوری قوم کی طرف سے اظہار عقیدت تھا۔امریکہ کو لعن طعن تھی کہ جس نے اُن پر جھوٹے الزام لگائے۔ڈپٹی وزیراعظم اور لیبر پارلیمنٹ کی سرگرم رکن ایڈنا سولار کی ایلان سے اچھی ہیلو ہائے تھی۔ایلان ہنسا اور ایڈنا سولار سے بولا تھا۔
کچھ خوف خدا کرو۔یہودی قوم کی پیشانی پر احسان فراموشی کے جو داغ صدیوں سے چپکے ہوئے ہیں انہیں تو دھونے کی ضرورت تھی۔سات گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔اپنے ایمان سے کہو یہ میاں بیوی کیا جوہری جاسوس نہیں اور وزیراعظم یضحاک شامیر Yitzhak shamir نے کولڈ وار کے عروج میں یہ معلومات سوویت یونین کو نہیں پہنچائیں۔

''تم اپنا یہ تھوبڑا سا منہ جو ہمہ وقت اول فول بکتا رہتا ہے بند رکھو تو بہتر ہوگا۔''
ایڈنا سولار نے ہنستے ہوئے پیار بھری سرزنش کی۔ابراھم ایلان سے پارلیمنٹ کی خواتین کی خاصی بے تکلفی تھی۔
''تم دیکھنا ایلان جوناتھن جے پولارڈ کو بھی ایسے ہی ہم لوگ اس ایر پورٹ پر خوش آمدید کہیں گے۔بڑی تگ و دو ہو رہی ہے ان کی رہائی کیلئے۔تم نے تو آدھے صفحے کا مضمون لکھ کر انہیں مجرم ثابت کرنے کی پوری کوشش کر دی نا۔

''میں سیاست دان نہیں یہ موجیں تم لوگوں کو حاصل ہیں جسے چاہو زیرو سے ہیرو بنادو۔''

''انکار مت کرو اعتراف کرو کہ وہ اسرائیل کی ہیرو ہیروئن تو ہیں نا۔اور تم صحافیوں کی بھی کیا بات کہ ہمیشہ ہی اُلٹی گنگا بہاتے ہو۔''

ایلان نے قہقہہ لگایا''اور جو کہوں گا سچ کہوں گا اور جو لکھوں گا ہمیشہ سچ ہی لکھوں گا'' کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

اور یہ اس کے ایسے ہی سچ لکھنے کا نتیجہ تھا جن کے ردِّعمل کے طور پر بالآخر جان سے گزر جانے کا جانگسل مرحلہ آ گیا تھا۔

قاسم اِس منہ زور سیلاب کے سامنے پُشتے کی صورت تنا کھڑا تھا۔

''نہیں یائل ایسا ہوتی نہیں۔انہوں نے آپ کو بین کر دینا ہے۔یرڈینا ڈوڈا اور ڈیوڈ ڈوڈ آپ انہیں کیوں بھولتی ہیں؟ آپ اسرائیل کے ایرپورٹ پر کبھی نہیں اُتر سکیں گی۔آپ کو ہٹ لسٹ پر رکھ لینا ہے۔اُنکے لیے ہر احتجاجی آواز کا گلا گھونٹنا ضروری ہے۔میرے لیے اپنی بہن کی زندگی اور سلامتی زیادہ اہم ہے''۔

''قاسم پیچھے ہٹ جاؤ۔بولنے دو مجھے۔نہیں تو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا''۔

اِسی دوران منصور نیویارک پہنچ چکا تھا۔اُس لٹے پٹے چہرے کو منصور نے کس دل سے دیکھا جو اُس پر نظر پڑتے ہی اسکی طرف بھاگا تھا۔اپنی بانہوں کے کلاوے میں سمیٹا تو وہ اُس کے سینے پر سر رکھتے ہی سسک اٹھی۔

''منصور قاسم سے کہو میری زبان بندی نہ کرے۔مجھے بولنے دے۔پہلے بھی یہی ہوا تھا۔میرے والدین اپنے رشتے داروں سے ڈرتے تھے۔تمہارے گھر والے خوف زدہ تھے۔بے گناہوں کے قتلِ عام کا ڈر تھا۔فساد کی آگ بڑھکنے کا اندیشہ تھا۔آگ تو اب

بھی بھڑکتی ہے ۔مظلوموں کا خون اب بھی بہتا ہے ۔میرے مقدر پر ہی سیاہی پھرنی تھی ۔

میرے شوہر کے قاتل اسرائیل کے حکمران ہیں ۔

''منصور کیا تم میری بات اب بھی نہیں مانو گے؟''

پائل نے اس کے سینے پر پڑا اپنا سر اک ذرا اُٹھا کر وحشت زدہ آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

منصور نے تڑپ کر اُسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا تھا۔

''پائل تم جیسے چاہو گی ویسے ہو گا۔''

منصور نے پاس کھڑے قاسم کو دیکھا جس کا چہرہ افسردگی میں نہایا ہوا تھا۔

''مت روکو قاسم اِسے جو یہ کہنا چاہتی ہے کہنے دو۔نہیں تو اسکا ذہنی توازن بگڑ جائے گا''۔

اسکی زبان سے نکلنے والے الفاظ آگ کے شعلے تھے جسکی تپش دُنیا بھر میں پھیلی ۔مگر عالمی ضمیر سویا ہوا تھا۔نہ جلا نہ جاگا۔

شامیش جب ناشتے کے لئے آیا۔چولہا جلتا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھی جانے کہاں گم تھی؟ آنسو لڑیوں کی صورت اُسکی آنکھوں سے بہتے تھے۔شامیش نے جھک کر اسکے آنسوؤں کو پونچھا اور کہا۔

''آپ بہت وعدہ خلاف ہیں۔جانتی ہیں مجھے تکلیف ہوتی ہے''۔پائل نے دھیرے سے کہا تھا۔

''قاسم نے ایڈمنڈ کی یاد دلادی تھی۔''

شامیش کیلئے ناشتہ بناتے ہوئے بھی وہ سوچوں میں ہی اُلجھی رہی تھی ۔

''آپکا ناشتہ۔''اُس نے میز پر بیٹھتے ہی کہا۔

پائل نے جواباً کہا تھا۔"میرا آج آف ہے۔آرام سے کروں گی"۔

"پلیز امّی آپنے آنٹی سوزن کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔آئے دن اُسکی چھٹیاں۔آپ کو کام کرتے دیکھ کر میں شرمندہ ہوتا ہوں"۔

"ارے نہیں ڈارلنگ"!

پائل چائے کا کپ لیے لیونگ روم میں آگئی۔وہ ٹی وی دیکھتی رہی اُس وقت تک جب تک شامیش باہر نہیں گیا۔اسکی ذرا سی پریشانی کو بھی وہ بہت محسوس کرتا تھا۔اور پائل ہر ممکن کوشش کرتی کہ اسکے اندر کے خراب موسم وہ کبھی نہ دیکھے۔پر آج عجیب سا دن تھا وہ اس ناسٹلجیا سے نکل نہیں پا رہی تھی۔

"جانے کس دُنیا میں کھو گیا ہے۔ممی گئیں میرے بہت پیارے ڈیڈی جنکے آخری وقت تک انکی آنکھوں کے دیئے اسکے انتظار میں جلتے بجھتے رہے۔"

"ایڈمنڈ نہیں آئے گا"۔یہی آخری الفاظ تھے جو انکی زبان سے نکلے تھے۔اور پھر وہ آنکھیں دوبارہ نہیں کھلیں۔سارے رشتے ختم ہو گئے تھے۔کچھ نہیں بچا تھا۔

لوگ کہتے ہیں۔پائل کا حوصلہ پہاڑوں جیسا ہے۔اِنسان کہاں پہاڑ بن سکتا ہے۔بس گلے کرنے چھوڑ دیئے ہیں۔نہ قسمت سے شکوہ نہ حالات سے۔

تنہائی میں خفیف سا طنز ہونٹوں پر اکثر بکھر جاتا تھا اور وہ خود سے سوال کرتی۔

"کیا کبھی ایسا سب سوچا تھا۔لگتا ہے جیسے زندگی ایک جبرِ مسلسل ہے۔میرے کسی گناہ کی سزا ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی ہے۔"

ایسے ہی غم آلود دنوں میں حالات کا ایک اور سانٹا اُسپر پڑا اور اُسے لہولہان کرتا گیا۔

شامیش لازمی فوجی تربیت کے دوران ربّی ایلیا زرشیاس کے بیٹے کا روم میٹ

room mateاور بیچ میٹbatch mateرہا۔ایلیا زرشیاس ڈیگل ہاتورہ فرقے کا روحانی پیشوااور اسرائیل کی بااثر شخصیت تھی۔ پہلی دفعہ شامیلش ہفتے کی چھٹی پر گھر آیا تو وہ عجیب وغریب باتیں کرتا تھا۔وہ سر پر ٹوپی رکھنے اپنے لباس اور طور طریقوں سے مختلف نظر آرہا تھا۔یائل نے قدرے حیرت سے اُسے دیکھا تھا پر کہا کچھ نہیں۔یونہی ایک دن وہ ہیسڈر یشیووت لڑکوں بارے باتیں کرنے لگا۔

یائل جانتی تھی کہ مذہبی سربراہوں نے اِن طلبہ کی تربیت کا بیڑہ اُٹھایا ہوا ہے۔ہیسڈر یشیووت طلبہ کو ہر چھ ماہ بعد فوج چھوڑ کر یشیوا میں تالمود پڑھنے جانا ہوتا ہے کہ فوج میں سیکولر یہودی فوجیوں سے ملنے سے اُن پر پڑنے والے منفی اثرات کو صاف کیا جاسکے۔اسرائیلی فوج میں اُن کی کارکردگی بہت اُونچی خیال کی جاتی ہے۔بہت جیالے،سرفروش اور جان نثار سمجھے جاتے ہیں۔انہی لڑکوں میں سے کسی کا باپ کسی کا چچا،کسی کا ماموں لبنان کی تین سالہ جنگ میں سب سے زیادہ ہلاک اور زخمی ہوئے تھے۔فلسطینیوں پر ظلم وستم کرنے میں بھی وہ اپنی ایک انفرادیت رکھتے تھے۔سفاکانہ سزائیں دینے کے لیئے بھی اُنکا ہی چناؤ ہوتا تھا۔

یائل نے اپنا سر پکڑلیا تھا۔پہلی باراُسے احساس ہوا تھا کہ اُسنے اسرائیل آکرسخت غلطی کی تھی۔

اب ایک نیا تماشہ ہونے لگا تھا۔جب بھی وہ گھر آتا ایک نیا شوشہ لاتا۔اُسکی گفتگو میں طنز کاعنصر زیادہ نمایاں ہونے لگا تھا۔منصوراور اسکے گھرانے کی بابت تعصّبانہ باتیں تھیں۔مدافعت میں یائل کی جانب سے کہے گئے چند جملے اُسے بھڑکانے کے لئے کافی ہوتے۔

ایک دن اپنی ماں اور منصور کے بارے بہت کھل کرتو نہیں پر کچھ ڈھکے چھپے لفظوں

میں ایسا کچھ کہا کہ جس نے پائل کو الٹ پلٹ کر دیا تھا۔آنکھوں میں جیسے صحرا کی سی ویرانی امنڈی تھی اور تیز طرز ارزبان ہکلاؤ اور ہکلاؤ کی زد میں تھی۔شامیش کے لیئے اُس کے پاس ڈانٹ ڈپٹ تو کیا ہلکی سی غصیلی نظر بھی نہیں تھی۔کبھی وہ اُسے کچھ کہہ ہی نہیں سکتی تھی اور آج بے اختیار ہی اضطراب میں کاٹے ہوئے اپنے ہونٹوں سے نکلتے خون کو اپنے اندر اُتارتے ہوئے اُسنے ضبط کمال سے کہا تھا۔

''شامیش تم جیسکے بیٹے ہو وہ تو بڑا اعالی ظرف تھا۔اسکی عالی ظرفی نے ہی مجھے جیتا تھا۔تمھارے اندر یہ گند اُن لوگوں نے بھرا جو انسانیت کے لئے باعث شرم ہیں''۔

ساری رات ہی جیسے سولی پر کٹی تھی۔آنکھوں سے بھی ساون بھادوں برستا رہا تھا مگر صبح اُسنے خود کو سنبھالا تھا۔اپنے دکھوں کی نمائش سے اُسے نفرت ہو گئی تھی۔

دوپہر تک نہ تو اسکی آنکھیں اتنی متورم رہی تھیں اور نہ ہی چہرے پر زبوں حالی کا کوئی عکس تھا پر معاملہ تو دل کی ڈوریوں کا ایک دوسرے سے مظبوطی سے بندھے ہونے کا تھا کہ اندر کی ساری کیفیات کا حال جاننے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

منصور تو اس کے کمرے میں کسی مریض سے متعلق کوئی اہم بات کرنے آیا تھا۔کیا بات کرنے آیا تھا بھول گیا تھا کہ اس پر ایک نظر ہی کافی تھی۔وہ بھی جیسے پھٹ پڑی۔

''فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔بچوں پر ایسے فیزز phases آتے رہتے ہیں''۔

منصور کے لہجے میں دلاسا،تسلی،دلداری اور اُمید تھی۔اُسکے بے حد پیارے بچپن،جوانی اور اب ادھیڑ عمری کے اِس ساتھی کے پاس کیا تھا؟وہ نہیں جانتی تھی۔شائد یہ پُر خلوص دعائیں تھیں جو اُسے پیش آنے والی ہر تکلیف کے سامنے بند باندھ دیتی تھیں۔

اور یہی ہوا تھا اوپر تلے کے واقعات ایسے تھے کہ اُس دلیل والے باپ کا بیٹا دلائل میں اُلجھ گیا تھا۔ گش ایمونم (ایمان والے لوگ) نظریئے سے تعلق رکھنے والے چند لڑکوں سے بحث ہوگئی ۔ مسئلہ وہی آبادکاری سے متعلق تھا۔عربوں سے زمین کا چھیننا کسی زیادتی، کسی ظلم، کسی زور زبردستی کے کھاتے میں نہیں آتا تھا۔ بلکہ یہ تو اُس زمین کو پاک کرنے کا عمل تھا جو بدقسمتی سے صدیوں سے اِن جاہل اور وحشی عربوں کے پاس تھی۔ گھر آکر اُسنے ماں سے اپنی بات کی تائید چاہی۔

یائل نے رسان سے کہا تھا۔

''تمہاری سوچ ٹھیک ہے یہ سراسر ناانصافی ہے۔''

یائل نے لمبی چوڑی بحث سے اجتناب کیا تھا۔

اور ایسے ہی دنوں میں اُسنے یروشلم کے پیرس سکوائر میں کوئی سو کے قریب سیاہ پوش یہودی عورتوں کو بڑے بڑے بینرز اٹھائے اس ظلم پر احتجاج کرتے دیکھا۔ وہ جبری بیدخلی اور اسرائیلی گورنمنٹ کے ویسٹ بنک اور غزہ پر بھی قبضے کے خلاف تھیں۔ وہ یہودی آبادکاری کے خلاف لکھے ہوئے بینرز اٹھائے ہوئے تھیں۔ ایک بینر پر لکھے ہوئے دوسطری جملے

The state of Isreal Condemns and vilifies the voice of the Jewish mother.Which is the voice of Compassion,tolerence and dialogue اُس نے پڑھے وہ رینگ سائیکل کے ہینڈلوں کو پکڑے سڑک کے ایک کنارے پر کتنی دیر ساکت کھڑا رہا۔ چھوٹا سا پیغام اُس کے اندر دُور تک اتر گیا تھا۔

یہ انسانیت کا جھومر عورتیں ہاتھوں میں جلتی ہوئی موم بتیوں کے ساتھ کھڑی

تھیں ۔وہ کم وبیش انھیں ہر جمعے کو دیکھتا تھا مگر کبھی توجہ نہیں دی تھی ۔ اکثر اسکی ماں بھی اُن میں جا کر شامل ہوتی تھی ۔سڑک کے دوسری طرف فلسطینی عورتوں کی ایک کثیر تعداد سفید لبادوں میں لپٹی ایسے ہی بینرز پکڑے موم بتیوں کے ساتھ کھڑی تھیں ۔ یہ سب مائیں تھیں ۔عرب مائیں اوراسرائیلی مائیں ۔مائیں جنکے بچے لڑائیوں اور جھگڑوں میں مارے جاتے ہیں ۔

دوسرا بڑا واقعہ باروک گولڈ سٹائن(Baruch Gold Stein)کا ہوا۔گولڈ سٹائن اسرائیلی فوج میں آرٹلری بٹالین کا ڈاکٹر جسنے فوج میں اپنی ملازمت کے دوران عربوں کے علاج سے مسلسل انکار کر کے ڈسپلن کو توڑا تھا۔مگر اُسے سزا نہیں دی گئی اسکی جنونیت اُسے ہیبرون کی ایک مسجد میں لے گئی ۔اُسنے نمازیوں پر پیچھے سے فائرنگ کی اورانتیس (29)جانوں کی ہلاکت اور بے شمار لوگوں کے زخمی ہونے کا باعث بنا۔

اُس نے حیرت سے کچھ مذہبی لوگوں اور اُنکے بچوں کی باتیں سنیں جو اُسے ہیرو کا درجہ دے رہے تھے۔ اُس کے والد کا ایک کزن ہیریڈی (بنیاد پرست)اکثریتی آبادی والے شہر بنی براک میں رہتا تھا۔اُسکے بیٹے نے شامیش کو فون پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا۔

''یہاں ہم لوگ پیورم Purim(ایک تہوار) منا رہے تھے۔خوب موج میلے کا سماں تھا۔یقین مانو ریڈیو پر اِس خبر کے نشر ہونے پر لوگوں نے گلیوں میں دھمالیں ڈالیں ۔شراب کے جام پر جام لنڈھائے اورمستی کے عالم میں نعرے لگائے ۔گولڈ سٹائن ہمارا ہیرو ۔ہمارا شہید ۔ہمارا فخر۔

اگلے دن کے کچھ اخبارات میں اگر مذمت تھی تو وہیں زیادہ میں تحسین برس رہی تھی ۔یروشلم اور دیگر مذہبی علاقوں کی دیواریں تو راتوں رات اُس کے لیئے ہیرو اورشہید جیسے نعروں سے بھر گئی تھیں ۔ مذہبی گروپوں کا اصرار کہ جنازہ بہت شاندار ہونا

چاہیے۔ جنازے کے روانہ ہونے سے پہلے مشہور ربیوں نے گولڈ سٹائن کو سراہا۔ جنازے کی حفاظت سرحدی گارڈز، پولیس اور خفیہ پولیس نے کی۔ جنازے کے بعد اسرائیلی فوج نے گولڈ سٹائن کی قبر پر گارڈ آف آنر پیش کیا۔ قبر تو زیارت گاہ بن گئی تھی اور گولڈ سٹائن سینٹ (saint) کے درجے پر فائز ہو گیا تھا۔

تل ابیب کے مشرقی حصے رمت گین Ramat Gan میں بھی یہی کچھ ہوا۔ سٹیڈیم میں مذہبی جاز سنگر موڈیکائی بین کا شو تھا۔ پرگرام کے آغاز سے قبل کسی نے گولڈ سٹائن کے عظیم کارنامہ انجام دینے پر اُس شہید کے لیے دعائے خیر کے لیے کہا۔

بیچ میں سے ایک ٹوپی اور داڑھی والے نے چلاّ کر کہا تھا۔

''میں نہیں مانتا۔ وہ ایک سفاک قاتل تھا۔''

لوگ اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔

''یہ تو سراسر ظلم ہے آپ عبادت کرتے ہوئے لوگوں کو مار دیتے ہیں۔''

اُسنے اپنے ساتھیوں سے اس پر بھی بحث کی کہ ڈاکٹر کا کیا کام ہے وہ مریض کو مذہب کے خانے میں بانٹے۔ اُس کا تو کام ہی مسیحائی ہے۔

اسکی ماں ڈاکٹر تھی۔ اور طبی اخلاقیات کے کیا تقاضے ہیں؟ یہ بات ایک بار نہیں سینکڑوں بار اُسکے کانوں میں پڑی تھیں۔ سیاسی لیڈروں، حکومتی اراکین حتیٰ کہ وزیراعظم شمون پیریز Shimon Peres کے بیانات بھی انسانیت سے عاری اور انتہائی منافقانہ تھے۔ کوئی بات تھی آپ کو انسانی جانوں کے ضیاع کا افسوس نہ تھا بلکہ دُنیا کے سامنے اسرائیل کے امیج کے خراب ہونے کا ملال تھا۔ پارلیمنٹ میں ممبران کے درمیان الزام تراشی بھی گھٹیا ترین تھی۔ کیا نیتن یاہو، کیا شمعون، کیا پریز (Peres) سب ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے تھے اور کسی کو یہ احساس نہ تھا کہ دونوں قوموں میں امن کتنا ضروری ہے؟

وزیراعظم یتسحاک رابن (Yitzhak Rabin) کا قتل بھی ایک بڑا سانحہ تھا۔قاتل ایک نوجوان یہودی طالبعلم یگال ایمر (Yigal Amir) تھا جس کا یہ بیان لمحہ فکریہ تھا کہ مجھے خدائی حکم ملا تھا کہ اِس سرزمین کے کسی حصّے کو غیر یہودیوں کے حوالے کرنا غداری ہے اور غدار واجب القتل ہے۔''

یائل تو جنونیت سے لبالب بھرے اِن خونی رویوں پر شاک زدہ حالت میں بیٹھی تھی جب شامیش گھر آیا وہ بھی حیران و پریشان نظر آتا تھا۔چائے پیتے ہوئے دونوں کے درمیان دونوں رہنماؤں کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ دونوں قوموں کے انتہا پسند زیر بحث آئے۔دونوں کو افسوس تھا۔اوسلو مذاکرات نے ابھی فلسطینیوں کو کچھ دیا نہیں تھا۔صرف ویسٹ بنک اور غزہ کے چند مقبوضہ علاقے خالی کرنے پر زور تھا۔وہ بھی برداشت نہیں ہورہا تھا۔یہ انتہا پسند اسے گل کرنے کی کوشش میں ہیں۔فلسطینیوں کی عسکریت پسند تنظیمیں بشمول حماس اسے ذلت آمیز معاہدہ سمجھتی ہیں اور ایسا ہی حال اِن اسرائیلی جنونیوں کا ہے۔

اوسلو معاہدے کی ہر ہر شق پر بحث تو ہوتی تھی۔تاہم لبرل حلقے اِس صورت حال پر پریشان تھے۔ابھی چند ماہ پہلے حماس کی ایک جیالی خاتون نے ایک خودکش حملے میں پانچ اسرائیلیوں کو ہلاک اور ایک سوسات کے قریب زخمی کیے تھے۔

شامیش بہت متاثر نظر آتا تھا۔

اسکے دماغ میں کلبلاتے یہودی شاؤنزم کے تابوت میں آخری کیل اُس دن ٹھکی جب قاسم اُنکے گھر آیا۔یائل کا یہ گھر کرایہ کا تھا چھوٹا سا۔تنگی تو ہرگز نہیں تھی۔وہ تھے ہی کتنے؟ ماں بیٹا اور نوکر۔حیمہ والا گھر کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔یائل ہاتھ کی بہت تخی تھی۔ضرورت مند ہر مریض پر خرچ کرنا ضروری سمجھتی تھی۔

تب شامیش انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔اسکا خاصہ خرچہ تھا۔قاسم کوئی ہفتے کے لیے آیاتو اسے ملنے کے لیےاس کے گھر آیا۔اس وقت شامیش بھی گھر میں تھا۔قاسم نے گھر دیکھاتو حیرت سے کہا۔

''میری بہن اتنے چھوٹے سے گھر میں رہتی ہے۔''

یائل نےفوراً خود کا دفاع کیا۔

''ارے ہم نے بڑا گھر لے کر کیا کرنا ہے؟''

اور یائل نے دیکھا تھا۔قاسم کا لہجہ جیسے جذبات اور رقت سے بھر سا گیا تھا۔

''آپ میری بہن ہیں۔دنیا میں میری اکلوتی بہن۔آپ کا گھر کیا ایسا ہونا چاہیے؟''

اُس نے بہتیرا منع کیا۔بہتیرا روکا مگر وہاں ایک ہی رٹ تھی نہیں سوال ہی نہیں۔میری بہن کا گھر شاندار سا ہونا چاہیے۔اور اگلے چار پانچ دنوں میں اُسنے یروشلم کے مرکزی علاقے میاشرم میں ایک خوبصورت گھر خرید کر یائل کے نام کر دیا۔

پھر جیسے اُس بھیجے میں خارش ہونے لگی۔دل کے اندر باہر کھلبلی سی مچنے لگی۔منصور ڈوڈا کی فیملی کے روّیے،انکی محبتیں لام ڈور کی طرح سامنے آنے لگیں۔ضالیہ سیونا یرڈینا سیونا سے بھی بڑھ کر محبت کرتی تھیں۔اور بس یہی سب چیزیں اسکی واپسی کا سبب تھیں۔کوئی تین سال بعد یہ کایا کلپ ہوئی۔

ایک شام منصور کے کلینک پر پہنچ گیا۔اُس وقت وہ مریضوں کو نپٹا کر اٹھنے کے قریب تھا۔

اُسے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار کیئے بغیر''آؤ بیٹا'' کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''منصور ڈوڈ آپ مجھے اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچیے۔''

اور جب منصور اسکے بالوں اور ماتھے کو چومتا تھا اُسکا اندر خدا کا شکر گزار تھا کہ اُسکی واپسی منصور کی دعاؤں کا نتیجہ تھی۔

وہ ضالیہ کے سینے سے لگا۔پورے تین سال بعد وہ اِس گھر میں آیا تھا۔اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اپنی ماں کے سلسلے میں بھی وہ قصوروار ہے۔

چند دن جب وہ قصداً اپنی ماں کے پاس بیٹھتا رہا۔اُس کا اندر اُس کے چہرے پر رقم ہوتا۔

ایک دن پائل نے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹا اور بھیگی آنکھوں سے اُس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔میں تم سے ناراض نہیں۔''

اب یہ ایمان کو منانے اور قائل کرنے والا بھاری پتھر بھی اُسے ہی اُٹھانا تھا۔اُس نے سیدھے جا کر ڈیرہ ضالیہ کے کمرے میں لگایا اور ایمان وہیں آئی۔

''میری جان میں تمھاری سوچوں سے اتفاق کرتی ہوں مگر یہاں سوال قاسم کی خواہش کا ہے۔بحث نہیں ہوگی۔تمہاری شادی ہو رہی ہے اور یہ بھرپور انداز میں ہونی چاہیے۔

پائل کو اُسے ہینڈل handle کرنا آتا تھا۔اُس کے ڈھیروں ڈھیر دلائل کو وہ گاجر مولی کی طرح کاٹنا جانتی تھی۔کو اس کی نوبت کم کم آتی تھی۔

اندرون وطن عزیزوں کے علاوہ بیرون مُلک سے بھی رشتے کے چاچے، مامے، کزن لڑکے لڑکیوں کا کٹھ ہوا پڑا تھا۔اس رنگ رنگیلی فضا کے رنگوں پر تھوڑا سا پھیکا پن چھا گیا جب ایک صُبح مغربی کنارے کی شمالی پہاڑیوں کے دامن میں اسرائیلیوں کی آتمار Atamar نامی Scttlement میں فوگل فیملی کے پانچ افراد کو اُنکی خوابگاہوں

میں چاقوؤں سے قتل ہونے کی خبر آئی۔

فوری نزلہ تو غریب پر ہی گرنا تھا۔اسرائیلی ملٹری اور سیکورٹی سروسز نے بغیر تحقیق کے ملحقہ فلسطینی گاؤں آوارتا Awarta پر چڑھائی کردی۔نوجوان لڑکوں کی گرفتاریاں،گھروں کی تلاشی،سامان کی توڑپھوڑ چند گھنٹوں میں ہی حشر نشر ہوگیا۔یشار کے چھوٹے چچا اور اُسکے تین بیٹے بھی اسی چکر میں دھر لیے گئے۔وہ تو شادی میں شرکت کیلئے تیاریوں میں تھے۔جب یہ قیامت ٹوٹی۔

ایمان تلملاتی پھرتی تھی۔ہم غلام ہیں۔ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اوپر ہر خوشی حرام کرلیں اور اپنے حق کیلئے کام کریں۔

گھر والوں کے اسرائیلی رابطے یوری ایوزی کو موثر ثابت ہوئے۔سب سے بڑی اور اہم کاوش یوری ایوزی اسرائیلی پارلیمنٹ کے سابق رکن کی تھی۔وہ سیاست میں رہتے ہوئے حق اور سچ کا علم ہمہ وقت اٹھائے رکھتا ہے۔ظلم و جبر پر بولتا اور لکھتا رہتا ہے۔فلسطینیوں کے حقوق اور اُنکی آزاد ریاست کے قیام کی حمایت میں ہمیشہ آواز بلند کرتا رہتا ہے۔

اتنی سفارشوں کے باوجود انہیں حراست میں بھی رکھا گیا۔بیچاروں کے فنگر پرنٹ بھی لیے گئے۔بہر حال انکی شمولیت نے رنگ میں بھنگ نہیں پڑنے دیا۔ایمان یشار البشر کی زندگی کا حصہ بنکر رخصت ہوئی اور ربائل رات گئے گھر لوٹی تھی۔

شامیش شاید پہلے آگیا تھا۔یونہی اُسے دیکھنے کیلئے اُس کے کمرے میں گئی۔شاید وہ کچھ لکھتے لکھتے سو گیا تھا۔ربائل نے سوچا اُسے اُٹھا کر اُس کے بیڈ پر لٹائے جب دفعتاً اُس نے رائٹنگ ٹیبل writing table پر پڑے کاغذ پر ایمان کا نام لکھا ہوا دیکھا۔حیرت زدہ سی وہ کاغذ کی طرف متوجہ ہوئی۔وہاں کئی کاغذ تھے۔مختلف انداز کی تحریری شکل میں وہاں

ایمان کے نام کی قطاریں تھیں۔ وہ ساکت ہو کر رہ گئی۔

''یہ کیا''۔ اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''یہ کیا''۔ اُس نے پھر خود سے کہا تھا۔

''کیا شامیش ایمان کو پسند کرتا تھا؟'' اُس کے اندر ایک بھونچال تھا مگر اُس کا باہر ساکت اور منجمند تھا۔

باب نمبر: ۲۱

سُرخیاں:

1۔ **میں اُس دن کا خواب دیکھ رہا ہوں جب ایک اسرائیلی کہے گا ہمارا یروشلم تو اس کا مطلب فلسطینی اور اسرائیلی سے ہوگا۔**

2۔ **اسرائیلیوں کی 52% آبادی کو نہ امن سے دلچسپی ہے اور نہ فلسطینیوں کے ساتھ پُرامن طریقے سے رہنے کی خواہش ہے۔**

3۔ **کسی بھی میدان میں کسی مسلمان کا غیر معمولی ہونا ناقابلِ برداشت ہے۔**

4۔ **آبزرویشن ٹاور Observation tower میں بیٹھے ہوئے فوج چھوکرے کو کیا علم کہ اُس کی گولی کا نشانہ بننے والا ڈاکٹر کتنا قیمتی انسان ہے۔**

گھر کے سامنے ایک جیپ آکر رُکی تھی ۔دو اسرائیلی فوجی اس میں سے اُترے تھے۔ایک نے گیٹ پر لگی بیل بجائی تھی ۔ڈاکٹر بشارالبشر ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر آیا تھا۔وہ آجکل نابلوس کے رفیدیہ اسپتال میں تھا۔بشار کے اس طبّی معجزے کا بہت چرچا ہو گیا تھا۔

ابھی تین دن پہلے وہ یروشلم کے حادثہ اسپتال سے آیا تھا۔کوہ سکوپس پر اس اسپتال کی عظیم الشان عمارت اور اس سے ملحقہ نرسنگ سکول جو ہبرو یونیورسٹی سے منسلک تھے کو دیکھ کر حیران بھی ہوا تھا اور اُسے رشک بھی محسوس ہوا کہ جب وہ نابلوس آیا اُسنے بار بار ایمان سے اپنی حسرت کا اظہار کیا تھا کہ ایسا ایک بھی اسپتال فلسطینی علاقوں میں نہیں ۔اسکی فنڈنگ امریکہ کی وویمن زائینسٹ آرگنائیزیشن The woman's Zionest org کرتی ہے تو کیا یورپ میں رہنے والے صاحب ثروت فلسطینی لوگ ایسا بڑا فلاحی کام

نہیں کر سکتے ہیں۔

ایمان نے اسکے بیگ سے تازہ بھنی ہوئی کافی کا پیکٹ نکالتے اور نتھنوں سے اسکی خوشبو سونگھتے ہوئے کہا تھا۔

''یشار بنائیں گے ہم انشاء اللہ بنائیں گے۔ابھی تو کیمپوں میں لوگوں کو علم دینے کی ضرورت ہے کہ اسرائیل تو انہیں جاہل رکھنے کا خواہاں ہے۔چھوٹے موٹے سکولوں کو تباہ کرنا بمباری کے پہلے مرحلے میں ہی ضروری سمجھتا ہے۔''

انکی شادی کو ابھی چار ماہ ہوئے تھے۔آج صبح سے وہ الاہرام کیلئے کالم لکھنے میں مصروف تھی۔کچھ نزلہ زکام بھی تھا۔نوکرانی بھی کل شام سے چھٹی پر گئی ہوئی تھی۔کھانا پکانے کا اُسے کوئی خاص تجربہ ہی نہیں تھا۔پہلے سوچتی رہی کیا بنائے؟ کیا پکائے؟ کوئی آسان سی چیز۔پھر لکھنے میں لگی تو سب کچھ بھول گئی۔یشار کوئی دو بجے گھر آیا تھا۔اُسنے تاسف بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''سوری یشار میں تو سمجھتی تھی کہ اُمّ رقیہ کچھ نہ کچھ پکا کر گئی ہوگی مگر فریج میں تو کچھ نہیں تھا۔''

تو کیا ہوا؟ زاطر ہے نا اُسے ہی لے آؤ''۔

اُسنے فوراً میز پر خبش زیتون اور زاطر سجا دیا۔ابھی یشار نے نوالے کو زیتون میں ڈبو کر اُسے زاطر میں لتھیڑنے کے لئے نکالا ہی تھا کہ جب باہر جیپ کے رُکنے اور پھر بیل bell بجنے کی آواز آئی۔

ملازم کے چہرے پر ہلکی سی خوف کی پرچھائیں تھیں جب اُسنے بتایا کہ اسرائیلی ایرفورس کا کوئی افسر لگتا ہے۔ساتھ میں ڈرائیور ہے۔

ایمان بڑی دلیر لڑکی تھی تھوڑی سی گھبرائی۔یشار نے نوالہ ویسے ہی پلیٹ میں

رکھا اور گیٹ پر گیا۔ ملازم نے دروازہ کھولا اور پھر ڈرائینگ روم کا دروازہ بند ہو گیا۔

دروازہ کیوں بند کیا؟ کیا ڈرائیور بھی اندر گیا؟ ایمان کے پے در پے سوالوں کے جواب میں اسکے پاس جو جواب تھا وہ بس اتنا ہی تھا کہ دروازہ کیوں بند ہوا اُسے تو نہیں معلوم اور ڈرائیور تو گاڑی میں بیٹھا ہے۔

بظاہر جو قرائن تھے اسکے پیش نظر خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ مگر پھر بھی محبت کرنے والی لڑکی کا دل دہلا جا رہا تھا۔

کافی دیر بعد جب گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور ریشار اندر آیا۔ اُسے یوں ہراساں دیکھ کر قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ایمان کیا ہوا تمہیں؟'' اُسنے اسکے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑے اور بولا

''یار نارمل ہو جاؤ کچھ ایسی بات نہیں تھی۔ تمہارا دل یوں دھڑک رہا ہے۔ جیسے ابھی تمہاری پسلیاں توڑتا باہر آ جائے گا۔''

اور جب ایمان نے کچھ جاننے کی کوشش کی تو اُسنے رسان سے کہا۔

''میری جان میں ڈاکٹر ہوں اگر مریض اپنی بیماری کو پردے میں رکھنا چاہے تو ڈاکٹر کو اختیار نہیں کہ وہ اس کا پردہ فاش کرے۔''

''تم گولی مارو اِس اخلاقیات کو۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیوں آیا تھا؟'' ایمان کے لہجے میں سختی تھی۔

''وہ فائٹر پائلٹ ہے۔ نام ہیری یا تم ہے۔ اس پائلٹ کے ساتھ ایک گھمبیر مسئلہ ہو گیا ہے۔ جونہی وہ کسی مشن پر جانے کے لئے جہاز فضاء میں لاتا ہے اُسکے سر میں شدید درد شروع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بیماری ملٹری اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا کہ

میڈیکل گراونڈ پر فوراً ایکشن ہو کر اُس کا سارا کیریئر داؤ پر لگ جاتا ہے۔میرے بارے میں سُنا تھا علاج کے لئے آیا تھا۔

ایمان نے سکون اور اطمینان سے بھرا ہوا لمبا سانس اپنے سینے سے خارج کیا تھا۔

اُس کی پریشان کن بیماری نے صحت یاب ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔یشار کا معتقد ہو گیا تھا۔اسرائیلی ڈاکٹروں میں اسکی مسیحائی کا پہلے ہی خاصا چرچا تھا۔یہ واقعہ سونے پر سہاگہ ثابت ہوا۔

کبھی کبھی وہ اُس کے ہاتھ پکڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔ڈاکٹر جیسن ویسٹ کی طرح اُس کی پوروں، گانٹھوں، ہتھیلی کی لکیروں کا ایکسرے کرنا شروع کر دیتی۔وہ ہنستا اور کہتا۔

''ایمان یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔انسانوں کو ایسے چھوٹے موٹے تحفوں کی عنایت سے خدا اپنے آپ کا اظہار کرتا ہے۔ہاں تمہارے سلسلے میں تو میری دُعائیں بھی تھیں۔''

یشار ابھی اسپتال گیا تھا۔ایمان ناشتے سے فارغ ہو کر ٹیوشن کلاس کیلئے نکلنے ہی والی تھی۔آجکل وہ عبرانی زبان کے ایک ماہر سے اس زبان کی گرامر سیکھ رہی تھی جب بائل کا فون آیا۔ڈھیر ساری دُعاؤں اور پیار کے بعد اُس نے پوچھا تھا

''تم لوگ کب یروشلم آ رہے ہو؟میرے خیال میں تمہیں تنظیم آزادیٔ فلسطین کے اُس احتجاجی جلسے کی اطلاع ہوگی جو ہفتے کو ہو رہا ہے۔میڈیا اِسے بہت ہائی لائٹ Highlight کر رہا ہے۔میں نے روتھ کو فون کیا تھا کہ اگر وہ آجائے۔''

ایمان نے بھی ساری تفصیل اس کے گوش گزار کی کہ عمو فیصل حسینی کا کوئی چار دن پہلے اُسے فون آیا تھا۔کل ایجنڈا بھی مل گیا ہے۔عربوں کی زمینوں کی ضبطی اور روا گزاری کا

مطالبہ میرے خیال میں پہلی بار بہت موثر انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ہاں یائل آنٹی اسرائیلیوں کے ردِّعمل کا کیا حال ہے؟ کیا رُخ سامنے آ رہا ہے؟''

''دراصل بنیاد پرستی نے بہت تیزی سے جڑیں پکڑ لی ہیں۔اسرائیلی 52% آبادی اب کٹّر قدامت پسند خاندانوں کی ہے جنہیں عربوں کے ساتھ نہ تعلقات قائم کرنے ہیں نہ انہیں امن سے دلچسپی ہے۔اسرائیلی فوج میں ان کے بچے اگر انتفاضہ(خون آلود جھڑپیں) میں حصّہ لے رہے ہیں تو کب تک لیتے رہیں گے؟ سچی بات ہے ایمان اِن ہیریڈیوں (بنیاد پرستوں) کو قطعاً اس میں دلچسپی نہیں کہ فلسطینیوں کے ساتھ اچھے تعلقات کیلئے امن معاہدے ہونے چاہئیں۔انہیں اُن کے حقوق ملنے چاہئیں۔وہ اگر دلچسپی رکھتے ہیں تو صرف اس حد تک کہ یروشلم کو سر سے پیر تک یہودی پیرھن پہنا دیا جائے اور سیکولر اور لبرل یہودیوں کو اپنی حدود میں قید کر دیں اور کچھ ایسا ہی حال فلسطینیوں کی بھی انتہا پسند کلاس کا ہے کہ انہیں بھی مسائل کا حل جنگ میں ہی نظر آتا ہے۔

ہاں یائل آنٹی شامیٹش کیسا ہے؟ اُس کی شادی کا کیا پروگرام ہے؟ اب اس پر سنجیدگی سے سوچئیے نہ۔پہلے تو اس سے پوچھیے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ کوئی لڑکی پسند وسند کر رکھی ہے۔پچھلی بار جب میں آئی تھی میں نے بہت ٹکریں ماریں پر وہاں خفیف سی ہنسی تھی۔بے نیازی کی سی کیفیت تھی۔

پل بھر کیلئے ایمان کو محسوس ہوا تھا جیسے یائل کے سینے سے لمبی سی آہ نکلی ہے۔

''خیریت''اُس نے فوراً پوچھا تھا۔

''ہاں ہاں ایمان دراصل ابھی وہ کوئی پلّہ ہی نہیں پکڑ رہا ہے۔کچھ میں بھی اس معاملے میں اتنی فعال نہیں ہوئی۔یوں بھی آجکل دیر سے گھر آتا ہے۔پوچھا تو بتایا کہ ہیبرون یونیورسٹی کی لائبریری میں مختلف ادیان کے تقابلی جائزے پر کتابیں پڑھتا

ہوں۔اسلام سے بہت متاثر نظر آرہا ہے۔میں بھی خاموش رہی کہ ذہن میں اگر انتشار ہو تو مطالعہ ضروری ہے چیزیں کلئیر clear ہو جاتی ہیں۔

''چلو اچھا میری جان پھر ملیں گے۔''

اُس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔پائل آنٹی کچھ عرصے سے یہی کرنے لگی تھیں۔کسی بڑے موضوع پر بات کرتے کرتے اچانک وہ کہتیں''اچھا میری جان پھر بات کریں گے یا چلیں گے''اور فون بند ہو جاتا۔

یروشلم جاتے ہوئے دونوں خوش تھے۔لونگ ڈرائیو دونوں کی کمزوری تھی۔باتیں کرنا،ہنسنا،قہقہے لگانا،کھانا پینا۔وہ اکثر اسے انجوائے کرتے تھے۔تقریباً ماہ بعد اُس کا چکر لگا تھا۔سبھی خوش ہوئے۔

پرانے شہر کی مشرقی سمت آگستا وکٹوریہ زون سے ذرا اُوپر جو علاقہ کبھی غیر جانبدار کہلاتا تھا وہیں ایک عظیم اجتماع تھا۔ایمان تصویریں بنا رہی تھی۔لوگوں سے بات چیت کرتی تھی۔جب اُس نے سُنا اُس کے قریب سے ہی ایک ادھیڑ عمر خاتون اپنی نوجوان ساتھی سے کہتی تھی۔

''ارے دیکھو سامنے وہ مئیر یروشلم ایہود اولمرٹ ہے یا میری بصارت کو دھوکا ہو رہا ہے۔''

''علاج کروایئے اپنی آنکھوں کا۔اولمرٹ اور ہمارے اجتماع میں۔ہمارا تو تخم مار دینا چاہتا ہے وہ۔مئیر ٹیڈی کولیک کا گمان گزرتا تو چلو کچھ شک وشبہ والی بات بھی ہوتی کہ وہ پھر عربوں کی کہیں کہیں طرفداری کا مجرم ہے۔''

''حد کرتی ہو باسمہ دیکھو تو سہی۔''

پھر خاتون نے ایمان کا بازو پکڑتے اور اُسے متوجہ کرتے ہوئے اپنی بات کی

تصدیق چاہی ۔ایمان نے اس کی ایک سمت اشارہ کرتی انگشت شہادت کی جانب دیکھا اور بولی۔

''مشابہت تو واقعی بہت زیادہ ہے مگر اولمرٹ یہاں کبھی نہیں ہوسکتا۔اُسے اسرائیل کے سیکولر اور لبرل عناصر سے کوئی دلچسپی نہیں ۔وہ قدامت پسند لیکوڈ (سیاسی پارٹی) کی حمایت اور ووٹوں سے میئر بنا ہے یہاں کیوں ہوگا''؟

فیصل حسینی کا خطاب بہت موثر اور جاندار تھا۔بہت ساری تالیاں تھیں جب انہوں نے کہا تھا ''میں اس دن کا خواب دیکھ رہا ہوں جب ایک فلسطینی کہے گا ہمارا یروشلم تو اس سے مراد فلسطینی اور اسرائیلی ہوں گے اور یہی جملہ جب ایک اسرائیلی دہرائے گا تو اس کا مطلب ہوگا یہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں دونوں کا یروشلم ہے۔

یہ ایک مثبت کوشش تھی ۔سات سو ممتاز اسرائیلیوں جن کا تعلق ہر شعبہ زندگی سے تھا یہاں شرکت کیلئے آئے تھے انہوں نے لوگوں سے خطاب کیا اور قرارداد پر دستخط کیے ۔

موسم اِس بار بہت تیزی سے بدلا تھا۔ہوائیں بہت ٹھنڈی ہوگئی تھیں ۔وہ گرم کپڑے نہیں لائی تھی ۔صبح سے وہ لونگ سکرٹ پر گرم چادر اوڑھے گھر میں گھومتی رہی تھی ۔کوئی تین بجے اُس نے یروشلم آرینا کو کسی کے ہاتھ کمبل اور اس کے گرم کپڑے بھیج دینے کیلئے فون کیا۔ہیلو کے بعد آرینا نے اُس کی بات سُننے کی بجائے پوچھا

☆ ''تم نے آج ٹی وی نہیں دیکھا''۔

''دراصل مما آج میں کالم لکھنے میں مصروف رہی ۔ ٹی وی کا وقت نہیں ملا۔کیا بات ہے''؟

ریسیور کے سوراخوں سے آتی آرینا کی ایک لمبی آہ نے ایمان کو مزید پریشان کر دیا۔

آپ کچھ بتائیں گی بھی''؟اس کے انداز میں اضطراب کے ساتھ جھنجلاہٹ بھی تھی۔

''یروشلم میں ہونے والے خودکش دھماکے میں نیورت Nurit کی بیٹی سمادری Samadari ہلاک ہوگئی ہے''۔

''مائی گاڈ۔ایمان چیخی تھی۔

ممی یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ابھی چار پانچ دن پہلے اُس نے مجھے محمود درویش کی ایک نظم بھیجی تھی۔اپنے ہاتھ سے عربی میں لکھی ہوئی''۔

گم صُم سی وہ بہت دیر تک تیرہ چودہ سالہ خوبصورت کتابی چہرے اور موٹی موٹی آنکھوں والی سمادری کے روپ رنگوں کی قوس وقزح میں کھوئی رہی۔ایک پیاری سی یاد میز کی دراز میں بند تھی۔اُس نے اُسے کھولا۔کاغذات کے انبار میں سے اُس خط کو ڈھونڈنے لگی جو کہیں تہوں میں آگیا تھا۔

''اُف۔''اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔خط پر اُس کی آنکھیں جمی تھیں۔عربی کتنے خوبصورت اور دل آویز انداز میں لکھی ہوئی تھی۔

Where are you my beloved?

Do you hear my weeping from beyound the ocean?

Do you understand my need?

Do you know the greatness of my patience?

ایک طوفان سا تھا اُسکے اندر۔وہ جو دو خودکش بمبار لڑکوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔وہ کون تھے؟وہ بھی میرے تھے۔میرے اپنے،میرے فلسطینی۔

پلیڈ Peled فیملی سے اُن کے زمانوں پرانے تعلقات تھے۔میتی پلیڈ Matti

Peled ایک کٹر صیہونی جسنے 1948 کی لڑائی ایک نوجوان فوجی آفیسر اور 1967 کی ایک تجربہ کار جرنیل کی حیثیت سے لڑی۔شام کی گولان پہاڑیاں،غزہ،ویسٹ بنک اور سینائی پر قبضہ کرنے میں پورا کردار ادا کیا۔مگر کچھ ہی عرصے بعد وہ ذہنی طور پر ایک ڈرامائی تبدیلی سے ہمکنار ہوا۔ایک سیکولر سٹیٹ کا مطالبہ جہاں فلسطینی اور اسرائیلی دونوں ملکر رہ سکیں۔دونوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔فلسطینی قابل نفرت ہیں اُنہیں غلاموں کی طرح رکھنا ضروری ہے جیسی سوچیں انتہائی خطرناک ہیں۔اُس نے اپنے اندر کی پوری قوت سے آواز بلند کی تھی۔

ضائیہ اور آرینا سے اس فیملی کی ملاقات فرانسیسی سفارت خانے کی جانب سے منعقد ہونے والی ایک تقریب میں ہوئی تھی۔جہاں ساس بہو دونوں مدعو تھیں۔مسز پیتی اور نیورت (Nurit) سے سفیر کی بیگم نے ضائیہ کا خصوصی تعارف کروایا تھا۔ماں بیٹی ساس بہو کی دلکش شخصیت سے متاثر ہوئی تھیں۔باتوں کے دوران یہ انکشاف بھی ہوا کہ جب کہیں 1948 میں مسز پیتی نے اسرائیل نقل مکانی کی تو انہیں یروشلم میں جس عرب گھر کی پیشکش ہوئی تھی وہ دراصل یوسف ضیا کا گھر تھا۔مسز پیتی کا کہنا تھا کہ اُس گھر کے آرٹسٹک تعمیری سٹائل اور کمروں کی سجاوٹ نے انکی آنکھیں پھاڑنے کے ساتھ ساتھ بھگو بھی دی تھیں۔گھر جس انداز میں سجا ہوا تھا لگتا تھا جیسے افراد خانہ ابھی باہر گئے ہیں بس دم بھر میں پلٹنے والے ہیں۔وہ بہت دیر اسکے محرابی برآمدوں اور پھولوں پھلوں سے سجے کشادہ صحن میں گھومتی رہی۔دُکھ اور ملال کی کیفیت میں گھلتی رہی۔یہ صریحاً ظلم ہے۔خوفناک زیادتی ہے۔وہ ایسے کسی گھر میں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔

اور میں نے اُسے کسی کو الاٹ بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ضائیہ کو یہ اس دن سمجھ آئی تھی کہ اِس گھر کی واپسی میں ایک ان دیکھا ہاتھ مسز پیتی کا بھی تھا۔اِن دنوں اُس گھر میں

میرے عزیز رہتے تھے۔ضالیہ نے بتایا تھا جو جان بچانے کیلئے کیمپوں میں بھاگ گئے۔

دونوں گھروں میں میل ملاپ شروع ہوگیا تھا۔اِس خاندان کا بیٹا میکوپلیڈ Miko Peled بھی اُسی راستے پر چل نکلا تھا۔امن کیلئے فلسطینیوں سے ڈائیلاگ کرتا۔انتہاپسند اور متصب اسرائیلوں کا سامنا کرنا اور انہیں دلائل سے قائل کرتا۔

ایمان اور رائیلا دونوں بہنیں سمادری کو بہت پسند کرتی تھیں۔بہت سلجھی ہوئی بچی تھی۔

رات کو جب ایمان نے نیورت سے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''ڈھوڈا آپ کیسے اُسے قبرستان منوں مٹی تلے چھوڑ آہیں۔وہ تو زندگی سے بھرپور بچی تھی۔اور نیورت فون پر سسکتے ہوئے کہتی تھی۔

''ایمان مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں کیوں زندہ ہوں؟

اگلے دن ایمان اور یشار دونوں تعزیت کیلئے یروشلم آئے۔گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔اسرائیلی ٹاپ ایلیٹ کلاس ہی نہیں فلسطینی بھی بے شمار تھے۔میکو بھی آ گیا تھا۔

اور جب ایمان گھر سے باہر آئی تو اس نے یشار سے کہا

''اب میرا جی چاہتا ہے میں اُن ماؤں کو سلام کرنے جاؤں جنکے بیٹوں نے اپنا آپ اس جدوجہد کی نذر کیا اور امر ہوئے''۔ Close

یشار بے باک تھا۔سچی بات کہنے سے اُس کے منہ کو کوئی مصلحت روک نہیں سکتی تھی۔ابھی وہ حادثہ ہسپتال میں لیبر اور لیکوڈ Likud پارٹی سے وابستگی رکھنے والے چند ڈاکٹروں سے اُلجھا تھا کہ آخر یہاں ایسی دو ریاستیں کیوں نہیں بن سکتیں جو امن و آشتی سے رہ سکیں۔اسرائیلی مملکت میں رہنے والے ہر فلسطینی کو شناختی کارڈ کیوں جیب میں رکھنا پڑتا ہے؟ہر چیک پوسٹ پر اُس کی تلاشی کیوں ہوتی ہے؟

یوں اُس کی مسیحائی کا بڑا چرچا ہو گیا تھا۔ کیا یہ بات تھی یا کچھ لوگ اس کی باتوں پر خار کھاتے تھے یا یہ محض اتفاق تھا۔ سب باتیں اپنی اپنی جگہ وزنی تھیں۔ یوں کسی بھی میدان میں کسی مسلمان کا غیر معمولی ہونا ناقابلِ برداشت تھا۔ اُس کا سر توڑ دیا جائے، اُسے زرق زمین بنا دیا جائے اور ایسا کرنے کیلئے کوئی معقول بہانہ بنانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

اب بھلا ایمان کو یقین کیسے آتا؟ وہ تو ابھی دو گھنٹے قبل اُس سے رخصت ہوا تھا۔ اُسے ناصرتھ Nazareth جانا تھا کہ وہاں ایمز Emms ہوسپٹل میں اُس کے دو یہودی دوستوں نے ایک مریض کے سلسلے میں اُسے بُلایا تھا۔ وہ تو خود ساتھ جانے کیلئے تیار تھی مگر ایک دن پہلے تیز بخار ہو گیا۔ نزلہ زکام تو تو گذشتہ تین چار دن سے چل رہا تھا۔ گلا بھی خراب تھا بخار نے معاملے کو ذرا سنجیدہ کر دیا۔ وہ تو پھر بھی بضد تھی مگر یشار نہیں مانا۔

''دیکھو صبح کے وقت بھی تمہارا ٹمپریچر (بخار) 102 سے اُوپر ہے۔ آنکھیں کتنی لال ہو رہی ہیں؟''

وہ ہنس پڑی۔

''ڈاکٹر ہو کر مجھے ڈرا رہے ہو۔''

''بخدا نہیں'' وہ ہنس پڑا۔ اسکی تپتی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ دیکھو نا'' تمہیں آرام نہیں ملے گا۔ فلو نے تین چار دن لینے ہیں۔''

ابھی گذشتہ رات انہوں نے ٹی وی پر فلسطین کی بہت سُریلی گلوکارہ خاتم السحر کو محمود درویش کی امر ہو جانے والی نظم I come from there گاتے دیکھ کر ایک دوسرے سے کہا تھا۔ کاش ہماری زندگی میں وہ وقت آ جائے کہ جب ہم فلسطین کو آزاد دیکھ سکیں۔

یشار نے اُسے ڈاکٹر کالوسٹ وارٹن Kaloost Wartan کے بارے میں

بتایا تھا کہ جس نے نذارتھ میں یہ شاندار ایمز Emms اسپتال بنایا تھا۔ بڑا مشنری انسان تھا۔ خدا ہمیں بھی توفیق دے کہ ایسا ہی کوئی بڑا کام ہم بھی کر جائیں۔

گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے بھی وہ تاکید کرتا رہا۔ "دوائی باقاعدگی سے لینا اور آرام کرنا۔ فلو میں آرام بہت ضروری ہوتا ہے۔"

تو راستے میں کون گھات لگائے بیٹھے تھے۔ نزارتھ کیلئے پہلی ٹرننگ کی چیک پوسٹ پر ہی سارا کھیل بگڑ گیا۔ چیک پوسٹ کے اسرائیلی فوجیوں کا کہنا تھا کہ آبزرویشن ٹاور Observation tower میں بیٹھا ہوا ماڑشولم تو اپنی ہائی ویلوسٹی رائفل میں ربڑ کی گولیاں ڈال کر چیک کر رہا تھا۔

چیک پوسٹ پر اپنے کاغذات کی چیکنگ کروانے کے بعد ڈاکٹر بشار کو باہر نکلتے اور اپنی گاڑی کی سمت جاتے سبھوں نے دیکھا تھا۔ اب ایسے میں اُسے گولی لگ گئی تو ان کا قصور؟

مگر بات اتنی سادہ تو نہ تھی۔ کینوس اینڈ گارمنٹس فیکٹری نزارتھ سے تھوڑا باہر تھی اور وہاں صبح جھگڑا ہوا تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑ برسی تھی جس میں فلسطینی مزدور زخمی ہوئے تھے۔ جھگڑے کا وقت اور ڈاکٹر کے وہاں پہنچنے کا وقت ملتے تھے۔ صورت خطرناک تھی مگر ایک ذمہ دار اور فرض شناس ڈاکٹر کیلئے کہیں ممکن تھا کہ وہ گاڑی میں بیٹھا رہتا۔ زخمیوں کو دیکھنے کیلئے وہ پھرتی سے باہر نکلا اور خود نشانہ بن گیا تھا۔ اس کے کاغذات، اُس کا شناختی کارڈ جب چیک ہوئے تو پتہ چلا کہ وہ تو یواین او کی طرف سے بھیجا گیا ڈاکٹر تھا۔

کہانی تو گھڑنی پڑی۔

ایمان نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ شفق کا سا رنگ تو ابھی بھی باہنی ہتھیلی پر باقی تھا۔ انگلیوں پر دن گننے لگے تو منٹوں میں سارا معاملہ پار ہو جائے۔ ایسے میں دل تڑپانے

،دل دہلانے اور زار زار رُلانے والی باتیں تو کچھ تعجب والی نہ تھیں۔کبھی وہ بھاگتی ہوئی وویمن ان بلیک کے پاس جا کر چلّانے لگی تھی اور کبھی نیسٹ Knesset کی عمارت کو بم سے اُڑا دینے کی پاگلوں جیسی باتیں تھیں۔ڈاکٹر منصور، آرینا، ڈاکٹر موسیٰ، ضالیہ اور یائل بھی صدمے سے گنگ تھے۔سوال جواب کے چکر سے ہی نہیں نکلتی تھی۔دُکھ کی چادر میں لپٹی کبھی اِس خول سے باہر آتی تو تڑپ کر یائل سے پوچھتی۔

''تو کیا یہ نذارتھ کے ایمز اسپتال کے یہودی ڈاکٹروں کی سازش تھی کہ انہوں نے اُس کا وقت چیک پوسٹ پر بیٹھے اُن فوجیوں کو بتایا ہوگا۔''

یائل اور وہ آنکھوں میں آئی دُھند کو صاف کرتے ہوئے کہتی

''ارے نہیں میری جان چھوٹی چھوٹی عمروں کے یہ لڑکے جو دینی مدرسوں میں تعصب اور نفرت کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں اُن ہی کی یہ حرکت تھی۔اُن کیلئے گولیاں چلانا دل لگی بھی ہے۔اسرائیل کے سنجیدہ لبرل طبقے اور ڈاکٹروں نے اِسے سنجیدگی سے محسوس کیا ہے۔اخبارات نے لے دے بھی مچائی ہے۔قاتل پکڑا بھی گیا ہے۔اُس کا کہنا ہے کہ اُس نے تو ہوائی فائر کیا تھا۔ڈاکٹر تو ٹارگٹ نہیں تھا۔اُس کی تو ہونی اُسے کھینچ لائی تھی۔

اس کیلئے تو جہاں لُٹ گیا تھا۔کائنات اوندھے منہ گر گئی تھی۔شب و روز بے معنی ہو گئے تھے۔ایسے ہی دنوں میں وہ پائلٹ پیری یاتم تعزیت کیلئے آیا تھا۔اُس کے زار زار بہتے آنسوؤں نے اُسے اور اس کے ساتھی کو غمناک کر دیا تھا۔

''ہماری پور پور میں جس نفرت کے بیج تم لوگ بوتے جا رہے ہو ایک دن آئے گا جب ہم نہیں تو ہماری آنے والی نسلیں یا اُن کی نسلیں تمہیں معہ سود کے سب کچھ لوٹا ئیں گی۔''

یاتم شرمندگی کے پاتال میں دھنسا کہتا تھا۔

''میں سفاردی یہودی تو خود دوسرے درجے کا شہری ہوں۔'' اپنے باپ کو دیکھ کر

اُس کا دل کٹتا تھا۔پائل کی اُداسی اُس کیلئے تڑپانے والی تھی۔شامیش جیسا لڑکا جسے اُس نے کبھی قابل توجہ نہیں سمجھا تھا اُس کے چہرے پر چھائی فکرمندی اُسے حیرت میں مبتلا کرتی تھی۔ماں، دادا، دادی سب نڈھال تھے۔

ایسے ہی دنوں میں ایک صبح وہ گاڑی میں بیٹھی۔ملازم سے اُس نے صرف اتنا کہا۔''امّی سے کہنا میں دمشق جارہی ہوں۔''

آرینا جب کچھ جاننے کیلئے باہر بھاگی وہ جا چکی تھی۔اُسی وقت اُس نے پائل کو فون کیا۔

''کیا ایثار کے والدین سے ملنے گئی ہے۔''اُس نے فوراً سوال کیا تھا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں۔''

''مجھے اُن کا ایڈریس لکھواؤ میں شامیش کو بھیجتی ہوں۔''

اور جب وہ گاڑی میں بیٹھی شیشوں سے باہر نیلے آسمان کو،چمکتی دھوپ کو،سرسبز درختوں،پودوں رنگارنگ کھلے پھولوں اور رک رک کر تھم تھم کر چلنے والی ہواؤں کی اداؤں کو دیکھتی تھی اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

دُنیا تو ویسی ہی ہے جیسی ہمیشہ سے تھی اس کے نظارے بھی ویسے ہی ہیں مگر میرے لیے ہی سب کچھ بدل گیا ہے۔'میری ہی دنیا اجڑ گئی ہے۔

وہ دمشق میں کسی کے گھر جانے کیلئے نہیں آئی تھی۔سیدھی صلاح الدین ایوبی کے مزار پر آگئی تھی۔احاطے سے اندر کیا آئی جیسے اسکے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔اُس کی سسکیاں تھیں جن میں ٹوٹتے پھوٹتے لفظ تھے۔

''صلاح الدین تم سو رہے ہو''تم نے کب سوتے رہنا ہے؟''تم تب بھی سو رہے تھے جب وہ ہوچھا فرانسیسی جرنیل ہنری گورد Henri Gouraud دوسری جنگ

عظیم کے خاتمے پر مالِ غنیمت کے طور پر فرانس کو ملنے والے شام کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے دمشق میں داخل ہوا تھا اور سب سے پہلے تمہارے مزار پر آیا تھا۔اُس نے اپنا جوتا کھینچ کر مزار پر مارا تھا اور اپنی آواز کی پوری طاقت سے چلّا کر کہا تھا۔

''صلاح الدین ہم فاتح بن کر لوٹ آئے ہیں۔دیکھو ہم نے سبز ہلالی پرچم کو سرنگوں کر دیا ہے۔صلیب ایک بار پھر بلند ہے۔''

میرے تو آنسو نہیں تھمتے تھے جب میں نے یہ سب پڑھا تھا۔''تم نے تب یہ سب سُنا اور چُپ رہے۔دیکھو بہت آرام کر لیا ہے تم نے۔ ہمارا ضبط جواب دے گیا ہے۔اٹھ جاؤ اب۔جانتے ہو فلسطین کے بیٹے اور بیٹیاں کتنی بے آبرو ہو گئی ہیں۔''

وہ گھائل ہوئی جاتی تھی۔زرین آتے،اُسے دیکھتے،فاتحہ خوانی کرتے اور باہر نکل جاتے۔پھر کوئی اُس کے پاس آ بیٹھا تھا کسی نے اُس کا سر اپنے ہاتھوں میں تھاما تھا۔اُس نے متورم آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے یہ دیکھا کہ کون ہے؟ شامیش اُس کے پاس بیٹھا تھا۔اُس نے دھیرے سے اپنا سر اُس کے شانے پر رکھ دیا تھا۔وہ اُس کے سر کو سہلاتا اُس کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں کی پوروں سے صاف کرتا رہا۔

کافی دیر گزر جانے پر وہ آہستگی سے اُسے اُٹھاتے ہوئے باہر لے آیا جہاں سے دمشق سٹیڈل Damascus citadel کی بلند دیوار کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اُسے چلاتے ہوئے وہ ساحتہ المسکیہ کے میدان میں لے آیا تھا۔کینا کے درخت تلے سیمنٹ کے چبوترے پر اُسے بٹھاتے ہوئے وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا داہنے ہاتھ حداد ٹمپل کے پاس چھوٹی سی کافی بار سے کافی لے آیا۔اس کے پاس بیٹھنے،گلاس اُس کے لبوں سے لگانے اور چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کی صورت کافی اُس کے اندر بھیجنے تک اُسکی سنجیدگی،متانت اور آنکھوں سے چھلکتی محبت کو محسوس کرتے ہوئے ایمان وہ سوال اپنے ہونٹوں پر نہ لا سکی تھی جو

اُسے حیرت میں ڈالے ہوئے تھا کہ شامیش یہاں کیسے؟ اگر پائل آنٹی نے اُسے بھیج بھی دیا تھا کہ ممانے نوکر کے بتانے پر ہی پائل کو فون کھڑکا دیا ہوگا تب بھی اُس نے کیسے جان لیا کہ وہ اتنے بڑے دمشق میں یہیں ہو سکتی ہے؟

گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے جب وہ تھوڑی سی جذباتی کیفیت سے باہر آئی اُس نے پھر سوال کیا تھا۔ شامیش تم یہاں کیسے؟ اس بار بھی شامیش نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ عین اُسی اُس وقت دمشق کی امیہ مسجد کے مینار سے جمعے کی پہلی اذان گونجی۔ اذان کے اختتام پر شامیش نے زیرِ لب دُعا پڑھتے ہوئے کہا۔

''میں نماز کیلئے جارہا ہوں۔ تم نے نماز پڑھنی ہے تو عورتوں کا دروازہ اُس طرف ہے۔'' اُس نے سامنے کی جانب اشارہ کیا۔

''شامیش یہ کیا؟''

''میں الحمداللہ مسلمان ہو چکا ہوں۔'' اُس نے حیرت زدہ سی اُس کا بازو پکڑ لیا تھا۔''

عرب سٹڈیز سوسائٹی کے ڈائریکٹر جناب فیصل حسینی نے میرا نام ابراھیم رکھا ہے اور ان کی سخت ہدایت پر ہی میں نے ابھی اس کا اعلان نہیں کیا۔ تین چار ماہ بعد مجھے امریکہ چلے جانا ہے۔''

ایک لطیف سی سرشاری اُس کے رگ و پے میں دوڑی تھی۔

شامیش بڑا ہیبا سا لڑکا تھا اور وہ اُتنی ہی چنڈال تھی۔ مجال تھی جو وہ پائل کو اُس کا کوئی کام کرنے دیتی۔ اُس سے اُسکا حصّہ بھی چھین کر کھا جاتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر کٹ کھنی بلّی کی طرح اُس کے بال نوچتی تھی اگر کبھی اُس نے زچ ہو کر اُسے ایک تھپڑ لگا دیا تو وہ غل غپاڑہ مچاتی کہ وہ ماں کی ڈانٹ سے بچنے کیلئے گھر سے نکل جاتا۔ پانچ سال بڑا ہونے

کے باوجود وہ اُس سے ڈرتا تھا اور جب وہ سوق حمیدیہ (حمیدہ بازار) کے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے تھے ایمان نے کہا۔

''شامیش میں بہت بُری ہوں میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ زیادتی کی۔ تمہاری ماں کو تم سے چھینے رکھا۔ مجھے معاف کردو۔''

وہ خفیف سا مسکرایا اور بولا۔''بیوقوفی والی باتیں مت کرو۔''

انسان تقدیر کے ہاتھوں کتنا مجبور اور لاچار ہے؟ ایک ایسے کھلونے کی طرح جس کی جو کل جب اور جہاں سے چاہو مروڑ کر بے کار کردو۔ فلسطین کی اُن ہزاروں لاکھوں بیواؤں اور یتیموں کی طرح ،معذوروں اور اپاہجوں کی طرح جن کے لیے زندگی نے آنسوؤں کے تحفے مستقل اُن کے نصیبوں میں لکھ دیئے ہیں۔ تو اُن کے دُکھوں کی حقیقی روح تو اب میری سمجھ میں آئی ہے۔ آگ خود کو لگتی ہے تبھی تپش کا پتہ چلتا ہے

زندگی اپنے سارے مفہوم کھو بیٹھی تھی۔ دن اور رات بے معنی سے ہو گئے تھے۔ پورا گھر جیسے اُداسی، خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا رہتا۔

امریکہ جانے سے قبل تک شامیش باقاعدگی سے ہر شام آتا رہا۔ اُس کے پاس بیٹھنا، مختلف موضوعات پر باتیں کرنا، چائے پینا اس کے معمول کا ایک حصہ رہا اکثر وہ آرزدگی کی جس تکلیف دہ کیفیت میں ہوتی وہ خاصی کوشش اور جتن سے اُسے اُس سے نکال لیتا۔

شامیش کی عربی بہت اچھی تھی۔ اکثر وہ اُس سے مختلف شعراء، گلوکاروں اور موسیقاروں پر بڑی دلچسپ باتیں کرتا۔ ایسے ہی دنوں میں ایک شام وہ ہاتھ میں ''یروشلم پوسٹ'' لیے آیا۔ اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے اُس نے اُسے آرزدگی کی عمیق کیفیت میں ڈوبے پایا

اُس کی گھنی پلکوں کی باڑھ میں آنسوؤں کے دو موتی ہیروں کی سی چمک لیے پھنسے ہوئے تھے۔اُس کے سامنے سوگوار حُسن و رعنائی کا ایک بھرپور شاہکار تھا۔چند لمحے وہ ایک تک اُسے دیکھتا رہا پھر بہت آہستگی سے اُس کی دونوں آنکھوں پر ٹشو پیپر رکھتے اور دونوں موتی اُن میں جذب کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔

آج دنیا سے ایک بہت پیارا انسان رخصت ہوا ہے۔جانتی ہو کون ہے وہ؟

ایمان کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

نظار قبانی

تو بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھے چھوٹے اور بزدل لوگوں کو اپنے لفظوں سے ڈرانے اور سہانے والا بلا شر رخصت ہو گیا۔

وہ اٹھی اور الماری سے اُس کی شہرہ آفاق نظم نکال لائی جس نے دنیا عرب میں کیا پورے جہاں میں تہلکہ مچا دیا تھا۔"میں دہشت گردی کا حامی ہوں"۔

وہ پڑھنے لگی تھی۔

We are called Terrorists

If we dare not to be trampled by Israeli Buldozers

Those who are levelling our lands

Ripping our history

Desecrating our Injeel, our Quran

If that to be our sin

"Wallah"

How beautiful terrorism is

I am with terrorism

If it can salvage me from immigrants

From Russia, Romania, Hungary & Poland

These immigrants settled in Palestine

They rode on our shoulders and they stole

The minarets of Alqudus, Doors and Pulpits of Aqsa

I will continue Supporting Terrorism

Till the New World Order remains divided between

America & Israel

I harbour terrorism with all poetry

With all my words,

With all my energy

Till this world is ruled by this butcher

I supports terrorism

Till this new world order keeps butchering

My children, feeding them to dogs

i am with terrorism

Nazzar Qabbani

کبھی کبھی وہ اُلجھ جاتی اور قدرے غصے سے کہتی

''شامیش تمہارا وہ سن وٹہ سا چہرہ دکھائی اور لپیٹے دیئے والے انداز سے میں اتنی مانوس ہو چکی ہوں کہ اب تمہارا بدلا بدلا سا یہ روپ مجھے کچھ حیرت زدہ سا کرتا ہے۔
تب اسکا خوبصورت چہرہ مدھم مدھم سی مسکراہٹ میں نہانے لگتا۔اور وہ دھیمے سے کہتا
''ڈرتا رہا ہوں نا تم سے۔ پکی پکی ڈریکولا تو تھی نا تم۔''
''تم نے شادی کب کرنی ہے؟تیس سے تو اوپر کے ہو رہے ہو۔عجیب ہو تم بھی۔پائل آنٹی کو کوئی خوشی نہیں دینا چاہتے ہو۔''
''امریکہ جا کر کروں گا''۔وہ ہنس پڑتا۔
شامیش کے جانے کے بعد اُس کی شامیں اور ویران ہو گئیں۔وہ آتا تھا تو کچھ دھیان ہی اِدھر اُدھر بٹنے لگا تھا۔
اور انہی دنوں جب وہ Nupw کو جوائن کرنے اور غزہ جا کر کام کرنے کے منصوبے بناتی تھی پائل نے سب کچھ سُن کر اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں دھیرے دھیرے کہا تھا۔
''ایمان میں تمہیں اِس آبلہ پائی کی اجازت کبھی نہیں دوں گی۔مصائب اور غموں کی کڑی دھوپ نے جیسے میری پور پور کو جلا ڈالا ہے۔تنہائی کے جنگل میں جیسے بھاگتی ٹھوکریں کھاتی میں لہولہان ہوئی ہوں۔راہوں کے سنگ ریزوں نے جیسے میرے تلوے چھلنی کر دیئے ہیں۔وقت کے جبر،اُس کے کٹھورپن،اسکی بے اعتنائی،اسکی بے رخی کو جیسے میں نے جھیلا ہے۔تم چاہتی ہو تم بھی اُسے ویسے ہی جھیلو اور ہم خاموش دیکھتے رہیں۔غزہ کے کسی اداسی سے بھرے کمرے میں بستر پر لیٹتے ہوئے تمہاری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کا تصور ہمارے اندر جو طوفان اٹھائے گا اُسکا تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے۔ نہیں ایمان نہیں''۔

''پائل آنٹی مقدر راو رنصیب کی زور آواری کے سامنے بھلا کون ٹھہرا ہے؟ انسان اس بہاؤ کے ریلے میں کسی بے وقعت اور بے مایہ تنکے کی طرح بہتا چلا جاتا ہے۔ کیا مجھے یہ سب آپ کو بتانے کی ضرورت ہے۔ آپ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے کہ لوح محفوظ میں جو لکھ دیا گیا ہے۔ اُسے بھوگنا ہے۔

وہ فرشی کشن پر بیٹھی دونوں ٹانگوں کو بازوؤں کے حصار میں دبوچے یاسیت کے سارے رنگوں میں چہرے کو ڈبوئے مدہم سے لہجے میں کبھی پائل کو دیکھتے اور کبھی فرش کو مخاطب کرتے ہوئے کہیں جیسے کسی کنوئیں کی پاتال سے بولتی تھی۔

''تو یہ بھی جان لو کہ کاتب تقدیر کی کتاب میں نعم البدل کے الفاظ بھی موجود ہیں اور کہیں کسی کے دل سے شکوے کی صورت نکلی ہوئی کوئی آہ بہت گڑبڑ اور راو پر والے کو نظرِ ثانی پر مجبور بھی کرتی ہے''۔

ہیرے کی سی چمک والی وہ آنکھیں اُس وقت کیسی بے جان سی نظر آتی تھیں۔ پائل کو محسوس ہوا جیسے اُس کا اندر کوئی آرے پر چیرتا چلا جا رہا ہے۔

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں؟''

تو اب وہ مرحلہ درپیش تھا جہاں نشتر زنی ضروری تھی۔ چھوٹی موٹی مرہم پٹی کا وقت گزر چکا تھا۔

اور پائل نے چھری اُس کے کلیجے میں اتار دی تھی۔

''شامیش اب ابراہیم ہے۔ تمہیں پیار کرتا ہے۔ پیار کرنے والے سنبھالنا جانتے ہیں۔ وہ تمہیں اسی طرح سمیٹ لے گا جیسے اس کے باپ نے مجھے سمیٹا تھا۔

اور جیسے طوفان آ گیا تھا۔ اُسکا سارا وجود ڈولنے لگا اور حلق سے نکلی چیخ تھی کہ جس

نے ماں کو پردہ اٹھا کر اندر آنے کو کہا تھا۔ مگر پائل تنی کھڑی تھی اور آرینا الٹے قدموں لوٹ گئی تھی۔

کیا بولنا ہے کیا کہنا ہے؟ اول فول بکواس کی روانی تھی۔ ماں باپ، دادا، دادی سب طعنوں کی سان پر تھے سب سازش میں ملوث تھے۔

اور پائل کا لہجہ بھی بڑا تیکھا تھا۔

''آرینا نے تمہیں جنا ہے اور میں نے تمہیں پالا ہے۔ اور پالک کی محبت جنم دینے سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایمان سن لو اچھی طرح۔ میں نے تمہیں پائل نہیں بننے دینا۔ میں نے خدا سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ میں اُس کے دروازے پر کبھی نہیں گئی۔ میں نے کبھی اُسے آواز نہیں دی۔ مگر اب میں نے تمہارے اور ابراھیم کیلئے اُسے پکارا ہے۔

میری بات نہیں مانو گی تو تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی''۔

اور وہ چلی گئی۔ دو دن، چار دن، ہفتہ، دو ہفتے، پائل ناراض تھی۔ یہ تو انگاروں پر چلنے والی بات ہو گئی تھی۔

پورے پندرہ دن بعد اُسنے کمرے سے نکل کر باہر قدم رکھا۔ ڈاکٹر منصور کوریڈور میں کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ اُسنے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی اُسکا اتنا وجیہ باپ کتنا پژمردہ اور بوڑھا لگ رہا تھا۔ اُس کا دل بھر آیا۔ آنسوؤں کے سوتے تو جیسے خشک ہو گئے تھے۔ ضبط نہ ہوا تو باپ کی پشت کو بانہوں کے دائرے میں گھیرتے ہوئے اُس نے اپنا سر اس پر ٹکاتے ہوئے گلوگیر سے لہجے میں کہا۔

''پائل آنٹی نے جو کہا ہے آپ میرے لیے اُسے مناسب سمجھتے ہیں''؟

''ایمان یہ میرے لیے بہت بڑی خوشی ہوگی۔''

اپنے کمرے میں آ کر اُسنے دیر تک تکرار کی صورت یہ سوال اپنے آپ سے کیا تھا۔

وہ اپنے باپ کو خوشی نہیں دے سکتی۔

اُس نے کمرے کی شرقی اور غربی دیوراوں کو دیکھا ایشار البشر کے ساتھ اُسکی تصویریں مسکراتی تھیں۔وہ ایک ایک تصویر کے سامنے ٹھہری۔اُس کے آنسو بہتے تھے اور اندر باتیں کرتا تھا۔

اب وہ اپنی اُس تصویر کے سامنے کھڑی تھی جہاں ایشار اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھے مسکراتا تھا۔

الوداع ایشار۔الوداع میرے پیارے دوست

کمرے میں خادمہ آئی تھی جو ایک کے بعد ایک تصویریں اتارتی اور کہیں سٹور میں سمیٹنے کیلیئے لے جاتی گئی۔

پھر وہ پائل کے گھر آئی۔کتنی دیر گیٹ پر کھڑی رہی ماضی آنکھوں کے سامنے چکریاں کاٹتا تھا۔اس گھر پر ہمیشہ بڑا سناٹا رہتا تھا۔وہ بہن بھائی جب آتے تب شامیش کے ساتھ مل کر خوب ہلا گلا ہوتا۔اس گھر میں قہقے گونجتے

وہ بیک ڈور سے ٹی وی لاؤنج میں آئی کھڑکی کے شیشوں سے اُس نے دیکھا تھا صوفے پر بیٹھی پائل کیسی اجڑی اجڑی نظر آئی تھی؟اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

پائل اِسکی ہیروئن تھی اُسکی آئیڈیل تھی اُس سے بے پناہ پیار تھا اُسے۔بہت دھیرے سے بغیر آواز پیدا کیئے اُس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔وہ کھڑی تھی۔ چپ چاپ۔دیر تک کھڑی رہی جیسے فرش میگنٹ بار کا ہو جسنے اُسے چپکا لیا تھا۔

دفعتاً پائل اپنی سوچوں سے باہر آئی اس پر نظر پڑتے ہی وہ چند لمحے پتھرائی

آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی ''پھر ایمان یہ تم'' ہو کہتے ہوئے اُس کی طرف لپکی تھی۔

وہ اس کے سینے میں منہ دے کر بلک اٹھی تھی۔

''آپ۔آپ'' وہ ہکلاتے ہوئے کہے چلی جارہی تھی۔

اس پر بوسوں کی بارش کرتے ہوئے وہ اُسے بانہوں میں سمیٹے صوفے تک لے آئی تھی۔اس پر بیٹھاتے ہوئے یائل دھیرے دھیرے بولتی گئی۔

''میری جان یہی راستہ سلامتی اور نجات کا ہے۔رہا فلسطین جذبات سے اُوپر اٹھو۔یہ تو ایک طویل جدوجہد ہے۔قوموں کے فیصلے سالوں میں نہیں کہیں صدیوں میں جا کر ہوتے ہیں۔ظلم،جبر،زیادتیوں،ناانصافیوں اور دیگر عوامل کے انبار جمع ہوتے رہتے ہیں۔تہہ در تہہ،تہہ در تہہ۔پھر کہیں جا کر دڑاریں پڑتی ہیں،زوال پذیری کا عمل شروع ہوتا ہے اور پھر کہیں قوموں کے مقدر جاگتے اور کہیں سو جاتے ہیں۔''

ایمان میں بہت تھک گئی ہوں تمہارے اور شامیش کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔بہت تنہائی اور سناٹا جھیلا ہے میں نے۔فلسطین کیلئے اچھے سکول،کالج اور اچھے اسپتالوں کی فنڈنگ funding کیلئے امریکہ میں ہم سب مل جل کر کام کریں گے۔

ایمان نے آنسوؤں سے بھری یائل کی آنکھوں کو اپنی پوروں سے صاف کرتے ہوئے اُس ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا تھا۔

حرف آخر 2 اپریل 2013